مارچ 2013

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ



MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

مارچ 2013
جلد 40 شمارہ 11
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

کہی سُنی

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

بہار کی آمد ہر دل و نظر کو شاداب کر رہی ہے۔ ایسا ہی پُر بہار موسم تھا جب ایک خواب دیکھا گیا، یہ خواب تعبیر کی صورت میں ڈھلا تو پاکستان کا قیام وجود میں آیا۔

دو قومی نظریہ جو پاکستان کے قیام کی بنیاد بنا، آج بھی اس کی صداقت کی گواہی بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار ہے کہ وہ وہاں بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں۔

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑا انعام تھا۔ زرخیز زمین اور بے پناہ قدرتی وسائل سے مالا مال قدرت کا تحفہ۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ نظریۂ پاکستان کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اسے بھی متنازع بنایا جا رہا ہے۔ نام نہاد دانش ور اور میڈیا اس میں پیش پیش ہے۔ وہ نظریہ جو پاکستان کی اساس اور بنیاد ہے، آزادیٔ رائے کے نام پر لایعنی بحث اور زبان دانی کے مظاہروں کی نذر کر دیا گیا ہے جو حد درجہ افسوس ناک ہے۔

سالگرہ نمبر،

اپریل کا شمارہ خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر ہے۔ سالگرہ نمبر میں قارئین سے خصوصی سروے اور ایک نئے سلسلے کے ساتھ ساتھ آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریریں بھی شامل ہوں گی۔

مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں جگہ پا سکیں۔

سالگرہ نمبر سروے،

خواتین ڈائجسٹ کے سالگرہ نمبر میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم نے حسب روایت سروے کا اہتمام کیا ہے۔

سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1- آپ کی نظر میں سالگرہ کا اہتمام ہونا چاہیے یا نہیں؟ کیا آپ باقاعدہ سالگرہ مناتی ہیں؟ اب تک کی زندگی میں مبارک باد کا سب سے خوبصورت اظہار کس کی طرف سے تھا اور کس طریقے سے کیا گیا؟ کوئی خوبصورت بات یا جملہ؟

2- کون سا تحفہ پا کر خوشی ہوتی ہے۔ کتاب، خوشبو، پھول یا زیورات و ملبوسات؟ کبھی ایسا ہوا کہ آپ کو جس کی مبارک باد کا سب سے زیادہ انتظار تھا، وہی بھول گیا، آپ کا ردِ عمل کیا تھا؟

3- اس سال شائع ہونے والی تحریروں میں سے کون سی تحریریں آپ کو پسند آئیں؟ کوئی خوبصورت اقتباس، جملہ یا شعر جس نے آپ کو متاثر کیا؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 23 مارچ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

مکمل ناول "یقین کامل ہی بندگی ہے"،

سائرہ رضا کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جو ہر بار نئے موضوع کے ساتھ آتی ہیں۔ اس بار انہوں نے نہایت حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اسے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ ان کا یہ ناول خاص توجہ کا متقاضی ہے۔ ناول خاصا طویل ہے لیکن طوالت نے اس کے حسن کو متاثر نہیں کیا ہے۔ یہ ناول پڑھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیجیں۔

اس شمارے میں،

- سائرہ رضا کا مکمل ناول "یقین کامل ہی بندگی ہے"،
- نگہت سیما کا مکمل ناول "زمین کے آنسو"،
- نازیہ جمال، رشک حبیبہ اور شازیہ جمال نیّر کے ناولٹ،
- آمنہ نثمی، عظمیٰ افتخار، سحرش بانو اور حمیرا عروش کے افسانے،
- باتیں عینی جعفری سے،
- عطاء الرحیم سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے،

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نیک اعمال میں جلدی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "نیکیوں کی طرف جلدی کرو!"
(البقرہ 148)

اور فرمایا "اور جلدی کرو اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"
(آل عمران 133)

اس موضوع سے متعلقہ احادیث درج ذیل ہیں۔

نیک اعمال میں جلدی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(نیک) اعمال کرنے میں جلدی کر لو ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے جو شب تاریک کے مختلف ٹکڑوں کی طرح (یکے بعد دیگرے) رونما ہوں گے۔ صبح کو آدمی مومن ہو گا اور شام کو کافر۔ شام کو مومن ہو گا تو صبح کو کافر۔ وہ (اس طرح کہ) اپنے دین کو دنیا کے معمولی سامان کے عوض بیچ دے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

اس میں خبر دی گئی ہے کہ قیامت کے قریب پے در پے فتنوں کا ظہور ہو گا۔ فتنوں کی کثرت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں دین و ایمان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ دنیا حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہو گی حتیٰ کہ دنیوی مفادات کے لیے اپنے دین و ایمان کا سودا کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہو گا، بلکہ صبح و شام ان کے روپ بدلیں گے۔ چنانچہ ان بہروپیوں کی آج کثرت ہے، جو صبح کچھ ہوتے ہیں، شام کو کچھ۔ کسی کو دین و ایمان پر استقامت نصیب نہیں الا ماشاء اللہ۔ ایسے حالات میں اہل ایمان کو استقامت کی اور بلا تاخیر اعمال صالحہ بجا لانے کی تلقین کی گئی ہے۔

2- نیکی کا موقع میسر آتے ہی اسے کر گزرنا چاہیے، تامل کی صورت میں شیطان طرح طرح کے خیالات پیدا کر کے اس سے دور کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

3۔ اللہ کی معصیت اور گناہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پناہ مانگی ہے کیونکہ معصیتوں کا دلدادہ انسان دار آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، امور خیر میں لیت و لعل سے کام لیتا رہتا ہے تا آنکہ موت اسے دبوچ لیتی ہے اور اسے ندامت اور توبہ کی بھی توفیق نہیں ملتی۔

حضرت ابو سروعہ عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مدینے میں عصر کی نماز پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا اور نہایت تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی بیویوں میں سے کسی کے حجرے کی طرف تشریف لے گئے۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تیز رفتاری سے گھبرا گئے۔ (تھوڑی دیر کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تیز رفتاری پر تعجب کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے یاد آیا کہ ہمارے پاس (گھر میں سونے یا چاندی کی) ڈلی کا کچھ حصہ ہے، مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ یہ (ڈلی) مجھے (اللہ کی یاد سے) روک دے، اس لیے میں نے (جلدی جلدی جا کر) اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیا۔" (بخاری)

بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ہے۔

"میں پیچھے گھر میں صدقے کی ایک ڈلی چھوڑ آیا تھا، تو میں نے اسے رات کو اپنے گھر رکھنا پسند نہیں کیا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ انسان کو اپنے پاس ایسی چیز نہیں رکھنی چاہیے جس کی وجہ سے اس کی توجہ اللہ سے ہٹ کر اس کی طرف ہو جائے۔

2۔ عام حالات میں لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آنا جانا اگرچہ ناپسندیدہ ہے، لیکن خاص حالات میں، جب کہ کوئی ضرورت اس کی داعی ہو، ایسا کرنا جائز ہے۔

3۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے بے رغبتی اور جلد از جلد نیکی کرنے کے جذبے کا بھی اندازہ ہوتا ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ اور صدقات کی رقم فوراً مستحقین تک پہنچانا ضروری ہے۔

4۔ کسی ضروری کام کے لیے فرض نماز کے بعد کے اذکار کو موخر کیا جا سکتا ہے۔

5۔ امام یا خطیب کے خلاف معمول کام سے لوگ متعجب ہوں تو اس کا سبب بیان کر دینا چاہیے تاکہ شبہات پیدا نہ ہوں۔

6۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ فرض نماز کے سلام کے فوراً بعد سنتیں وغیرہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ اپنی جگہ پر تشریف رکھتے ہوئے اذکار کرتے تھے۔

شہادت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ احد والے دن ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

"یہ بتلایئے! اگر میں مارا جاؤں (شہید ہو جاؤں) تو میں کہاں جاؤں گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جنت میں۔"

تو اس نے اپنے ہاتھ میں موجود کھجوریں پھینک دیں، پھر (نہایت بے جگری سے) لڑا، حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شوق شہادت اور شہادت کا بدلہ جنت ہونے کا بیان ہے، نیز یہ کہ جو کوئی صدق دل سے شہادت کا طالب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ضرور اس شرف و فضل سے سرفراز فرماتا ہے۔

2۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کے بغیر نہیں بولتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صحابی کو جنت کی بشارت دینا وحی الٰہی کی بنیاد پر تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کا استدلال نہیں،

پھر اس لیے بھی کہ اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے لڑنے والا شہید ہو جائے تو وہ جنتی ہے۔ لیکن ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی متعین شخص پر جنتی ہونے کا حتمی حکم لگائیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فلاں ان شاء اللہ جنتی ہے۔

3۔ ایمان و یقین جس قدر پختہ ہو، نیکی کرنا اتنا ہی زیادہ آسان ہوتا ہے اور بڑی سے بڑی چیز بھی آڑے نہیں آ سکتی۔

افضل صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا صدقہ اجر کے اعتبار سے بڑا ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تیرا اس وقت صدقہ کرنا جب کہ تو صحیح (تندرست و توانا) ہو، مال کی حرص دل میں ہو، (خرچ کرنے سے) تجھے فقر کا اندیشہ اور (اپنے پاس جمع رکھنے سے) تونگری کی امید ہو اور تو صدقہ کرنے میں تاخیر نہ کر، یہاں تک کہ جب روح گلے تک پہنچ جائے تو تو کہے فلاں کے لیے اتنا، فلاں کے لیے اتنا، جب کہ وہ فلاں (وارث) کا ہو چکا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ صحیح صدقہ وہی ہے جو انسان صحت کی حالت میں کرے۔ موت کے آثار شروع ہونے کے بعد کے صدقے کی اللہ کے ہاں خاص اہمیت نہیں، علاوہ ازیں اس وقت انسان ایک تہائی مال سے زیادہ صدقہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس وقت مال وارثوں کا حق بن جاتا ہے جسے اللہ کی راہ میں بھی خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اللہ نے حد مقرر فرما دی ہے کہ مرض الموت میں کوئی اپنا مال وقف یا صدقہ کرنا چاہے تو وہ ایک تہائی (1/3) مال سے زیادہ نہیں کر سکتا۔

2۔ اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان کو نیکی کے کاموں بالخصوص صدقہ و خیرات میں تاخیر نہیں بلکہ عجلت سے کام لینا چاہیے۔

3۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذکورہ بالا صورت کے علاوہ کوئی صورت باعث فضیلت نہیں۔ فقر، حرص اور صحت کی قید لگانے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے حالات میں عموماً صدقہ کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے اور صرف نیکی کا جذبہ رکھنے والے ہی صدقہ کر سکتے ہیں ورنہ خوشحال کا صدقہ جسے فقر کا ڈر نہ ہو، بھی بسا اوقات بہت بڑے اجر کا باعث ہوتا ہے۔ بسا اوقات سائل کی محتاجی کی نوعیت بھی صدقے کی فضیلت کو بڑھا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایمان والوں کی ایک خوبی یہ بھی بیان فرمائی ہے وہ تنگی اور آسائش ہر دو صورتوں میں خرچ کرتے ہیں۔

بہادری

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ احد والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلوار پکڑی اور فرمایا۔

"یہ تلوار مجھ سے کون لے گا؟" صحابہ نے اپنے ہاتھ دراز کیے، ان میں سے ہر ایک کی زبان پر تھا "میں، میں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کون ہے جو اسے اس کے حق کے ساتھ لے گا؟" (یہ سن کر) سب لوگ پیچھے ہٹ گئے اور توقف کیا۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور کہا "میں اسے اس کے حق کے ساتھ لوں گا۔"

چنانچہ انہوں نے تلوار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے لی اور اس سے مشرکوں کی کھوپڑیاں پھاڑیں۔ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ کی بہادری اور فضیلت کا بیان ہے، تاہم اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت بزدلی دکھائی بلکہ ان کا توقف اس اندیشے کی وجہ سے تھا کہ کہیں اس کے حق کی ادائی میں کوتاہی نہ ہو جائے ورنہ اس سے

قبل جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط طور پر تلوار لینے کا اعلان فرمایا تو ہر صحابی اسے لینے کے لیے لپکا۔ ظاہر بات ہے تلوار لینے کا مقصد اس سے جہاد کرنا ہی تھا نہ کہ کچھ اور۔ اس جذبے میں کوئی صحابی بھی پیچھے نہیں رہا۔

2۔ مسابقت الی الخیرات اچھا جذبہ ہے' تاہم انسان کو وہی ذمہ داری اٹھانی چاہیے جسے نبھانے کا وہ اہل ہو۔

براوقت

حضرت زبیر بن عدی بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے حجاج کے اس ظلم و ستم کی شکایت کی جس سے ہم دوچار تھے۔ تو انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سناتے ہوئے) کہا۔

"اس پر صبر کرو! اس لیے کہ اب جو بھی وقت آئے گا' وہ پہلے سے بدتر ہی ہو گا' یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو۔" (پھر فرمایا)

"میں نے یہ بات تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں پیش گوئی ہے کہ حالات دن بدن خراب سے خراب تر اور اسی حساب سے حکمران بھی ظالم اور بد سے بدتر ہوں گے۔ ایسے حالات میں حکمرانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہر شخص اپنی اصلاح کرے اور اپنی آخرت سنوارنے کی فکر کرے اور حکمرانوں کی طرف سے ظلم و ستم کا ارتکاب ہو تو اسے برداشت کرے اور صبر سے کام لے۔

2۔ حکمران جب تک واضح کفر کا ارتکاب نہ کریں اس وقت تک ان کے خلاف بغاوت درست نہیں۔ اہل السنتہ والجماعتہ کا یہی عقیدہ ہے۔ اگر وہ ظلم و ستم کریں تو اس پر صبر کرتے ہوئے اپنے فرائض ادا کرتے رہنا چاہیے۔

3۔ حجاج بن یوسف نہایت سفاک اور ظالم تھا لیکن بہرحال مسلمان تھا' اس لیے سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے صبر اور برداشت کرنے کی نصیحت کی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا شرف و فضل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والے دن فرمایا۔

"میں یہ جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر فتح عطا فرمائے گا۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"میں نے کبھی امارت کی خواہش نہیں کی' لیکن اس روز یہ خواہش کی (تاکہ یہ اعزاز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے' مجھے حاصل ہو جائے۔ چنانچہ میں اس کے لیے اٹھ اٹھ کر بلند ہوتا' اس امید پر کہ (شاید) مجھے (اس جنگ کی) امارت (قیادت) دی جائے۔"

(راوی) حدیث بیان کرتے ہیں) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور وہ جھنڈا ان کو عطا فرمادیا اور فرمایا۔

"(جھنڈا لے کر) چل اور کسی کی طرف توجہ نہ کرنا' یہاں تک کہ اللہ تجھے فتح سے ہم کنار فرمادے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ چلے' پھر ٹھہر گئے اور کسی طرف توجہ نہیں کی اور با آواز بلند کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں کس چیز پر لوگوں سے جہاد کروں؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان سے جہاد کرو! یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ ایسا کرلیں تو بلاشبہ انہوں نے تجھ سے اپنی جانیں اور اپنے مال محفوظ کرلیے' البتہ جان و مال کے حق کے ساتھ (ان کا مواخذہ ہو سکتا ہے' یعنی وہ کسی مسلمان کو ناجائز قتل کردیں تو قصاص میں ان کو قتل کرنا اور کسی کا مال غصب کیا ہو یا زکوۃ ادا نہ کی ہو تو وہ مال ان سے وصول

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کرنا ضروری ہے۔ زبان سے اسلام کی شہادت دینے پر ان کے خون اور اموال محفوظ ہو جائیں گے' تاہم اگر وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تو) ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے (یعنی قیامت والے دن اللہ تعالیٰ خود ہی ان سے حساب لے لے گا)" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاص شرف و فضل کا بیان ہے۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے کا ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی فتح خیبر کی اطلاع دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کے مطابق وہ فتح ہو گیا۔

3۔ ظاہری حالات کے مطابق احکام اسلام کا اجرا ہو گا' چنانچہ جو زبان سے اسلام کا اظہار کرے گا' اسے مسلمان ہی سمجھا جائے گا' اس کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو گا' البتہ قتل ناحق کے ارتکاب پر قصاصاً" اور ارتداد پر حداً" قتل کیا جائے گا۔

4۔ جہاد اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے ہوتا ہے کہ لوگ توحید ربانی کا اقرار کرلیں' جہاد کا مفہوم قتل و غارت ہرگز نہیں ہے جیسا کہ اسلام دشمن باور کراتے ہیں۔ جہاد قیام امن کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ امن کو سبوتاژ کرنے کے لیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مقصد جہاد بیان کرنا اسلام کے امن پسند ہونے کی واضح دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام پوری دنیا میں پھیلا لیکن مقتولین کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

تقدیر

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیان فرمایا۔ اور آپ سچے ہیں اور آپ کی بات کو سچ مانا جاتا ہے۔"

"بے شک تم میں سے ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں رہتا ہے' پھر اسی کی مثل (یعنی اتنی ہی مدت) منجمد خون بنا رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے' پھر (ایک سو بیس دن کے بعد) فرشتہ بھیجا جاتا ہے' وہ اس میں روح پھونکتا ہے۔ اور فرشتے کو چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کی روزی اس کی موت' اس کا عمل اور وہ بدبخت ہے یا نیک ہے چنانچہ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک تم میں سے ایک شخص جنتیوں والے عمل کرتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر لکھا ہوا غالب آجاتا ہے اور وہ جہنمیوں والے کام کرنے لگ جاتا ہے اور جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بے شک تم میں سے ایک شخص جہنمیوں والے کام کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر لکھا ہوا غالب آجاتا ہے اور وہ جنتیوں والے کام کرنے لگ جاتا ہے' تو اس میں داخل ہو جاتا ہے۔"

لندن کے اردو اخبارات

انشاء جی

ولایت والوں کو اپنے ملک کو ولایت بنانے میں جانے کتنی صدیاں لگیں۔ ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی بھائی اسے چند ہی سال میں اپنے ڈھب پر لے آئے ہیں۔ لندن اور برمنگھم کے اردو اخباروں پر نظر ڈالیے' آپ کا جی نہال ہو جائے گا۔ بہت کچھ جو انگریزی زبان میں چھپے تو شاید گرفت میں آجائے' اردو میں بخوبی چل رہا ہے۔ ڈاکٹروں کے معاملے میں ایسی سختی ہے کہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی فارغ التحصیل ڈاکٹرنیوں کو بھی فی الحال پریکٹس کرنے کا اذن نہیں۔ لیکن ہمارے عطائی بھائیوں کی راہ انگریز نہیں روک سکا' چنانچہ جہاں اور لوگ پہنچے' وہاں زنانہ اور مردانہ پوشیدہ اور پیچیدہ بیماریوں کا مجرب اور حکیمی علاج کرنے والے بھی پہنچ گئے۔ کل یہاں کے ایک اردو اخبار میں اشتہار دیکھا کہ چین ہیلتھ سینٹر آرام باغ روڈ کے ممتاز ماہر جنسیات نے جن کے پاس آر۔ ایم۔ پی کی پُراسرار ڈگری ہے' سلو کے علاوہ لوگوں کے پرزور اصرار پر لندن میں بھی اپنا مستقل دواخانہ کھول دیا ہے جس میں خط و کتابت صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے اشتہار کے ساتھ اپنی تصویر بھی دی ہے۔ ادھر نگر پر ہندوستان کے حکیم ایس ایل بٹ ناگر صاحب بھی جو اٹھارہ میڈیکل کتابوں کے مصنف ہیں جس میں "ہوم ڈاکٹر" بھی شامل ہے۔ لوگوں کے پرزور اصرار کی تاب نہ لاکر تشریف لے آئے ہیں۔ ان کے اشتہار کے بموجب لاکھوں آدمی گزشتہ تین سال میں ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی ولایت میں یہ دو حکیم کافی نہ تھے' لہٰذا حکیم صاحب عبدالرحمٰن معالج خاص مردانہ کو بھی مانچسٹر میں مطب کھولنا پڑا ہے۔ یہ خود کو نیچرو پیتھ اور ہربلٹ لکھتے ہیں۔ یعنی قدرتی طریقوں اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے۔ ان کا دعوا حذاقت بے بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ اشتہار کہتا ہے' "تقریباً" ایک سال کا عرصہ ہوا' ایک صاحب اپنے ایک انیس سالہ بھتیجے اور اس کی سولہ سالہ دلہن کو لے کر مانچسٹر آئے اور حکیم صاحب سے بیان کیا کہ اس لڑکے کی شادی کو دو ہفتے ہوئے ہیں' لیکن اس نے خود کشی کی کوشش کی ہے۔ اس کا کچھ علاج کیجئے۔ حکیم صاحب نے تسلی دی اور دوائی بھی دی۔ لڑکے نے تین ماہ دوائی استعمال کی۔ چند ہفتے ہوئے' وہ حکیم صاحب کے لیے ایک قمیص' ٹائی اور دس پونڈ لڈو بطور تحفہ لائے اور خوش خبری سنائی کہ "جی! بابے کی کرپا اور آپ کے علاج سے سب کچھ ٹھیک ہے۔ میرے بھتیجے کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اور ہم نے ڈھائی من لڈو تقسیم کیے ہیں۔ لڈو کھائیے!" ایک اور ہندوستانی ماہر کی طرف آئیے! یہ لندن میں ہی ایشیا کے مشہور و معروف معالج' ماہر جنسیات حکیم کے ترویدی۔ ان کی ڈگریاں اور زیادہ لمبی چوڑی ہیں۔

"این۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ پی۔ اے۔ اے' آر۔ ایس۔ ایچ۔"

حیرت ہے کہ انہوں نے باقی کے حروف تہجی کیوں چھوڑ دیے۔ اے سے زیڈ تک استعمال کرنے میں کیا امر مانع تھا۔ یہ کھوئی ہوئی طاقت مردمی کے علاوہ کھانسی' زکام' نزلہ' گٹھیا اور پیٹ کے درد کا بھی حکیمی علاج کرتے ہیں۔ البتہ ملاقات کے لیے فون پر وقت مقرر کرنا پڑتا ہے۔ بقول خود طاقت کی دوائیوں کے بادشاہ اور انٹرنیشنل شہرت کے مالک' حکیم ہری کشن لال صاحب ماہر امراض پوشیدہ۔ خود تو مصروفیات کے

باعث تشریف نہیں لا سکے' لیکن اپنا اشتہار لندن میں چھپوا دیا ہے۔ حکیم صاحب کو جھانسی یونیورسٹی نے کئی اعزازی ڈگریاں دے رکھی ہیں۔ مثلاً "ایم ایس سی اے اور ڈی ایس ای اے"۔

ان کا مطلب کیا ہے؟

ڈگری کا مطلب نہیں پوچھا جاتا۔ لمبائی دیکھی جاتی ہے۔ ولایت والوں کی آسانی کے لیے انہوں نے اپنے ریٹ پونڈوں میں دیے ہیں۔ شاہانہ علاج باون پونڈ۔ درمیانی علاج بتیس پونڈ' عام علاج اٹھارہ پونڈ اور غریبانہ علاج بارہ پونڈ۔ حکیم صاحب نے خدمت خلق کے جذبے سے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ لاکھ روپے کی قیمتی کتاب "پیغام جوانی" مفت حاصل کریں۔ اس میں لاکھ روپے کے پیغام جوانی کے علاوہ کئی لاکھ روپے کے حکیم صاحب کی دوائیوں کے اشتہار بھی ضرور ہوں گے' سب مریضوں کے لیے مفت۔

پاکستانی اور ہندوستانی بھائیوں کے لیے تازہ ترین خوش خبری یہ ہے کہ حکیم جے ایم کوشل بھی جو کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ صرف پانچ روز کے لیے بریڈ فورڈ میں ورود فرما ہوئے ہیں۔ آپ کی ڈگریوں کا بھی شمار نہیں۔ بی اے (پنجاب) اے۔ بی۔ ایچ۔ ایس (بنارس یونیورسٹی) بی اے (بی۔ یو) اے۔ بی۔ ایم۔ ایس (بی۔ ایچ۔ یو) ڈگری ڈاکٹری کی نہ بھی ہو' تب بھی لیاقت کی دلیل تو ہے۔



حکیموں کے علاوہ سب سے زیادہ اشتہار ہمارے ان پاکستانی' ہندوستانی بھائیوں کے ہیں' جو وطن واپس آنے والوں کو ٹیلی ویژن' ریفریجریٹر' ایئر کنڈیشنر' ٹیپ ریکارڈر' ٹائپ رائٹر' سلائی کی مشین وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔

ایک صاحب ساٹھ فیصد ڈسکاؤنٹ پر' دوسرے پینسٹھ فی صد پر اور تیسرے ستر فیصد ڈسکاؤنٹ پر۔ ہم نے دیکھا نہیں' لیکن سنا ہے' بعض فرمیں سو فی صد ڈسکاؤنٹ پر بھی یہ سامان فراہم کرتی ہیں۔



آپ سوچتے ہوں گے کہ ان بزرگ نے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے' ڈھائی من لڈو کہاں سے لیے ہوں گے۔ یاد رہے کہ ایشیائی مٹھائیوں کا عظیم الشان مرکز سویٹ سینٹر' جو جہلم والے مشہور و معروف پہلوان صاحب کی دکان ہے' شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے لیے بہ کفایت خالص گھی کی مٹھائیاں فراہم کرتا ہے۔ یہاں سے آپ گلاب جامن' رس ملائی' رس گلہ' جلیبی' برفی' لڈو' پیڑا' بالوشاہی' پھینیاں وغیرہ وغیرہ وغیرہ ہی نہیں' دہی بھلے' آلو چھولے' سموسے' نمکین دالیں اور سویاں وغیرہ بھی خرید سکتے ہیں۔

مٹھائی سے رغبت نہ ہو تو شہ روز محل ریسٹورنٹ میں تشریف لائیے اور تندوری مرغ' تندوری روٹی' چکن اور مٹن تکے' قورمہ' کوفتہ وغیرہ کھائیے۔ یہ چیزیں حلال گوشت سے تیار ہوتی ہیں' جس سے آپ کا پیٹ بھر جائے اور خمار آنے لگے تو بھی مضائقہ نہیں۔ رضائی سینٹر سے آپ کو ہر قسم کی آرام دہ رضائیاں مل سکتی ہیں۔ شینیل کی ڈبل رضائی ساڑھے پانچ پونڈ' ساٹن ڈبل ساڑھے تین پونڈ' چھینٹ ڈبل بھی ساڑھے تین پونڈ میں لیجیے اور پاؤں پسار کر سوئیے۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	رانیہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا



ہمارے نام

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

صغیرہ نذر۔۔۔ گلستان جوہر کراچی

سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا لکھوں۔ وہ بات جو خط لکھنے کا محرک بنی وہ ہے نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" اس ناول نے تو ہلا کر رکھ دیا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میں خواتین ڈائجسٹ کی سب سے پرانی بلکہ اولین قاری ہوں۔ جی آپ ٹھیک سمجھیں کہ آج سے تقریباً" اکتالیس (41) برس قبل آپ کے رسالے کا اجرا ہوا اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ پہلے شمارے سے لے کر آج فروری 2012ء تک یعنی 492 شمارے میں نے پڑھے ہیں اور اس میں ایک ماہ کا بھی ناغہ نہیں ہوا آپ کے رسالے کا اجرا اور میری شادی ساتھ ساتھ ہوئی پھر جب آپ کے رسالے کی پہلی سالگرہ تھی "اسی ماہ میرے بڑے بیٹے زین کی پیدائش ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کے رسالے اور میرے بیٹے زین کی سالگرہ ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ اللہ پاک دونوں کو پروان چڑھائے۔ آج میری عمر عزیز کے ساٹھ جمع دو یعنی باسٹھ برس بیت گئے ہیں۔ لیکن جس جوش جذبہ اور جنون کے ساتھ پہلے میں خواتین پڑھتی تھی آج بھی وہی جوش، جذبہ سلامت ہے پہلے سارا رسالہ دو دن میں چاٹ لیتی تھی لیکن اب دس بارہ دنوں میں ختم ہوتا ہے فرق یہ آیا کہ پہلے میاں صاحب رسالہ لا کر دیتے تھے پھر بیٹا لا کر دینے لگا اور اب میری ساڑھے تین سالہ پوتی رسالہ میرے ہاتھ میں دے کر کہتی ہے "دادو یہ ممانے آپ کو دیا ہے"

کئی دفعہ سوچا کہ اس محفل میں شرکت کروں۔ مگر غم ہائے روزگار، بچے، تعلیم ان کی شادیاں ان سب میں اتنا وقت بیت گیا۔ ان سب ذمہ داریوں سے اللہ نے سرخرو کیا اور جب میں نے فروری کا رسالہ کھولا تو پتا چلا کہ سالگرہ نمبر کی تیاری ہے سوچا کہ چلو ہم بھی انگلی کٹا کے شہیدوں میں شامل ہو جائیں اور اب اس وقت کس کس کو یاد کروں اور کسے بھول جاؤں کہ "مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا" وہ سب لکھنے والیاں چاہے پرانی اور کہنہ مشق ہوں یا پھر نو آموز لکھنے والیاں سب نے لکھا اور بہت خوب لکھا۔ مجھے تو فاطمہ شہناز مرتضیٰ بھی یاد ہے۔ ان کی کہانی پتھر کی مونالیزا رضیہ بٹ کا بٹی صائمہ بشیر کا، توبہ عمیرہ احمد کا لاحاصل من و سلویٰ علاوہ ازیں ایم سلطانہ فخر، بشریٰ رحمٰن، رضیہ بٹ، وحیدہ نسیم، جبین سسٹرز، چودھری سسٹرز، آسیہ رزاقی فائزہ افتخار، نمرہ احمد، تنزیلہ ریاض، ماہا ملک، آسیہ سلیم قریشی، رضیہ جمیل، نگہت سیما، عطیہ عمر، اقبال بانو، فرحت اشتیاق، رخسانہ نگار عدنان، نایاب جیلانی، عنیزہ سید، نگہت عبداللہ غرض کہ کسے یاد رکھوں کسے بھول جاؤں۔ ان سب کی اور باقی ان کی بھی جن کے نام نہیں لکھ پائی کی تحریریں دل پہ نقش ہیں لکھنے بیٹھوں تو صفحے کے صفحے بھر جائیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ ہر سلسلہ بہت اچھا ہے اور بہت خوب سوائے "موسم کے پکوان" کے کیونکہ اب تو ٹی وی پر تقریباً" ہر چینل پر پکوان کے بارے میں پروگرام آتے ہیں، دیکھ دیکھ کر طبیعت اکتا گئی ہے۔ ہو سکے تو ان دو

صفحات پر کوئی اور سلسلہ شروع کریں۔ اس کے علاوہ سلسلہ وار ناولوں کی بہتات بہت ہے سلسلے وار صرف دو ناول دیا کریں۔ اور نادرہ جی ایک بات اور بہت طویل ناول نہ دیا کریں بس زیادہ سے زیادہ دس بارہ اقساط کا ناول دیا کریں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری ان گزارشات پر غور کریں گی۔ عمیرہ احمد کہاں ہیں نایاب جیلانی نے بھی بہت دنوں سے نہیں لکھا۔ تنزیلہ ریاض کہاں غائب ہیں ان سب سے لکھوائیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے مقابلے میں بہت سے رسائل آئے۔ لیکن یہ سب پہ بازی لے گیا۔ سب کے چراغ مدھم کر دیے۔

ج صغیرہ بہن آپ کا خط پڑھ کر جو خوشی ہوئی اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر ہمارے لیے خراج تحسین کیا ہو گا کہ آپ پچھلے 41 سال سے مسلسل اور مستقل قاری ہیں۔ بلاشبہ خواتین ڈائجسٹ تین نسلوں کا پسندیدہ پرچا ہے۔

جن رائٹرز کے آپ نے نام لکھے ہیں۔ وہ سب ہمیں بھی بہت عزیز ہیں۔ ہم بھی ان کی تحریروں کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں، کچھ ٹی وی کی نذر ہوئیں اور کچھ گھربار اور بچوں کی مصروفیت میں الجھی ہیں۔ باقی ہمارے ساتھ ہیں اور باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔

قسط وار تحریریں ہمیں بھی پسند نہیں لیکن مصنفین طویل تحریریں لکھیں تو ان کا کیا کیا جائے۔ اگر ایک قسط میں مکمل شائع کریں تو پرچے میں صرف ایک یا دو مصنفین کی تحریریں ہوں گی۔ ریجیکٹ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ دلچسپ ہوتی ہیں مجبوراً" اقساط کی شکل میں شائع کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس نایاب جیلانی کی دو طویل تحریریں ہیں جو اس انتظار میں رکی ہوئی ہیں کہ کوئی ناول ختم ہو تو شروع کی جائیں۔

ام مریم۔۔۔ تحصیل جام پور

پچھلے تین سال سے خواتین باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں اور نئی پڑھنے والی بہنوں کو بھی مشورہ دے رہی ہوں کہ حیات کامل کے لیے "رفیق حیات" کے ساتھ ساتھ خواتین ڈائجسٹ اور شعاع کا ساتھ بھی ازحد ضروری ہے۔ ان رسالوں کی کئی تحریروں نے دل و دماغ پر اتنے گہرے نقوش چھوڑے کہ اپنے آپ میں بہت بدلاؤ محسوس ہوتا ہے ورنہ پہلے تو جذباتیت اور حساسیت اتنی زیادہ تھی کہ بس آنسوؤں کا دریا پلکوں کے بند توڑ کر بہہ نکلنے کو ہر وقت تیار..... اس تبدیلی کو میرے شوہر بھی محسوس کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا بات ہے روز بروز "سمجھ دار" ہوتی جا رہی ہو (لو بھلا میں بے وقوف کب تھی) اور تمہاری کوکنگ بھی بہتر ہو گئی ہے، مجھے لگتا ہے کہ انہیں وجہ بھی معلوم ہو گئی ہے (میری سمجھ داری کی) اس لیے وہ اب مجھے رسالے پڑھنے سے منع نہیں کرتے بلکہ مجھے پڑھتا دیکھ کر مسکرا کر گزر جاتے ہیں ان سالوں میں جن تحریروں نے بہت متاثر کیا، ان کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہو گی۔ ان میں نمرہ احمد کا "مصحف، بیلی راجپوتاں کی ملکہ" بشریٰ سعید کا "سفال گر" سفال گر اور مصحف تو میں نے کتابی شکل میں بھی منگوا لیا ہے اور اپنے رشتہ داروں کو بھی پڑھنے کو دیتی ہوں، ہو سکتا ہے کوئی نصیحت پکڑ لے۔ اس کے علاوہ صوفیہ بشیر کا "توبہ" صوفیہ امجد کا "کہیں دیر نہ ہو جائے۔" عنیزہ سید، عنیقہ محمد بیگ اور سائرہ رضا بھی اچھا لکھتی ہیں۔ سب سے آخر میں ایک شکایت۔ مارچ یا اپریل 2011ء کے شمارے میں "تصویر سی بناتے جائیں" کے نام سے ایک سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ سلسلہ پھر آگے کیوں نہ چل سکا؟ پلیز اس سلسلے کو دوبارہ شروع کریں۔

ج ام مریم! خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیا اور اس سے بڑھ کر خوشی یہ ہے کہ آپ نے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع سے زندگی گزارنے، زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کا ہنر سیکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی اور خوشیاں دے۔ آمین

"تصویر سی بناتے جائیں" یہ سلسلہ خاص طور پر سالگرہ نمبر کے لیے تھا۔ اس لیے بعد میں بند کر دیا گیا کیونکہ اس میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ بہت دیر تک تنوع برقرار رہتا۔ بہت جلد یکسانیت کا شکار ہو کر دلچسپی کھو بیٹھتا۔

وکٹوریا خان۔۔۔ پشاور

خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا ٹائٹل بہت ہی زبردست تھا۔

ماورا سے ملاقات اچھی رہی۔ گل پری مرزا سے بھی

ملاقات اچھی رہی۔ وہاں تو میں بہت ہی ہنسی جب وہ کہانی اپنی بھابھی کو سناتی ہیں اور وہ پوچھتی ہیں "اس میں ہیروئن کون سی تھی۔" ہاہاہاہا کیا گل پری مرزا افغان ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ پیچھے سے وہ افغانستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

میرا فیورٹ "میرے خواب لوٹا دو" بہت زبردست جا رہا ہے اف! لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ بہت زبردست اسٹوری ہے۔

"جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس اسٹوری میں مجھے سعدیہ کلثوم اور سارہ خان فی الحال بہت اچھی لگ رہی ہیں۔

"زمین کے آنسو" بھی بہت زبردست اسٹوری ہے پلیز اس اسٹوری میں احمد رضا کو زیادہ سے زیادہ لکھا کریں مجھے وہ بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔

"صحیح فیصلہ" آسیہ رزاقی نے مجھے بہت ہنسایا۔ بہت اچھی کہانی تھی شہریار اور صائقہ کی لڑائی بہت زبردست تھی۔ ہاہاہا "اماں کا شفو" بہت زبردست کہانی تھی۔ الفاظ نہیں ہیں میرے پاس اس اسٹوری کے کہنے کے لیے۔

سعدیہ عزیز آفریدی زبردست۔

"مسترد" مائنڈ بلوئنگ سائرہ رضا ایک عورت کو کتنے لوگوں نے مسترد کیا۔ "امید صبح بہار" سمیرا شریف کا بہت دلچسپی سے پڑھا اور بہت، بہت، بہت دلچسپ لگا۔

افسانہ ایک بھی پسند نہیں آیا۔ خواتین ڈائجسٹ میں عنیقہ محمد بیگ نے ایک افسانہ لکھا تھا "لال چادر" کے نام سے پلیز اس "لال چادر" جیسے افسانے شائع کریں۔

میں نے جوادی اور شبلی کے بارے میں پڑھا ہے کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ "ہم سے ہے زمانہ" وہی جوادی اور شبلی کی کہانی ہے یا یہ کوئی اور کہانی ہے۔

اور خواتین ڈائجسٹ انشاجی کے کالم میں جو تصویر شائع کرتے ہیں کیا یہ انشاجی ہیں؟

ج پیاری وکٹوریا! ہمیں بہت افسوس ہے کہ پچھلے ماہ لیٹ موصول ہونے کی بنا پر آپ کا خط شامل نہ کر سکے۔ آپ نے پچھلے خط میں جو سوالات کیے تھے۔ وہ اس خط میں شامل کر لیے ہیں "ہم سے ہے زمانہ" شبلی اور جوادی کی وہی مشہور زمانہ کہانی ہے جسے ہمارے قارئین بے حد پسند کرتی ہیں۔ یہ دونوں کردار قارئین میں بے حد مقبول ہیں۔

انشاجی کے کالم میں جو تصویر شائع ہوتی ہے۔ وہ انشاجی کی تصویر ہے۔

خواتین ڈائجسٹ پر آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی اس محفل میں شرکت کرتی رہیں گی۔

روبی سعید۔۔۔ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ

جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ تب سے ہی اپنی امی کو ڈائجسٹ پڑھتے دیکھا۔ امی کو میں ہی ڈائجسٹ لا کر دیتی تھی۔ اس زمانے میں ڈائجسٹ کرائے پر مل جاتا تھا، بچپن سے لے کر اپنی شادی تک اور شادی سے لے کر اپنی بیٹی کی شادی تک کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اب میں دو نواسوں کی نانی ہوں۔ آج تک رسالوں سے بے وفائی نہیں کی۔ میری بیٹی شادی کے بعد بھی پڑھتی ہے۔ اور اس کی بیٹی "ابھی" رسالوں پر لکیریں لگاتی ہے۔ (یعنی میری نواسی) یہ ہماری نسل در نسل چلے گا۔ میری تین بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ ہمارے گھر کرن، خواتین، شعاع باقاعدگی سے آتے ہیں۔ میری دوسرے نمبر والی بیٹی انہیں بنا سنوار کے صندوق میں سنبھالتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ ان رسالوں سے سیکھا ہے۔ ہر کہانی کوئی نہ کوئی سبق دیتی ہے اور کئی ایسی کہانیاں ہیں جنہیں میں زندگی بھر بھول نہیں سکتی ہوں ان ڈائجسٹ کی بہت شکر گزار ہوں کہ ہم گھریلو خواتین کو باہر کی دنیا سے آگاہ کرتے ہیں۔

ج روبی بہن! آپ ہماری اتنی پرانی قاری ہیں۔ اتنے عرصے سے ہمارے پرچے پڑھ رہی ہیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ آپ نے اپنی بیٹی سے خط لکھوا کر اپنے دلی جذبات اور محبت کا اظہار کیا، بہت شکریہ۔ آئندہ خط لکھوائیں تو ان کہانیوں کے بارے میں بھی بتایئے گا جو آپ کو اچھی لگیں۔

ہمت افزائی اور قدر دانی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

صالحہ، اقصیٰ۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

سب سے پہلے تو بڑھے "میرے خواب لوٹا دو" کی طرف تو جناب ہمیں تو پہلے ہی سارا اور رازی کا انداز مشکوک کر رہا تھا۔ لیکن سارا کو سمیر کے ساتھ ہونا چاہیے نہ کہ رازی کے ساتھ "کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ جی! آپ کے ناول نے تو ہمیں پہلے دن سے ہی اپنے حصار میں مقید کر لیا ہے۔ اپنی طرف سے تو ہم نے کمزور سے اندازے لگا لیے ہیں۔ مثلاً "خدیجہ اور فاطمہ کی کزن شہناز سعد کی ماں ہے اور جو دو عورتیں چوبارے میں گانے کی باتیں کرتی ہیں ان میں سے ایک شہناز ہے اور جو ان کے پاس روٹی لینے آیا تھا، وہ مولوی سراج تھے اور سعدیہ کو وہ یہاں سے ہی لے کر گئے تھے اور کھاری آپا رابعہ کا بیٹا ہے اور کھاری کا دوست رضوان سارا کا رکی ہے اور قلزا ظہور سعد کے والد کو جانتی ہیں۔

نگہت سیما کی تعریف کے لیے تو ہمارے پاس الفاظ ہی کم پڑ جاتے ہیں۔ ان کے ناول کی یہ قسط بھی شاندار رہی۔ آپی پلیز حسن رضا کو احمد رضا سے ملوا دیجیے، ورنہ پھر وہ کبھی نہیں ملے گا اور ایک کی جوڑی تو اریب کے ساتھ ہی جچے گی۔

آسیہ رزاقی کا ناول بہت اچھا تھا صاعقہ کا فیصلہ اچھا لگا۔ سعدیہ عزیز کا ناول بھی اچھا تھا۔ شفاعت کا کردار ہمیں پسند آیا۔ سائرہ رضا پچھلے ناولوں کے مقابلے میں آپ کا یہ ناولٹ کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ سمیرا شریف کا ناولٹ بھی اچھا تھا، اسد اور صباح کی قسمت پر رشک آگیا۔

ج صالحہ اور اقصیٰ! آپ نے تو کمال کر دیا۔ سارے اندازے خود ہی لگا لیے۔ خیر دیکھتے ہیں، آپ کے اندازے کس حد تک درست ثابت ہوتے ہیں۔ ویسے ایک بات ذہن میں رکھیں۔ عنیزہ جی کی کہانیاں اتنی آسان نہیں ہوتیں۔ انہیں قارئین کو چونکانے، حیران کرنے کا ہنر آتا ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شائلہ نصیر عاجز۔۔۔ اسلام آباد

پورے وثوق سے کہہ رہی ہوں ہمارے علاقے پوٹھوہار سے یہ پہلا خط ہو گا۔ انیس سالہ زندگی میں خط لکھنے کی تو پہلی نہیں البتہ بھیجنے کی جسارت پہلی ضرور ہے۔ خیر شروع ہمیشہ بیوٹی بکس سے کرتی ہوں۔ (کچھ اور مت سمجھیے گا ڈائجسٹ اینڈ سے پڑھنا شروع کرتی ہوں۔ بچپن سے جھانک کر شوبز اور وہاں سے خطوط، شاعری پہ سر دھن کے، اچھی باتوں کو چنری سے باندھ اور پیارے پیارے لوگوں کی باتوں کو ذہن نشین کرتی ہوں۔ ڈائجسٹ کی تمام کہانیاں بھی زبردست ہیں۔ افسانے سارے اچھے تھے مگر مجھے وہ اک لڑکی، زیادہ بھایا شاید اس لڑکی کے طوفانی قسم کے مزاج کی وجہ سے۔ قسط وار سلسلوں میں "میرے خواب لوٹا دو" اچھا جا رہا ہے۔ سارہ کی خودکشی سے دکھ ہوا بہرحال یہی تو زندگی ہے۔ جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم بھی بہترین ہے اور زمین کے آنسو تو ہے ہی زبردست۔ قلم کی طاقت سے علم کی روشنی بکھیرنا ایک بڑا عمل ہے، جو کہ آپ کے توسط سے ہو رہا ہے، یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیے۔

ج شائلہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں پاکستان کے تقریباً ہر حصہ سے خطوط موصول ہوتے ہیں یقیناً پوٹھوہار سے بھی آئے ہوں گے۔ لیکن آپ اتنے وثوق سے کہہ رہی ہیں تو ممکن ہے آپ کا دعوا درست ہو۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

طوبیٰ فاضل۔۔۔ جھمرہ فیصل آباد

پچھلے ماہ میں ۔۔۔ نے ام عبیر کے نام سے خط لکھا تھا تو دل نے خواہش کی کہ اپنے نام سے جانی کیوں نہ جاؤں، میرا نام طوبیٰ فاضل ہے۔

اسلام علیکم! تیری ہمراہی نے تو ہمیں معتبر کر ڈالا کے مصداق اپنا خط پڑھ کر دل پر جیسے شادیٔ مرگ طاری ہو گئی ہو۔ شوہر صاحب کو خط پڑھایا اور انہوں نے جس مہربان نرم مسکراہٹ کے ساتھ مبارک دی، وہ نہیں بھول سکتی اگلے ہی دن درجن بھر خط کے لفافے لا دیے۔

بات ہو جائے آسیہ رزاقی کے مکمل ناول کی۔۔۔ اکثر سوتیلی ماؤں والے گھروں میں صائقہ کی پھپھی جیسے خیر خواہ موجود ہوتے ہیں سمیرا طور کا کچھ رشتوں کو کھو دینے اور کچھ رشتوں کے ملن کی داستان انجام خوشی سے دوچار کر گیا

مسترد میں رضیہ نے ماں کی گود سے دربدری کا دکھ سہا

اعتذار

کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر نگہت عبداللہ اس ماہ ناول "میرے خواب لوٹا دو" کی قسط نہ لکھ سکیں۔
اس ماہ ناول کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ آئندہ ماہ ان شاء اللہ آپ نگہت عبداللہ کا ناول پڑھ سکیں گی۔

تو پھر عمر بھر ہر رشتے سے دربدری کا دکھ سہنا پڑا دل دکھ سے بھر گیا اور جناب قانتہ رابعہ تو بازی لے گئیں۔ اس بار اتنی گہری بات اتنے مختصر پیرائے میں گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا باقی سارا رسالہ بہترین۔ ہمیشہ کی طرح ہر بار اصلاح کا کوئی نیا پہلو۔

ج پیاری طوبیٰ آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا' بہت خوشی ہوئی 'اب تو درجن بھر لفافے آپ کے پاس ہیں۔ آپ ہر ماہ ہمیں خط لکھ کر ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے اس بار اپنا نام لکھا نام تو کسی بھی انسان کی شناخت ہوتی ہے اور یہ شناخت قائم رہنی چاہیے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نفیسہ اکرم 'سندس الیاس..... گاؤں سلیاں بھر تانوالہ

خواتین پڑھتے ہوئے تو کافی عرصہ ہو گیا۔ خواتین کی کہانیوں کے تو کیا کہنے "میرے خواب لوٹا دو" نگہت عبداللہ جی پلیز سادہ کو بچا لینا پلیز "زمین کے آنسو" نگہت سیما جی تو کمال ہی لکھ رہی ہیں۔ بہت ہی اسٹرونگ اسٹوری ہے اور پلیز نگہت سیما جی! احمد رضا کو اس کے باپ سے ملا دینا۔ وہ غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اب پچھتا رہا ہے باقی سب ہی ناولٹ اور افسانے اچھے ہیں اور ہمیشہ ہوتے ہیں۔

ج، پیاری نفیسہ اور سندس! آپ یقین کریں کہ آپ کے خط ہمیں نہیں ملے ورنہ ہم اپنی اتنی پیاری قارئین کو جواب ضرور دیتے۔ نگہت عبداللہ اور نگہت سیما تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

صبغہ ارشد 'اسما چودھری' زرینہ ظہیر' اقصیٰ پروین ..... میلسی

بہت کنفیوز ہوں کہ خواتین ڈائجسٹ سے اپنی دل بستگی کا اظہار کیسے کروں اور کن الفاظ میں ہم 10th کلاس کی اسٹوڈنٹس ہیں۔ بہت شوق سے آپ کے ڈائجسٹ پڑھتے ہیں صرف خواتین ہی نہیں شعاع اور کرن بھی آپی پلیز عمیرہ احمد سے کوئی ناول لکھوائیں نا..... عنیزہ جی کی کہانیاں ہمیں بہت Fascinate کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہمیشہ ایک انٹلکچوئل ٹچ لیے ہوتی ہیں۔

آپی پلیز 'کرکٹر محمد حفیظ کا انٹرویو ضرور لیں اور اگر ہو سکے تو ان کی مسز کا بھی شاہین آنٹی تک ہماری ریکویسٹ پہنچا دیجیے گا۔

ج صبغہ 'اسما' زرینہ اور اقصیٰ آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ آپ سب دوستوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو میٹرک کے امتحان میں شان دار نمبروں سے کامیابی دے۔ آمین

اقصیٰ یزدانی... اوکاڑہ خنک

ثروت نذیر کیوں نہیں لکھتیں۔ پلیز ان سے ایک چھوٹا سا ناول لکھوائیں۔ جبکہ رخسانہ نگار بھی غائب ہیں۔ آپی کچھ عرصہ پہلے ایک پرانا شمارہ دیکھا تھا اس میں ایک سلسلہ وار ناول شائع ہوا تھا نام میں بھول چکی ہوں کرداروں کے نام فائقہ' رابعہ سوہنی اور عظام تھے۔ فائقہ کے شوہر کو کینسر کی بیماری تھی۔ کیا وہ ناول کتابی شکل میں موجود ہے؟ موجودہ رائٹرز میں عنیزہ سید بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ شازیہ چوہدری میری پسندیدہ رائٹر تھیں' پلیز ان کا کوئی ناول پھر سے شائع کریں۔ چونکہ میرا تعلق پٹھان فیملی سے ہے اس لیے لکھنے کی ہمت ہی نہ ہو رہی تھی۔

ج۔ پیاری اقصیٰ! آپ کو پرچے لیٹ ملتے ہیں تو آپ لیٹ تبصرہ بھجوا سکتی ہیں' مقصد تو آپ کی رائے سے آگاہ ہونا ہے۔ آپ ہمیں خط ضرور لکھیں۔

رخسانہ نگار پچھلے ایک سال مصروفیت کی وجہ سے لکھ نہیں پائیں۔ اب ان کا ناول "ایک تھی مثال" "شعاع" میں شروع ہوا ہے۔ جلد ہی آپ ان کی دوسری تحریریں بھی پڑھیں گی۔ ثروت نذیر ٹی وی پر مصروف ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے لکھ نہیں پا رہی ہیں۔

جس ناول کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے' وہ نگہت عبداللہ کا ناول ہے' نام ہے "کوئی لمحہ گلاب ہو" یہ ناول کتابی شکل میں آچکا ہے' آپ 400 روپے 'مکتبہ عمران ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی کے ایڈریس پر منی آرڈر کر دیں ناول آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

پٹھان فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود آپ اتنی اچھی اردو جانتی ہیں۔ تو خط لکھنے کی ہمت کیوں نہیں ہو رہی تھی۔

بشریٰ نوید باجوہ..... اوکاڑہ

ٹائٹل گرل کا لباس اور جیولری پسند آئی۔ پلیز آپ گرمیوں میں ہلکے پھلکے کپڑے جیولری والی ماڈل گرل ٹائٹل پر دیں۔

پورے 22 دن بعد سورج نکلا ہمارے علاقے میں 'سنا ہے آپ کے شہر میں تو موسم سہانا ہی رہتا ہے۔ لیکن کراچی کے حالات تو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ سب سے پہلے عنیزہ آپی کو پڑھا عنیزہ نے تو گویا ہمیں باندھ کر رکھ دیا ہے۔ شہناز یقیناً "سعد کی والدہ ہیں اور زندہ ہیں۔ کھاری کا ایک نظر سعد کو دیکھ کر پہچان لینا ہمیں متاثر کر گیا۔ سعدیہ اور مولوی صاحب کی بیوی کا تعلق بھی ان لوگوں سے ہی لگتا ہے۔ نگہت سیما آپی پلیز احمد رضا کے لیے واپسی کا دروازہ بند نہ کیجیے گا۔ سائرہ رضا تو کیا لکھتی ہیں متاثر کن' برف کا موسم نے بے حد متاثر کیا تھا' نگہت عبداللہ کا ناول اچھا جا رہا ہے لگتا ہے سمیر اور تاجور کا جوڑ بھی بنے گا۔ ناول کافی الجھ گیا ہے۔ سمیرا طور کا ناولٹ بھی بہترین تھا اور اینڈ بھی مزے کا تھا۔ افسانوں میں قانتہ رابعہ چھا گئیں مہناز اور ماورا سے مل کر اچھا لگا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح پسند آئے۔

ج پیاری بشریٰ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ ٹائٹل کے لیے آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔ آپ کے ایڈریس پر انعام یافتہ کتب ارسال کر دی جائیں گی۔

نازش حمید.....

خواتین ڈائجسٹ ایسا رسالہ ہے جو کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ اس میں شائع شدہ کہانیاں پڑھتے ہوئے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود بھی وہیں موجود ہوں۔ کہانی کے کرداروں کے درمیان۔ بہترین الفاظ کا چناؤ' خوب صورت طرز تخاطب۔ خواتین ڈائجسٹ میں شائع تحریروں کا خاصہ رہا ہے۔

"کہی سنی" سے لے کر "موسم کے پکوان" تک ایک ایک چیز بہت عمدہ اور اعلیٰ ہے یہی کہانیاں پڑھتے پڑھتے نجانے کب میرے دل میں بھی کہانی لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے بھی ناول آپ کو بھجوایا۔

ج پیاری نازش! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کو ہمارے جواب میں وہ پیار نظر نہیں آیا جو دوسری قارئین کے لیے ہوتا اچھی بہن ہمیں اپنی تمام قارئین سے دلی لگاؤ ہے۔ خصوصاً" وہ قارئین جو جنہیں خط لکھتی ہیں' ان کی ہمارے دل میں بہت قدر ہے۔ اتنی مصروف زندگی میں وقت نکال کر خط لکھنا' پھر اسے پوسٹ کرنا خصوصاً" چھوٹے شہروں اور گاؤں میں جہاں ڈاک کا نظام بھی نہیں ہے۔ آسان کام نہیں ہے۔

آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں 'اسی لیے پچھلے خط کا جواب نہ دے سکے یقین رکھیں۔ قابل اشاعت ہوئی تو آپ کی کہانی ضرور شائع ہو گی۔

صباحت..... ضلع گجرات

سلسلے وار ناول دونوں زبردست ہیں۔ "کوہ گراں تھے ہم" میں سعد اور ماہ نور کا کردار بہت اچھا ہے۔ فلزا ظہور کا تعلق سعد سے کہیں نہ کہیں ماضی سے ضرور ہے۔ نگہت سیما کا ناول بھی بے مثال ہے لیکن اسے زیادہ لمبا نہ کیجیے گا۔ "میرے خواب لوٹا دو" میں رازی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کرتا جا رہا ہے؟ فرحت اشتیاق اور نمرہ احمد منظر کشی ایسے کرتی ہیں کہ لگتا ہے ہم خود ان علاقوں کی سیر کر رہے ہیں۔ اس سے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

پلیز کنیز نبوی اور نایاب جیلانی سے بھی کوئی مکمل ناول لکھوائیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ FM-97 اور 93 کے آر جیز (Ris) کے انٹرویو بھی شائع کریں۔ بار بار ان ہی معروف اداکاروں کے انٹرویوز شائع کیے جاتے ہیں۔

ج پیاری صباحت! آپ نے امتحانات کی مصروفیت میں سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا' بہت شکریہ۔

کنیز نبوی تک آپ کی فرمائش پہنچا دی ہے نایاب جیلانی کا ناول آپ بہت جلد پڑھیں گی۔ انٹرویو کے سلسلے میں آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے' جلدی پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

ارم احمد..... گاؤں لاوہ

عنیزہ سید کے کیا کہنے۔ مجھے لگتا ہے کھاری نے سعد کو پہچان لیا ہے اور جس مرائن کا مکالمہ تھا وہی شاید شہناز ہو۔ نگہت سیما اس بار پھر بازی لے گئیں۔ "اماں کا شفو" بہت مزے کی کہانی تھی۔ سائرہ رضا کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں مستزاد بھی کمال کی تحریر تھی رضیہ تو کٹھ پتلی سا کردار تھا۔ بے انتہا ترس آیا پڑھ کر۔ وہ ایک لڑکی کی کچھ

سمجھ نہیں آئی مگر آخری سطر ہی مجھے مکمل نچوڑ گئی ہے پوری کہانی کا۔

ج ارم! کھاری نے تو سعد کو پہچان لیا لیکن آپ نے شہناز کو پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ مراثن شہناز کیسے ہو سکتی ہے۔ شہناز ایک پڑھے لکھے بیوروکریٹ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سحرش شاہین.....کوٹ جان محمد

سلسلہ وار ناول بہت ہی اچھے طریقہ سے جا رہے ہیں جب کہ فرحت اشتیاق میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ میرا ناول سے رشتہ میری ایک بہت ہی اچھی دوست نے جوڑا ہے تب سے میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں جس کی وجہ سے زندگی بور نہیں لگتی۔ میں ہر ماہ اپنے بھائی سے خواتین اور شعاع کی فرمائش کرتی ہوں وہ میری فرمائش پوری کرتے ہیں۔

ج : پیاری سحرش! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ خواتین ڈائجسٹ کے سلسلے وار ناول آپ کو پسند ہیں۔ آپ نے کسی اور تحریر کے بارے میں نہیں لکھا۔ آئندہ ہمیں تفصیل سے خط لکھیے گا۔

آمنہ اجالا.....ڈھرکی

ٹائٹل اچھا تھا۔ خوب صورت سی ساڑی پہنے ماڈل اچھی لگی۔

اپنی کسی بھی فیورٹ رائٹر کو نہ پا کر خاصی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن پھر سعدیہ عزیز آفریدی جی کا نام دیکھ کر کچھ ہمت بندھی۔

مکمل ناولز میں سب سے پہلے صحیح فیصلہ پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح آسیہ رزاقی صاحبہ نے اس بار بھی بہترین اور سبق آموز لکھا۔ بالآخر صاعقہ نے بھی سمجھ لیا کہ اپنے گھر کے علاوہ اور اس سے بہتر کہیں کوئی سائباں نہیں۔ انور ماموں کا انتخاب کر کے اس نے واقعی صحیح درست فیصلہ کیا۔

اب آتی ہوں اپنے موسٹ فیورٹ ناول زمین کے آنسو کی طرف نگہت نیما زبردست طریقے سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ پلیز نگہت آپی احمد رضا کو ہمیشہ کے لیے ان اندھیروں کے حوالے مت کیجیے گا۔

فلک شاہ کی ہیروئن رابیل احسان کو ہونا چاہیے تھا۔ جانے کیوں اریب فاطمہ کا ہیروئن ہونا ہمیں ہضم نہیں ہو رہا۔ ہمیں لگتا تھا۔ اریب فاطمہ احمد رضا کی ہیروئن ہوگی۔

سائرہ آپی آپ نے تو اس بار رلا ہی دیا۔ "مسترد" لکھ کر آپ نے شاید صحیح لکھا اپنی کہانی میں۔ لوگ کتنا دکھ' اتنا کلیجہ چیر دینے والا غم برداشت نہیں کر سکتے۔ شاید یہاں پر ہر کوئی اپنے غموں اور دکھوں کی گٹھڑی کا بار اٹھائے ہوئے اس قدر نڈھال ہے کہ پھر ان کہانیوں کے کرداروں کے دکھ واقعی برداشت سے باہر ہیں۔

نگہت آپی کا ناول "میرے خواب لوٹا دو" دلچسپ موڑ پر آگیا ہے۔ اس قسط میں اریبہ نے ہمیں بہت غصہ چڑھایا سارہ کو اتنا کچھ کہہ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ رازی کو کچھ کہنا یا اس کے بارے میں کچھ پوچھنا تو در کنار اس نے سرے سے سارا الزام ہی بہن کے سر ڈال دیا۔

ج پیاری آمنہ! اریبہ کا رد عمل بالکل فطری تھا۔ سارہ اس کی بہن ہے اسے اپنی بہن سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے منگیتر سے رشتے پر راضی ہوگی' خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

ماریہ سندس.....چکوال

خط لکھنے کی وجہ "میرے خواب لوٹا دو" میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں کہ مجھے یہ ناول کتنا پسند ہے۔ پورے ناول میں "شمشیر" کا کردار سب سے زیادہ پسند ہے۔

ج: پیاری ماریہ! نگہت عبداللہ تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ مگر اتنا مختصر خط؟ کسی اور تحریر کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔

☼

چھ ہزار سے زیادہ کمرشل اور بل بورڈ بنانے والے

عطاالرحیم سے ملاقات

شاہین رشید

ایک چینی کہاوت ہے کہ ایک کامیاب سیلز مین وہ ہے' جو کسی گنجے کو کنگھا خریدنے پر مجبور کردے۔ یہ ہی بات اشتہارات پر بھی لاگو آتی ہے۔ گویا ایک کامیاب اشتہار وہ ہے جو کسی گنجے کو کنگھا اور برفانی علاقوں میں رہنے والے باشندوں کو ریفریجریٹر خریدنے پر مجبور کردے۔ فی زمانہ مقابلے کا دور ہے۔ لہٰذا اشتہارات کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب اور اثر انگیز اشتہار کے پیچھے غیر معمولی دماغ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اشتہاری دنیا میں کونسیپٹ رائٹر کی اصطلاح اس ذہن کے لیے رائج ہے' جو کسی بھی اشتہار کا بنیادی خیال پیش کرتا ہے۔ اشتہار کی کامیابی اور مقبولیت میں کونسیپٹ اور کاپی رائٹر کی بے حد اہمیت ہے۔ بلکہ اشتہار کی کامیابی کا سارا دارومدار ان ہی پر ہے۔

اور یہ لوگ نہ صرف پروڈکٹ کو مقبول کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں' بلکہ خوب صورت ماڈلز کو بھی ان ہی کی وجہ سے شہرت ملتی ہے اور ہم ان کے انٹرویوز تو لے لیتے ہیں۔ مگر ان کا نہیں لیتے جو ان کی کامیابی کا سبب بنتے ہیں۔

عطاالرحیم صاحب ایک کونسیپٹ رائٹر Concept writer ہیں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے کمرشل آن ایر آچکے ہیں اور آرہے ہیں۔

"جی! کیسے ہیں..... کچھ اپنے بارے میں اور اپنی فیملی کے بارے میں بتائیے؟"



"اللہ کا شکر ہے۔ میرے والدین کا تعلق انڈیا سے تھا۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ حیات ہیں اور میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ہم چھ بہن' بھائی ہیں۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ میں 21 دسمبر 1966ء کو کراچی میں پیدا ہوا تھا۔ اس زمانے میں پرائیویٹ اسکول تو ہوتے نہیں تھے۔ گورنمنٹ اسکولوں کا ہی معیار اتنا اچھا ہوتا تھا کہ پرائیویٹ اسکول اگر ہوتے بھی تھے تو ان کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کیا۔ کورنگی کے

ڈگری کالج سے گریجویشن کیا اور پھر کراچی یونیورسٹی سے "آئی آر" میں ماسٹرز کیا۔"

" Concept writer کیا ہوتا ہے؟"

"آپ کوئی ڈراما دیکھتی ہیں یا کوئی اشتہار دیکھتی ہیں تو اس کی کوئی نہ کوئی تھیم ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی سوچ ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی تصور ہوتا ہے کہ کوئی نئی چیز لے کر آنی چاہیے' تاکہ لوگ متاثر ہوں۔ اس کو کونسیپٹ (Concept) کہتے ہیں۔ کسی گھر کا منظر دکھانا ہے تو اس میں کیا' کیا ہوگا۔ سٹنگ کیسی ہوگی۔ لوکیشن کیسی ہونی چاہیے' وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ کی صلاحیت کا اور اک لوگوں کو کیسے ہوا؟ کیسے لوگوں نے جانا کہ آپ یہ کچھ کر سکتے ہیں؟"

"پڑھائی مکمل کرنے کے بعد میں نے "سپارکو" میں دس سال جاب کی۔ لکھنا میرا شوق تھا۔ لہٰذا جہاں سے اس شعبے کی ایڈورٹائزنگ ہوتی تھی تو اپنے شوق کی وجہ سے میں کچھ لکھ کر بھی دے دیتا تھا۔ یوں میرا شوق بھی پورا ہو جاتا تھا اور کچھ پیسے بھی مل جایا کرتے تھے... پھر جب دس سال کے بعد میں نے گولڈن ہینڈ شیک لے لیا تو میرے چھوٹے بھائی انعام الرحیم جو کہ ڈائریکٹر ہیں ان کے ساتھ مل کر ہم نے اپنا کام اسٹارٹ کیا اور "سوچ" کے نام سے اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولا... میرے بھائی شروع سے ہی اس فیلڈ میں ہیں۔ انہوں نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرنے کے بعد ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو جوائن کر لیا تھا اور اپنے پروڈکشن ہاؤس میں وہ کری ایٹو ہیڈ ہیں۔ تو ان کے ساتھ مل کر میں نے بھی کام شروع کر دیا۔"

"یہ بتائیں کہ آپ کیا' کیا کر چکے ہیں اور آج کل کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا' کیا کر چکے ہیں تو جناب! مختلف برانڈز کے لیے ہم نے کمرشل بنائے ہیں۔ ہمارا بنیادی کام کمرشلز بنانا' ڈاکومنٹریز بنانا اور کسی برانڈ کے ٹاک شوز بھی بناتے ہیں۔ آج کل ایک چائے کی کمپین چلا رہے ہیں۔ ان کے کمرشلز بنا رہے ہیں۔ ہم سیکڑوں مشہور برانڈز کے لیے کام کر چکے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔ یہاں سب کے نام لینا مناسب نہیں ہے۔"

"لوگوں تک آپ کی پہنچ کیسے ہوئی۔ کیسے پتا چلا کہ فلاں پروڈکٹ کا بنیادی خیال آپ کا تھا؟"

"یہ سب کام کانٹیکٹس کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ جب کسی کو اچھا کام کر کے دیتے ہیں تو وہ دوسروں کو بھی بتاتا ہے کہ فلاں صاحب کا یہ آئیڈیا تھا یا کونسیپٹ تھا چونکہ میرے بھائی پہلے سے اس فیلڈ میں تھے تو ان کے ذریعے لوگوں نے مجھے بھی سمجھنا اور جاننا شروع کیا۔ کچھ دوست وغیرہ تھے جو ہمارے پاس آئے کہ یہ کمرشل بنانا ہے۔ یہ کمپین چلانی ہے... تو بس اس طرح تعلقات بنتے چلے جاتے ہیں۔ اب تو ہم اس فیلڈ میں کافی سینئر ہو چکے ہیں۔"

"آپ کے کونسیپٹ اور آئیڈیاز کو اپروو (منظور) کون کرتا ہے۔"

"یہ کلائنٹ اپروو کرتا ہے۔"

"کوئی مشکل کلائنٹ بھی ملا آپ کو؟"

"جی! بہت مشکل کلائنٹس بھی ہوتے ہیں۔ چند دن پہلے ہی کی بات ہے کہ میں نے ایک پروڈکٹ کے لیے تقریباً" بیالیس کونسیپٹ لکھے۔ مگر کلائنٹ اس سے مطمئن نہیں تھا۔ میں خود بھی مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہ تو ہوتا ہے اس فیلڈ میں کہ کئی کئی کونسیپٹ لکھنے کے بعد کلائنٹ مطمئن ہوتا ہے۔"

"تو کلائنٹ ان باتوں کو سمجھتا ہے؟ یا اس میں اتنی عقل ہوتی ہے؟"

"ہاں... ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں کلائنٹ اگر سمجھ دار ہے تو وہ آسانی سے نہیں مانتا۔ لیکن کچھ کمرشلز ایسے بھی ہم اسکرین پر دیکھتے ہیں' جو بہت عجیب و غریب ہوتے ہیں اور ہم حیران ہوتے ہیں کہ کس طرح یہ کونسیپٹ لکھے گئے اور کس طرح یہ اپروو ہوئے۔ بہت سارے کمرشلز ایسے ہوتے ہیں جن میں صرف گانا ہی گانا اور ناچنا ہی ناچنا ہوتا ہے۔ یہ بہت عجیب لگتے ہیں۔ ویسے بے وقوفوں سے ہمارا ٹاکرا کم ہوتا ہے۔ آج کل بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں ہر شعبے میں اور وہ بہت سمجھ دار ہوتے ہیں۔ ہاں! جو ذرا کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں' ان کے ساتھ ہمیں کچھ پرابلمز ہوتے ہیں۔ ہم ان کی مرضی کے مطابق کمرشل بنا دیتے ہیں۔ مگر بعض اوقات شوٹ ہونے کے بعد اور فائنلائز ہونے کے بعد بھی اس میں تبدیلیاں کرواتے ہیں اور ہمیں کرنا پڑتا ہے۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ بہت ہی اچھا کمرشل تیار ہو گیا۔ لیکن کلائنٹ کو پسند نہیں آیا اور اس نے کہا کہ اب تو مجھے یہ چلوانا ہی نہیں ہے۔ تو پھر آپ کیا کرتے ہیں؟"

"ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیونکہ پہلے ایک اسٹوری بورڈ بنایا جاتا ہے۔ جس میں بتایا جاتا ہے کہ پہلے یہ سین ہوگا۔ پھر یہ ہوگا اور آخر میں یہ ہوگا۔ وہ چیز کلائنٹ کو دکھا دی جاتی ہے۔ کلائنٹ اس کو اپروو کرتا ہے۔ تسلی کرتا ہے۔ پھر ہم اس اسٹوری بورڈ کے مطابق شوٹ کرتے ہیں۔ چونکہ کلائنٹ پیسے خرچ کرتا ہے تو وہ اپنی مرضی کی چیز بھی مانگے گا۔"

"کمرشل کے اپروول کے لیے کوئی سنسر بورڈ بھی ہے؟"

"سنسر بورڈ کا کچھ پتا نہیں۔ اگر ہے بھی تو کوئی کام نہیں ہو رہا۔ اگر کسی کمرشل پہ کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے یا کچھ اعتراضات ہوتے ہیں تو اس پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ بس! اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔"

"اس فیلڈ میں پیسہ ہے؟"

"جی! بالکل ہے۔ تب ہی تو ہم کام کر رہے ہیں۔ کمرشلز میں تو اچھا خاصا پیسہ ہے۔"

"ماڈلز کا انتخاب آپ خود کرتے ہیں؟"

"جہاں تک ماڈلز کی بات ہے تو بہت سے ایسے ماڈلز ہیں جن کے ساتھ ہمارے ڈائریکٹ لنکس ہوتے ہیں اور بہت سی ماڈلز کمپنیوں کے ساتھ بک ہوتی ہیں کہ وہ کسی دوسری کمپنی کے ساتھ کام نہیں کریں گی۔ کچھ کمپنیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے ذریعے سے ہم ماڈلز لیتے ہیں۔"

"بل بورڈ بھی آپ ہی بناتے ہیں؟"

"اس کی فوٹو گرافی ہم کرواتے ہیں۔ پھر آگے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو دے دیا جاتا ہے۔ باقی کام پھر وہ ایجنسیز والے ہی کرتے ہیں۔"

"کمرشلز کا لوگوں پر کتنا اثر ہوتا ہے؟"

"بہت اثر ہوتا ہے۔ بہت سی ایسی پروڈکٹس ہیں جو بہت زیادہ مقبول ہیں۔ جیسے واشنگ پاؤڈر' ڈرنکس' صابن اور دیگر کئی اشیا... لیکن وہ بھی کمرشلز بنواتے ہیں اور چلواتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمرشل نہ بھی چلوائیں تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ان کی بھی مارکیٹنگ کمپین ہوتی ہے تو یقیناً" کمرشلز لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے کمرشلز بنتے بھی ہیں۔"

"رنگ گورا کرنے والی کریم کے اشتہار جن میں بتایا جاتا ہے کہ سات دن میں رنگ گورا ہو جائے گا۔ کیا اس قسم کے کمرشلز سے آپ لوگوں کو بہکاتے نہیں ہیں' کیونکہ سات دن میں کب اثر ہوتا ہے ایسی کریموں کا؟"

"نہیں! بہکانے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ میں اپنی حد تک آپ کو بتاؤں کہ ہم نے تو جتنی بھی برانڈز کے کمرشلز بنائے ہیں۔ وہ بہت اچھی برانڈز ہیں۔ ان کا نام بھی ہے اور ان کا بہت اچھا رسپانس بھی آیا ہے۔ ایسا کوئی ری ایکشن نہیں آیا کہ جس پر کوئی اعتراض ہوا ہو کہ جی! اس کریم سے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم ہمیشہ اچھی پروڈکٹ کا ہی کمرشل بناتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ گلی میں کوئی شربت بک رہا ہے اور ہم اس کی پبلسٹی شروع کر دیں۔ ہم اس بات کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ جس پروڈکٹ کا ہم کمرشل بنا رہے ہیں' وہ بہت معیاری ہو۔"

"مان جائیں کہ سات' آٹھ دنوں میں کوئی کریم رنگ گورا نہیں کرتی۔ جو رنگ قدرت دے دیتی ہے اس میں تھوڑی بہت تبدیلی تو ممکن ہے۔ مگر مکمل طور پر نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی لڑکی سانولی نہ ہوتی' کوئی لڑکی کالی نہ ہوتی۔"

"قہقہہ..."

"کمرشل کی تیاری میں کتنا ٹائم لگتا ہے؟ اور زیادہ سے زیادہ دورانیہ کتنا ہوتا ہے؟"

"کمرشلز کے پیچھے پورا ایک بیک گراؤنڈ ہوتا ہے۔

بظاہر تو کمرشل تیس سے پچاس سیکنڈز یا زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پیچھے ٹھیک ٹھاک محنت ہوتی ہے۔ کئی دن پہلے سے تیاری شروع ہوجاتی ہے۔ تیس سیکنڈ کے ایک کمرشل میں تقریباً پچاس ساٹھ افراد کام کررہے ہوتے ہیں اور ہر بندہ بہت اہم ہوتا ہے۔ لوگ تو کمرشل کو دیکھ کر ماڈلز کو دیکھ کر متاثر ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہوتا۔ سیٹ لوکیشن اس کی سیٹنگ میں کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔ ان پچاس ساٹھ بندوں میں اگر ایک ڈرائیور یا اسپاٹ بوائے بھی نہیں ہوتا تو فرق پڑجاتا ہے اور کام رک جاتا ہے۔"

"جو اسکرین پہ نظر آرہا ہوتا ہے لوگ اسی کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس میں کتنے لوگوں کی محنت ہے اس سے ہم ناواقف ہوتے ہیں۔ ایسے کری ایٹو لوگوں کو منظر عام پر کیوں نہیں لایا جاتا؟"

"چونکہ لوگوں نے ہمیں دیکھا نہیں ہوتا اور نہ ہی انہیں ہمارے بارے میں کچھ پتا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ہم سے واقف نہیں ہوتے۔ لیکن کری ایٹو لوگوں کو بھی منظر عام پر لانا چاہیے۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کری ایٹو ورک کیا ہوتا ہے اور کتنی محنت کے بعد کوئی چیز سامنے آتی ہے۔ یہ آپ لوگوں کا کام ہے کہ آپ ان لوگوں کے انٹرویو شائع کریں۔"

"جی۔۔۔ یہ بات تو ہے۔۔۔ لیکن قصور ہمارا بھی نہیں ہے۔ جو ڈیمانڈ ہوتی ہے اس کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بتائیں کہ آپ کی اس فیلڈ میں زیادہ کون کماتا ہے۔ کونسیپٹ رائٹر ڈائریکٹر یا ماڈل یا پھر پروڈیوسر؟"

"میرے خیال میں سب ہی کماتے ہیں اور اس میں نفع و نقصان بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہ آج کل کراچی میں کام کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ کراچی کے حالات کی وجہ سے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ لوکیشن بک کروائی۔ مگر حالات خراب ہوگئے۔ شوٹنگ کینسل ہوگئی۔۔۔ تو کم یا زیادہ کماتے سب ہی ہیں۔"

"کونسیپٹ رائٹر بننے کے لیے کون سی ڈگری لینا ضروری ہے یا پھر یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے؟"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے میں اپنی بات آپ کو بتاؤں کہ طالب علمی کے زمانے میں میں بہت اچھا مقرر رہا ہوں۔ مجھ میں بولنے کی بھی صلاحیت تھی اور لکھنے کی بھی صلاحیت تھی اور یہ چیزیں میں نے کسی سے سیکھی نہیں تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی میں نے آرٹیکل اور کالم لکھنے شروع کردیے جو کبھی چھپے اور کبھی نہیں بھی چھپے۔۔۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ اس کے لیے کسی خاص مضمون کا پڑھنا ضروری نہیں۔ ہاں مزید معلومات کے لیے یا میڈیا میں آنے کے لیے ماس کمیونیکیشن پڑھ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"ایک گلوکار کا میں نے انٹرویو کیا اور پوچھا کہ آج کل آپ کیا کررہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ میں کونسیپٹ رائٹر ہوں۔ جبکہ ان کا اس فیلڈ میں کوئی تجربہ نہیں تھا تو کیا آسانی سے جاب مل جاتی ہے؟"

"دیکھیں جی! آج کل تو ہر کوئی کونسیپٹ رائٹر بھی بنا ہوا ہے اور ڈائریکٹر بھی۔ لیکن ان کے معیار اور ایک پروفیشنل بندے کے معیار میں فرق ہوتا ہے۔ جیسے ماضی کے ڈرامے بہت معیاری ہوتے تھے۔ آج کل کے اتنے معیاری نہیں ہوتے۔"

"ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ کے پیچھے کس عورت کا ہاتھ ہے؟"

"میری زندگی میں دو ہی عورتیں آئی ہیں۔ ایک میری ماں اور ایک میری بیگم۔ بہنوں کی بہت پہلے شادی ہوگئی تھی تو ماں ہی ہوتی ہے جو بچوں کی اچھی تربیت کرتی ہے اور جب شادی ہوجائے تو زندگی کی کامیابیوں میں بیگم کا بھی ہاتھ ہوجاتا ہے۔ یہ بڑی رنگ رنگیلی فیلڈ ہے۔ بیگم ڈرتی بھی تھیں کیونکہ ہمارے آنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ مگر بیگم نے کمپرومائز کیا۔"

"بیگم کا نام کیا ہے؟ کتنا عرصہ ہوگیا شادی کو اور وہ کیا کرتی ہیں؟"

"بیگم کا نام شازیہ ہے۔ 1996ء میں شادی ہوئی اور وہ ہاؤس وائف ہیں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ عورت کی ضرورت گھر پر زیادہ ہوتی ہے۔ گھر سنبھالنا بچوں کی تربیت کرنا یہ عورت کی ذمہ داری ہے۔ ماشاء اللہ میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا حافظ قرآن بھی ہے میٹرک میں ہے اور چھوٹا بیٹا نویں میں جائے گا۔ اگر گھر کے حالات ایسے ہوں کہ عورت کا کام کرنا ضروری ہے تب تو کرنا چاہیے۔ ورنہ گھر پر رہ کر ذمہ داریاں نبھانا۔ زیادہ بہتر ہے۔ بچوں پر چیک اینڈ بیلنس دونوں کا ہوتا ہے مگر پھر بھی عورت کی ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے۔ میں جس فیلڈ سے ہوں وہاں کے حالات اور ملک کے حالات کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اس لیے ابھی تک تو میں نے بچوں کو موبائل فون سے بھی دور رکھا ہوا ہے۔"

"بڑی بات ہے ورنہ آج کل کے بچے تو موبائل کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ آپ مزاج کے نرم ہیں یا گرم؟"

"میرے خیال سے میں تھوڑا گرم ہوں۔ کیونکہ مجھے ذرا جلدی غصہ آجاتا ہے اور غصے کے لیے ضروری نہیں کہ کسی خاص بات پر ہی آئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھر جاؤں تو کھانا تیار نہیں ہوتا۔ پھر مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کھانا وقت پر ملنا چاہیے۔"

"کیا پسند ہے کھانے میں اور شوقین ہیں کھانے پینے کے؟"

"جی کھانے پینے کا بہت شوقین ہوں۔ بیگم کے ہاتھ کی پکی بریانی بہت پسند ہے۔ میری بیگم اچھا کھانا پکاتی ہیں۔"

"یہ بتائیں کہ اس فیلڈ میں آکر کیا کھویا کیا پایا؟ اور زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا؟"

"کھویا تو کچھ نہیں۔ الحمد اللہ۔۔۔ پایا ہی پایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں کافی دیر سے اس فیلڈ میں آیا ہوں۔۔۔ مجھے بہت پہلے آجانا چاہیے تھا۔"

"محبت کی کبھی کسی سے؟ ٹین ایج میں یہ بخار ضرور چڑھتا ہے۔"

"بالکل! یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے اور جتنی تیزی سے یہ بخار چڑھتا ہے اتنی ہی تیزی سے اتر بھی جاتا ہے۔ جب میں کالج میں تھا اور پھر جب میں یونیورسٹی میں آیا تو اسلامی جمعیت طلبہ کے بہت قریب تھا۔ مذہبی تنظیم تھی اور ہمارے گھر کا ماحول بھی بہت مذہبی تھا تو مجھے ان محبتوں کے بارے میں سوچنے کا نہ تو موقع ملا اور نہ ہی میں نے ان محبتوں کے بارے میں سوچا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بہت شرافت میں زندگی گزاری۔"

"اسلامی جمعیت طلبہ سے آپ کا تعلق رہا ہے تو کیا سیاست سے بھی آپ کا لگاؤ ہے؟"

"بالکل! سیاست کی طرف میرا رجحان ہے۔ جماعت اسلامی سے تعلق کی وجہ سے اور ان کے ساتھ مجھے فلاحی کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اگرچہ مصروفیت بہت ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ٹائم نکال کر کچھ نہ کچھ کرنے کا موقع ضرور مل جاتا ہے۔"

"میوزک سے لگاؤ ہے؟"

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ کبھی کبھار غزلیں سن لیتا ہوں۔ فلمیں بھی نہیں دیکھتا کہ شوق ہی نہیں ہے۔"

"اگر میوزک سنتے تو زیادہ اچھے کونسیپٹ رائٹر ہوتے۔"

قہقہہ۔۔۔ "سچ پوچھیں تو یہ پاپ میوزک تو مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ بہت ہی بے تکے گانے ہوتے ہیں۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"بالکل۔۔۔ میں آپ سے کہنا چاہوں گا کہ جو لوگ کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرتے ہیں۔ خواہ وہ رائٹر ہوں پروڈیوسر ڈائریکٹر یا کسی بھی فیلڈ سے ہوں ان کو بھی متعارف کرائیں تاکہ نئے لوگوں کو گائیڈ لائن ملے کہ میڈیا میں آکر ہم کیا کیا کرسکتے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عطاء الرحیم صاحب سے اجازت چاہی۔



عنیزہ سید

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کردیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کررہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ



بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آ رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من یالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو قلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کر کے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتائے بغیر کہیں نہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ماہ نور کو یہ سب اچھا لگا مگر اس نے سعد کو منع کردیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے ہی اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے کھل کر اپنے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہوگیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے قلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں۔ جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے لچکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر سے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہوگئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر رہ گئی۔

آپا رابعہ، سعدیہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیتی ہیں کہ وہ اسے آگے نہیں پڑھا سکتیں۔ سعدیہ کے مزاج میں مستقل برہمی آجاتی ہے۔

ماہ نور، سعد کو اپنے گھر لے جاتی ہے۔ فائزہ کا سرد اور دو ٹوک انداز سعد کو کچھ اچھا نہیں لگتا مگر کھاری اور ماہ نور کے تایا، تائی سے مل کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کھاری اور رضوان الحق کی بہت اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ سارہ کے ہاتھوں میں مشاقی آتی جارہی ہے۔ یمی آنٹی اسے سراہتی ہیں اور باتوں باتوں میں اسے کریدتی ہیں کہ وہ رکو کو پسند کرتی تھی۔ سارہ انہیں مبہم سا جواب دیتی ہے۔ جس میں یہ بات نہایت واضح ہوتی ہے کہ سعد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔

سعد، ماہ نور کے ساتھ خدیجہ اور فاطمہ خالہ سے ملنے جاتا ہے۔ ادھر شہناز کا ذکر نکل آتا ہے۔ سعد اس گفتگو میں دلچسپی لیتا ہے جسے فاطمہ محسوس کرلیتی ہیں۔ پرانا البم دیکھتے ہوئے سعد، قلزا ظہور کی تصویر "فوراً" پہچان لیتا ہے۔

بارہویں قسط

"کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے لیے جو بھی سوچوں گا بھلا ہی سوچوں گا۔" تیسرا سوال۔

"ہاں جی بالکل۔" بے خبر کھاری نے زور زور سے پرجوش انداز میں سر ہلایا۔

"تو بس، پھر بیٹا سمجھ لے جو فیصلہ میں نے آج تیرے لیے کیا ہے، اس میں بھی تیرا بھلا ہی بھلا ہے۔ تیری زندگی سنور جائے گی۔" چوہدری صاحب نے پراعتماد انداز میں کہا۔

"نہیں جی۔" کھاری نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "کیسا فیصلہ جی؟" اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "کہیں میری ڈیوٹی پھر سے ڈنگروں (جانوروں) والی حویلی میں تو نہیں لگ گئی۔" اسے خیال آیا۔

"مولوی سراج کی دھی رانی جو ہے نا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ہاں جی، سعدیہ۔" کھاری نے تیزی سے کہا۔

"اس سے تیرا نکاح طے کردیا ہے میں نے" آج سے ٹھیک دس دن بعد، یہ جمعہ چھوڑ کر اگلے جمعے۔" چوہدری صاحب نے دھماکا کیا کھاری کے ہوش و حواس اڑ گئے۔

☼ ☼ ☼

"سر نہ اٹھانا' دم نہ مارنا کھاری! تو چوہدری صاحب کا قرض دار ہے ان کے احسانوں کے نیچے دبا ہوا ہے مجال نہ کر سر اٹھانے کی' دم مارنے کی۔"

اس نے اپنے کمرے میں بچھی کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے اور کروٹیں بدلتے بدلتے پچاسویں مرتبہ ماسی جنت کی یہ بات یاد کی' اور خود کو اس بات کے سائے تلے لانے کی کوشش کی۔

"مولوی سراج کی دھی رانی جو ہے....

اس سے تیرا نکاح طے کر دیا ہے میں نے' آج سے ٹھیک دس دن بعد' یہ جمعہ چھوڑ کر اگلے جمعے۔" اگلے ہی لمحے اسے اپنی سماعت کے ارد گرد بڑی طاقت کا بم پھٹتا محسوس ہوا۔

"سعدیہ کلثوم!" اس نے دل میں دہرایا اور اسے لگا جیسے چارپائی کے بان میں کانٹے اگ آئے تھے اور وہ کانٹے اس کے کپڑوں سے پار جسم میں کھبے جا رہے تھے۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور فرش پر بیٹھ گیا۔

"اندر کی بات کھاری پتر اندر ہی رہ جانی چاہیے' جس جس راز پر مولا نے پردہ ڈالا ہے' بندے کو اس کا پردہ اتارنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔" اسے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتے چوہدری صاحب کا چہرہ یاد آگیا۔

"تیرا دوڑ دوڑ کر مولوی سراج کے گھر جانا' سوہنی اور چنگی سوغاتیں چن چن کر ان کے لیے تھیلوں میں بھرنا' بھی بہت تھوڑے لوگوں کی نظروں میں آیا ہے' اور مولوی سراج کی دھی رانی کو خالم خالی فارم ہاؤس میں لانا اور اسے یہاں دوپہر سے شام تک رکھنا تو اللہ کے سوا صرف ایک انسانی آنکھ نے دیکھا ہے پتر اوئے۔"

"سن سن سن۔" کھاری کے جسم پر لفظوں کی سنگ باری شروع ہوئی تھی۔ الفاظ کے ذریعے سنگسار کیے جانے کی تاریخ بھی کسی تاریخ دان نے رقم نہیں کی' کی ہوتی تو شاید چوہدری سردار جیسے پڑھے لکھے شخص کو اس کا سلیقہ ضرور ہوتا۔

فرش پر بیٹھے بیٹھے اس نے جیسے اپنی طرف آتے پتھروں سے خود کو بچانے کی خاطر بازو اپنے آگے پھیلائے مگر پھر بھی اپنا بچاؤ نہیں کر پا رہا تھا۔

"خالم خالی فارم ہاؤس میں دوپہر سے شام۔" پتھر جیسے اس کے جسم کے ہر حصے پر پڑ رہے تھے۔

"میں اس نوں فارم ہاؤس دکھایا تھا جی۔ اس نوں بوت شوق تھا دیکھنے کا۔" اس کے پاس ڈھال کے لیے الفاظ کم تھے' بے ربط تھے اور شاید کھوکھلے بھی' کبھی چور نے بھی مانا ہے کہ اس نے چوری کی تھی' وہ تو یہ ہی کہے گا کہ میں تو بڑا معصوم ہوں۔

"چلو مگر بات تو سچی ہے نا' تم مولوی کی دھی رانی کو ادھر لائے تھے۔" اس کو ڈھال کے لیے استعمال کیے یہ الفاظ مہنگے پڑے تھے' اس کا اقرار' اقرار جرم ثابت ہوا تھا۔

"لیکن اللہ نے پردہ ڈالنے اور پہلے سے پڑے پردے کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔" چوہدری صاحب نے کتنے اطمینان سے اس کی بے ضرر حرکت کو گناہ کے معنی پہنا دیے تھے۔ اس بات کا مولوی کو علم نہیں' وہ تو میرے پاس آیا تھا اپنی غریبی کا رونا رونے' اس کی اتنی پسلی نہیں کہ لڑکی کو خود کہیں دو بول پڑھا کر رخصت کر دے' مگر چاہتا یہ ہے کہ اس فرض سے جتنی جلدی ہو سکے سبکدوش ہو جائے' اب میرے پاس بندے تو بہت تھے' جو یہ کام بسم اللہ کر کے کر لیتے مگر میرا دھیان تیری طرف کیوں گیا بھلا؟" انہوں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا جو نہتا تیروں کے سامنے کھڑا تھا۔

"تو مولوی کے گھر اڑ کر جاتا ہے' مولوی کی گھر والی نے تجھے بیٹا بنایا ہوا ہے' مولوی کی دھی کو تو فارم ہاؤس کی سیر

بھی کراتا ہے۔ اوئے کھاری باؤ' پیو ہی تو پتروں کی رمزیں جانتے ہیں' تو میرا اپنا پتر نہ سہی' تجھے میں نے بیٹوں کی طرح پالا ہوا ہے۔ تیری ایک ایک جنبش پر میری نظر ہے۔ جس دن محمد مالک نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنی ننگی آنکھ سے تجھے مولوی کی دھی کے ساتھ خالی فارم ہاؤس میں دیکھا تھا' میں اسی روز جان گیا تھا کہ اپنا کھاری جوان ہو گیا ہے۔"

اب کے آنے والے پتھر بڑے اور وزنی تھے' کھاری کے جسم کے ساتھ روح تک کو کچلنے لگے تھے۔

"آپ حکم کریں چوہدری صاحب! میں تو ڑی کا گڈا اپنے اوپر سے گزار لوں۔" اس نے چوہدری صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے جڑے ہاتھ ان کے سنہری تلے والے کھسے پر رکھتے ہوئے کہا تھا "آپ اپنے ہاتھوں مینوں سولی چاڑھ دیو (سولی پر چڑھا دیں) میں سی کراں تے کافر (میں اف بھی کروں تو کافر کہلاؤں) پر میرے متھے ایسی بات نہ لگائیں۔ چوہدری جی' نہ لگائیں۔" دہرا ہوتا ہوا رو رہا تھا وہ۔

"اوئے کیا ہو گیا ہے پتر جی!" انہوں نے نرم ہاتھوں سے اسے اٹھاتے ہوئے کہا "یہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں' جب رب پردے رکھنے والا ہے تو ہم انسان کون ہوتے ہیں پردے اٹھانے والے۔ جب ہی تو میں نے مولوی پر احسان بھی رکھ دیا تو تیرے من کی مراد بھی پوری کر دی۔ نکاح پڑھا کر لے آ اسے پکا ہی فارم ہاؤس' جتنی مرضی آئے سیریں کرا لے اسے فارم ہاؤس کی اس کے بعد' تجھے آپ پتا چل جائے گا کہ چور بن کر پھل چکھنے میں مزا ہے یا سادھ بن کر پھل کی حفاظت کرنے میں۔"

"نہ کریں جی' نہ کریں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے' وہ بولنا چاہتا تھا مگر اس کے معصوم الفاظ پر ایسا وار کیا گیا تھا کہ زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"چل شاباش اٹھ!" چوہدری صاحب نے اٹھ کر اسے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کیا تھا "میرا شیر بن شیر' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر' جوانی کس پر نہیں آتی' پیر کس کا نہیں ڈولتا' نظر رکھنے والے ماں پیو کا یہ ہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ جوانی کی ایک لچک اور پیر کی ایک ہی لغزش پر معاملہ اوپر سے پکڑ لیتے ہیں۔ چل شاباش۔ رونا دھونا بند کر اور دل میں پھوٹتے لڈوؤں کی خوشی منا چل کے۔"

چوہدری صاحب نے سنگ ساری کے بعد اس کا لاشہ ریشم کے کفن میں لپیٹنا چاہا تھا مگر اس کے جسم پر پڑی ضربیں اس کی روح تک کو چور چور کر رہی تھیں۔ وہ چوہدری صاحب کے کمرے سے اپنے کوارٹر تک کیسے پہنچا تھا' وہ نہیں جانتا تھا۔ ہاں اتنا اسے معلوم تھا کہ وہاں سے آنے کے بعد وہ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کی عمر میں پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ وہ اتنا رویا تھا' اتنا کہ اس کو لگ رہا تھا اس کے تازہ دکھ کے ساتھ اس کے دل اور روح میں اتنی عمر تک کے بڑے سارے پھپھولے پھٹ کر اس کی آنکھوں کے راستے بہنے لگے تھے۔

"میرا ربا! میں نے کبھی گلا نہیں کیا' میرے منہ توں کبھی شکایت دا لفظ نئیں نکلا' پھر تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا ہے؟" وہ اپنی عقل کے مطابق سوچ رہا تھا۔ جب ماسی جنت اس کو ڈھونڈتی ادھر آئی تھی۔

ماسی جنت نے اسے اپنے ہاتھوں سے پالا تھا۔ کھاری کی جو حالت اس روز اس نے دیکھی تھی' اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

"بتا تو سہی۔ ہوا کیا ہے۔" ماسی جنت نے اپنے مشقت سے فولاد ہوتے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے بازو میں کھبوتے ہوئے جھنجوڑ کر پوچھا تھا۔

"بندے کا کوئی ایک سنگی' کوئی ایک بیلی (ساتھی) ایسا ہوتا ہے کھاری' جس سے دل کا حال کہہ کر وہ ہلکا ہو جائے' بول میرا پتر! کیا ہوا؟ میں تیری ماں جیسی ماسی ہوں کہ نہیں۔"

ماسی جنت برسوں کی مشقت کی دھول کے پیچھے زندگی کی نرمیوں اور خوشگواریوں کو بھول بھال چکی تھی' لیکن پھر

بھی اس نے حتی المقدور کوشش کی تھی کہ وہ کھاری کو اپنائیت کا احساس دلا سکے۔ کھاری کو بھی اس وقت کسی کی ضرورت تھی، کسی سننے والے کان اور سمجھنے والے دل کی ضرورت۔ اس نے پھٹنے کے سے انداز میں سب کچھ ماسی جنت کے گوش گزار کردیا۔ پوری بات کا ایک چسکے دار پہلو بھی تھا، جو ماسی جنت سے لے کر اس گاؤں کی تقریباً" ہر عورت کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا تھا، اور اسی پر ماسی جنت کا پہلا ردعمل آیا۔

"ہائے وے وہ جھلیا۔ تو اسے میرے سامنے لے کر آتا فارم ہاؤس میں۔ مجھے بتاتا ماسی! مجھے مولوی کی لڑکی پسند آگئی ہے تو میں اس کی خاطر خدمت الگ کرتی اور چوہدری صاحب کو خود بتاتی کہ مولوی کے پاس رشتہ لے کر جائیں۔"

کھاری کو ماسی جنت کے یہ جملے خود پر اچھالے گئے پتھروں میں مزید اضافہ محسوس ہوئے تھے۔

"ماسی جو تو سمجھ رہی ہے، وہ گل (بات) ہے ہی نئیں، تو کہہ سکتی ہے تو اب جا کر چوہدری صاحب کو کہہ دے کھاری نوں معاف کردیو، کھاری اتنے جوگا (اس قابل) نئیں، ایہہ کھاری کی اوقات تو بڑی اچی (اونچی) گل (بات) ہے۔"

"ہائے وے جھلیا!" ماسی نے اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر حیرت سے کہا "من کی پسند خود چل کر تیرے پاس آئی ہے تو کہتا ہے اے موڑ دے، تیرے سے زیادہ جھلا تے شیدائی دوسرا کون ہوگا۔"

"او نئیں ہے من دی پسند کوئی شوئی۔" کھاری الجھ کر بلند آواز میں بولا "تو چوہدری صاحب کو نئیں نا بتائے گی تے لے فیر (پھر) میں آپ ہی جاتا ہوں، خود گل کرتا ہوں، کدی حکم نئیں ٹالا پر یہ حکم نئیں، سولی دا فرمان ہے، ایک من گھڑی بات کا الزام ہے، او میں تو بھین جی کا شاگرد تھا، سبق لیتا تھا ان سے، بندے نوں انسان بننے کے واسطے اونہاں دے گھر جاتا تھا، جو چیزیں ان کے گھر پہنچاتا تھا۔ ان دی چھانٹی اس لیے کرتا تھا کہ استاد کو ماٹھی سوغات نئیں دینی چاہیے۔ سعدیہ کو فارم ہاؤس ایس لیے لایا تھا کہ اس وچاری نے دنیا ویکھی نئیں تھی، فارم ہاؤس اس کے واسطے امریکہ تھا امریکہ، میں نے سوچا، میرا کیا جاتا ہے، جو یہ وچاری ذرا باہر دیاں شیواں (باہر کے ملک سے آئی چیزیں) دیکھ لے گی۔ چاچے مالک کی نظر پڑ گئی تھی تو اسی دن مینوں تو گردن سے پکڑتا، پوچھتا یہ کیوں یہاں آئی ہے؟ لے کر چوہدری صاحب کو بتایا کہ......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"آخ تھو!" اس نے چہرہ ایک طرف جھکا کر منہ سے آواز نکالی "میرا وجود کیچڑ و کیچڑ کردیا چاچے مالک نے، میں سر اٹھا کر چلتا تھا اس نے میری نظروں میں مینوں آپ نوں منہ کے بل گرادیا۔"

"اونہ کاکا! چوہدری صاحب کو انکار نہ کرنا وہ مولوی سے زبان کر چکے ہیں، سر نہ اٹھانا سر نہ اٹھانا، تو چوہدری صاحب کا قرض دار ہے، تو ان کے احسانوں کے نیچے دبا ہوا ہے، مجال نہ کر سر اٹھانے کی، دم مارنے کی۔" ماسی جنت نے اسے اس کی حیثیت یاد دلادی تھی۔ اس کا بال بال چوہدری صاحب کے احسانوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ وہ خود اپنے وجود کے لیے چوہدری صاحب کا دم دم محتاج تھا۔

"پر وہ حکم کرتے، اپنے مان سے کہتے۔ لے کھاری! میں نے مولوی صاحب نوں زبان دے دی۔ جو گل انہوں نے کی ہے ماسی او میرے توں (مجھ سے) بھاری ہے۔"

"چھوڑ پرے یہ باتیں۔ شادی کی تیاریاں کر لے، میں تو خود ڈھولکی بجاؤں گی۔" کھاری ساڈا گھوڑی چڑھیا ہمارے فارم ہاؤس کا راجہ گھوڑی چڑھیا۔" ماسی جنت نے اپنے ادھ کھائے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"توں میری بات نئیں سمجھے گی ماسی!" وہ دکھ سے بلبلا کر بولا "کوئی بھی نئیں سمجھے گا۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"او چھڈ سوچ سمجھ کی باتیں۔" ماسی نے ہاتھ جھٹک کر کہا "ہم نے لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ کھاری کا بیاہ مولوی کی

بیٹی سے ہو رہا ہے۔ تو مولوی کی بیوی کو استاد کہتا ہے تو شکر کر استاد کی دھی سے بیاہ ہو رہا ہے۔ نئیں تو چوہدائن نے تجھے اس رضیہ چڑیل کے گلے مڑھ (باندھ) دینا تھا۔" ماسی جنت نے اٹھتے ہوئے کہا اور شادی بیاہ کا کوئی ٹپہ گنگناتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

مگر ماسی سے دل کی بات، بلکہ دل کی جلن کا بوجھ بانٹ کر بھی اس کا دل ہلکا نہیں ہوا تھا۔ چوہدری صاحب کے الفاظ کوڑوں کی طرح اس کے وجود پر پڑے تھے۔ وہ اگلی صبح تک زخم زخم ہوچکا تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے نیم تاریکی میں جب کالا اور سفید تاگا نظر آنے لگا۔ مولوی سراج سرفراز کی آواز مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر ابھری۔ "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کھاری ٹھنڈے فرش پر دھرا اپنا اکڑا ہوا وجود حرکت میں لایا اور کھڑے ہو کر کمرے میں موجود واحد کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر جھانکا، باہر نیم تاریکی تھی اور خنک ہوا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکلا۔ خنک ہوا اس کے جسم سے ٹکرائی اسے اپنے انگارہ بنتے وجود کو راحت پہنچتی محسوس ہوئی۔

"حی علی الفلاح، حی علی الفلاح۔"

مولوی سراج سرفراز نیند کی بے خبری میں پڑے ہوؤں کو بھلائی کی طرف آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ کھاری نے اپنی جلتی آنکھوں کو زور سے بند کیا اور پھر انہیں کھول کر دوبارہ سامنے کے منظر پر ٹکادیں۔ وہ اس نیم تاریکی میں نجانے کیا دیکھنا چاہ رہا تھا۔



"پھر کیا کہا چوہدری صاحب نے؟" آپا رابعہ کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی اور اپنے سوال کا جواب جان لینے کی عجلت تھی۔

"انہوں نے کہا، مولوی صاحب! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" مولوی سراج سرفراز نے چائے کے پیالے پر آئی باریک سی جھلی کو انگلی سے ہلایا، جھلی ان کی انگلی کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔ انہوں نے انگلی اوپر اٹھا کر جھلی کو زبان سے چاٹا اور آپا رابعہ کی طرف دیکھا جنہوں نے اپنے سوال کے جواب کے تجسس میں ان کی اس حرکت پر جز بز ہوتے ہوئے چہرہ دوسری طرف نہیں موڑا تھا۔

"فکر کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟" آپا رابعہ نے بے چینی سے کہا۔

"او بی بی! دم تو لے لو۔" مولوی صاحب نے چائے کا گھونٹ سڑکنے کے بعد کہا "چوہدری صاحب کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے، بادشاہ آدمی ہیں وہ، اس سے بڑا ایثار کیا ہو سکتا ہے کہ مجھے کہنے لگے مولوی جی! آپ کی بچی ہمارے لیے قابل احترام ہے، وہ ہماری اپنی بچی ہے، ہم کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو کیوں ڈھونڈیں بچی کو اس کے ساتھ رخصت کرنے کے لیے۔ بچی کی زندگی ڈبونی ہے کیا!" مولوی صاحب کے چہرے پر چوہدری صاحب کے لیے عقیدت بھری مسکراہٹ ابھری۔

"اوہو! پھر آخر جواب کیا دیا چوہدری صاحب نے؟" آپا رابعہ مولوی صاحب کے اس انداز گفتگو سے سخت چڑا کرتی تھیں۔

"دم لو رابعہ بی بی! دم لو، آپا بیگم کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے باوجود آپ کو تحمل سے گفتگو کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔" مولوی سراج نے پیالا ہلا کر چائے مزید ٹھنڈی کرتے ہوئے کہا "آپا۔ کیا سلیقہ تھا گفتگو کا ان کو۔ بات کرتی تھیں، مانو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔"

آپا رابعہ نے جھلا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب یہ مولوی صاحب کے لیے آپا رابعہ کی شدید ناراضی کی علامت تھی۔

"ہاں تو چوہدری صاحب فرمانے لگے۔ مولوی جی! آپ اس پنڈ کے بچوں، بڑوں کو بھلائی کی طرف بلاتے ہو، اللہ کا کلام پڑھاتے ہو، نیکی کا درس دیتے ہو، بزرگوں کے قصے سناتے ہو، آپ بھی ہمارے لیے محترم ہو۔"

"ایک اور تفصیل!" آپا رابعہ نے دل میں امڈتے غصے کو بند منہ کے اندر دانت پیس کر باہر آنے سے روکا۔

"بولے آپ کی بچی کی خاطر ادھر ادھر کیوں دیکھیں۔ میرا کھاری حاضر ہے۔" بالآخر مولوی سراج سرفراز نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اس اطلاع کو اگلا جس کو سننے کے لیے آپا رابعہ کے منتظر کان بے چین تھے۔

"کھا، کھا۔۔۔ ری!" الفاظ رک رک کر ان کے حلق سے نکلے۔ انہیں اپنے جسم میں دوڑتے خون میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ عمر بھر میں واحد خواہش جو پوری ہوئی تھی۔

"کون کہے کہ کاش اس لمحے کچھ اور مانگ لیتی، جبکہ میں نے تو مانگنا ہی یہی تھا۔" انہوں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میں نے کہا چوہدری صاحب! کھاری آپ کا خاص بندہ ہے، بیٹوں کی طرح پالا ہے آپ نے اسے ہم ٹھہرے اجنبی، ہمارا آگا پیچھا دیکھے بغیر آپ نے یہ کیسے کہہ دیا۔ مولوی صاحب نے رسان سے کہا۔ "یہ میں نے اس لیے کہا کہ بعد میں کوئی سعدیہ کو طعنہ نہ دے کہ جی نجانے ذات کے کون ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

"ماشاء اللہ کیا ایمان دار روح پائی ہے آپ نے مولوی سراج سرفراز۔" آپا رابعہ نے اندر سے اٹھتے غصے کے ابال کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی اعتراض کیے بغیر رشتہ ڈال رہے ہیں اور آپ اپنے عذر خود ہی پیش کر رہے ہیں۔"

"سبحان اللہ، کیا بڑے دل کے مالک ہیں چوہدری صاحب، بولے مولوی جی بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں سب کی۔ میں آپ کی بچی کی شرافت نجابت اس کے ماں باپ کے کردار سے پہچانتا ہوں۔ اتنے سال ہو چکے آپ لوگوں کو ہمارے درمیان رہتے ہوئے، کوئی قابل اعتراض بات سنی نہ دیکھی۔ بس آپ نکاح کی تیاری کریں۔"

"ہیں!" آپا رابعہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ "نکاح کے لیے بھی تیار ہو گئے۔"

"ارے رابعہ بی بی! اب تک تو وہ نکاح کی تیاری میں بھی مصروف ہو چکے ہوں گے" مولوی صاحب نے چائے کا خالی پیالہ لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"شادی مرگ۔" رابعہ آپا نے برسوں پہلے یہ لفظ اور اس کے معنی کسی سے سنے تھے، مگر دراصل یہ کیفیت ہوتی کیسی ہے، یہ اس روز انہیں پتا چلا تھا۔ اگلے لمحے ان کی نظر اس جگہ کی بدحالی پر پڑی جس میں وہ بیٹھی تھیں۔

کوٹھڑی نما تنگ کمرہ، جس میں تین چارپائیاں بمشکل بچھی تھیں، ایک جستی ٹرنک اور چمڑے کا ایک سوٹ کیس، فرش پر بچھا گھسا ہوا بدنما نمدہ۔ جس میں سال بہ سال نئے سوراخ نمودار ہونے پر اس کے صاف اور مکمل حصے کو اوپر کی سطح پر رکھنے کے چکر میں وہ تہہ ہوتا ہوتا ایک فرشی گدی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مولوی سراج اسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اور تسبیح پڑھتے تھے۔ دیوار پر لگی پرچھتیوں پر برتنوں کے نام پر چند پلیٹیں، اکا دکا گلاس اور تام چینی کے دو ڈونگے سجے تھے، باقی حصے پر سبز کاٹن کے جزدان میں رکھا قرآن پاک اور دعاؤں کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ پرچھتی کے بریکٹ پر لگی کیلوں میں سے ایک پر ان گنت چھوٹی بڑی تسبیحیں۔ لٹک رہی تھیں، یہ تسبیحیں، مولوی صاحب کو عمرہ اور حج سے واپس آنے والے اسی گاؤں کے باسی تحفے میں دے جاتے تھے۔ دوسری کیل کے ساتھ ازاربند ڈالنے کی سلائی اور چھوٹی سی قینچی لٹکی تھی۔

"فقر اور صبر، توکل اور غنا، سادگی اور درویشی" وہ ماضی میں پڑھے اسباق کی سچی تصویر تھیں، مگر وہ کس قدر خالی ہاتھ تھیں۔ ان کے پاس سعدیہ کو جہیز کے نام پر دینے کو ایک تنکا تک نہ تھا۔

"جب ہی تو۔" انہوں نے اپنے سر میں اٹھتی ٹیس کو جھٹکنے کی خاطر سوچا۔ "جب ہی تو اس کے لیے ایک ایسے

دولہا کا انتخاب میرے دل میں ٹھنڈ ڈال رہا ہے، جس کا بظاہر کوئی آگا ہے نہ پیچھا، مگر اس کی مست زندگی ہے، سعدیہ کو نہ کھانے کی کمی ہو گی نہ پہننے کو کپڑے لتے کی فکر، چوہدری صاحب اپنی ذمہ داری پر لے کر جا رہے ہیں۔ اپنی ذمہ داری نبھانا بھی جانتے ہیں۔ واہ میں صدقے جاؤں اس وقت کے، جب مجھے یہ خیال آیا اور میں نے مولوی صاحب کے کان میں یہ خیال پھونک کر انہیں فارم ہاؤس بھیجا۔ کون کہتا ہے چھٹی حس کوئی چیز نہیں ہوتی یا چھٹی حس کام نہیں کرتی، صدقے جاؤں اس خیال کے جو کہتا تھا۔ چوہدری، ضرور کھاری کا رشتہ ڈالے گا۔ اسے پتا ہے بے نام نشان و کھاری کو اس سے اچھا موقع اور کیا مل سکتا ہے۔

وہ جھومے جا رہی تھیں۔



"میں کسی قابل نئیں چوہدری صاحب! میں نکما، ناکارہ بے حیثیت بندہ جے، میرے عقل جنوراں (جانوروں) کو پٹھے (چارہ) ڈالنے پھل فروٹ، پھل بوٹے دی چنائی توں آگے کچھ نئیں جاندی۔ یہ بات میرے وجود اور میری عقل توں بھاری اے۔"

اس نے اپنے وجود اور روح کے زخموں پر برداشت کی مرہم پٹی کرنے کے بعد چوہدری صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے کہا۔

"مولوی صاحب کی فیملی پڑھی لکھی عقلاں والی سوچ کی مالک ہے۔ میں اونھاں دا حصہ بننے کے قابل نئیں"

"تم اور میں یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں کہ ہم یا کوئی اور کس قابل ہے، کس قابل نہیں ہے" چوہدری صاحب، جو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ دو دن میں کھاری ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ "کھاری پتر یہ جو آگ بجھ جانے پر راکھ باقی رہ جاتی ہے نا چولہے میں، کبھی کبھار اس کو کریدیں تو اس میں سے ہیرے بھی مل جاتے ہیں" وہ اس کی زرد رنگت اور سیاہ حلقے زدہ اندر کو دھنسی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"نہیں چوہدری جی! میں تے راکھ نئیں، ہیرے تو بڑی اچی (اونچی) چیز ہوتے ہیں" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"تمہیں مسئلہ کیا ہے اس ساری بات میں؟" چوہدری صاحب نرمی سے بولے "دینے والے خوشی سے دے رہے ہیں، تم نہیں تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہے۔ تم نے اپنا حلیہ کا ہے کو خراب کر لیا ہے اس بات کا بوجھ خود پر لاد کر۔"

"وہی بوجھ ہے چوہدری صاحب! جو میں نے آپ کو بتائی تھی۔" ماسی جنت جو کھاری کو ان کے پاس لے کر آئی تھی بول پڑی "اس نمانے کو یہ دکھ کھائے جا رہا ہے کہ بھائی مالک نے اس پر ازلام (الزام) لگایا ہے، بہتان باندھا ہے، یہ کہتا ہے اس دن مولوی کی بیٹی اکیلی اسکول سے آ رہی تھی۔ اسے پیاس لگی تھی، گرمی جو بڑی تھی۔ یہ باہر والے پھاٹک کے پاس کھڑا تھا، استانی جی کی بیٹی کر کے پانی پلانے اندر لے آیا، بچوں، کاکیوں کو جو شوق آ جاتا ہے اتنی بڑی عمارت دیکھ کر کہ بھلا اس کے اندر دیکھیں کیا ہے، اس کاکی نے بھی کہہ دیا کہ میں اندر سے فارم ہاؤس دیکھنا ہے۔ یہ جھلا معتبر بن کر اسے دکھانے لگ پڑا، عید کے صدقے کوئی ادھر ہے نہیں تھا اس لیے اس نے سوچا اسے کس نے دیکھنا ہے، کسی نے دیکھا بھی نہیں سوائے بھائی مالک کے اور جا کر آپ سے جڑ دیا۔ سیانے کہتے ہیں پہلے بات کو اندر تک پھرولو پھر فیصلہ کرو بات ہے کیا۔ یہ آنکھوں دیکھی جا کر آپ کو سنا دیتے ہیں۔ اس مسکین کو نکاح کا مسئلہ نہیں۔ اس ازلام (الزام) کا غم ہے، جو دو دن کے اندر مٹی ہی ہو گیا ہے" ماسی جنت نے کھاری کی وکیل صفائی ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر آ میرے پاس۔" چوہدری صاحب جنت کی بات سننے کے بعد بے اختیار کھڑے ہو کر بولے۔ کھاری نے

خوف زدہ اور شرمسار نظروں سے چوہدری صاحب کو دیکھا۔ وہ زیرلب مسکرا رہے تھے۔

"اوادھر آ۔" انہوں نے اپنے بازو پھیلائے اور اپنی بات دہرائی' کھاری جھجکتے ہوئے آگے بڑھا' چوہدری صاحب نے اپنے وا کیے بازوؤں میں اس کا وجود بھرتے ہوئے اسے سینے سے لگالیا۔

"میرا ایمان تھا کھاری! تو کسی نیک مگر مجبور ماں کی اولاد ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے تو کسی کی' کسی بے بس کی حلال اولاد ہے' تیرے اندر شریفوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ جب ہی تو تیری نظر میں لالچ ہے نا ہوس' تجھے خبر ہی نہیں کب تیرا بچپن گزرا لڑکپن آیا اور پھر تو جوانی کے دور میں داخل ہوا۔" وہ اس کو پوری طاقت سے سینے سے لگائے کہہ رہے تھے۔ "تو بڑا بھاگوں والا لڑکا ہے میرے بچے! تو کسی قسم کی فکر نہ کر' میں تیری معصومیت کی گواہی دیتا ہوں' مالک جیسے لوگ کیا جانیں بے خبری' معصومیت اور باخبری' اور ہوس کے درمیان احساس کی کتنی بڑی خلیج حائل ہے' ان لوگوں نے کبھی خلیجیں دیکھی ہوں' ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کا فاصلہ ماپا ہو تو پتا چلے نا۔"

وہ جذباتی انداز میں نجانے کیا کہے جارہے تھے۔ کھاری ان کی بات کا شاید کوئی حصہ بھی سمجھ نہیں پایا تھا مگر چوہدری صاحب کے سینے سے لگنے کے بعد دو دن سے کانٹوں پر گھسٹتا' کسی انجانی آگ میں جھلستا' الفاظ کی سنگ باری سے زخم زخم اس کا وجود جیسے یکدم پرسکون ہو گیا تھا۔ زندگی بھر اس کے دل و دماغ اور جسم کو اتنی راحت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت چوہدری صاحب کے سینے سے لگ کر محسوس ہو رہی تھی۔

وہ رو رہا تھا نہ ہنس رہا تھا' وہ صرف اس آسودگی کو محسوس کر رہا تھا جو چوہدری صاحب کی بانہوں کے حلقے میں اس کے احساس میں اتری تھی۔ اس کی تھکن' جلن' کڑھن سب یکسر غائب ہو گئی تھیں۔ اس کا وجود پھولوں کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔

"چل شاباش! بھول جا ساری فکریں' نکال دے دل سے سارے غم اور خوش ہو جا۔ میں تیرا اپنا باپ نہ سہی مگر باپ جیسا تو ہوں' اور باپ کبھی غلط نہیں سوچتے اپنے بچوں کے لیے۔" چوہدری صاحب نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"اوئے کدھر مر گئے ہو سارے۔" پھر انہوں نے اپنی مخصوص بلند آواز میں باہر کسی طرف چہرہ کرتے ہوئے آواز لگائی "اوئے اپنے دولہے راجہ محمد افتخار کے نکاح کی تیاریاں شروع کرو بھئی"۔

انہوں نے جیسے سب میں منادی کرنے کی کوشش کی کہ فارم ہاؤس میں برپا ہونے والی اگلی تقریب کی نوعیت کیا ہو گی۔

"جنت بی بی! سب چیزوں کی لسٹ بنالے' چودھرائن کے پاس پھیرا ڈال' اسے بھی بتادے۔ کھاری شہزادے کا نکاح ہو رہا ہے' کپڑا لتا' جوتی' ہار سنگھار سب تیاریاں کرلے' دن ہی کتنے ہیں درمیان میں۔"

پل کے پل میں جیسے ہر ایک کی دوڑیں لگنا شروع ہو گئی تھیں۔ ماسٹر کمال' کھانے بید کی ٹوکریوں اور مٹھائی کا حساب کتاب لگانے میں مصروف ہوا۔ گاؤں کا بڑا نائی موٹر سائیکل بھیج کر بلوایا گیا' جنت کے ذریعے خبر چوہدرانی تک پہنچی جس نے یہ خبر سنتے ہی عادتاً "دوپٹہ منہ میں دے کر دبے لفظوں سرگوشی کی۔

"مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ یہ کھاری دوڑ دوڑ کر مولوائن کے گھر کیا کرنے جاتا ہے۔"

"شی!" جنت نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے چودھرائن کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

"چودھری صاحب سے کوئی ایسی بات کرے گا تو بڑا غصہ کریں گے۔ رشتہ انہوں نے اپنی مرضی سے طے کیا ہے' کھاری غریب کو تو پتا بھی نہیں تھا۔"

"ہائے ہائے پھر چوہدری صاحب کو آفت کیا آگئی تھی دست و دستی رشتہ کرنے کی۔ کھاری غریب کی ابھی عمر ہی

کیا ہے' ابھی کل کی تو پیدائش ہے نمانا۔"

چودھرائن' چودھری صاحب کے غصے سے اچھی طرح واقف تھیں' جنت کی تنبیہہ پر فوراً" دوسری طرف ہوتے ہوئے بولیں۔

"کھاری ہمارا اپنا بچہ' ہمارے ہاتھوں پلا بڑھا' اس مولوی کے تو خاندان کا ہی کوئی اتا پتا نہیں۔ پتا نہیں کدھر سے پھرتے پھراتے ادھر آگئے' نہ ہی واسوں کا مولوی لگتا ہے شکل سے نہ کوئی آگا نہ پیچھا' بچی کی پیدائش کی پرچی تک تو ہے نہیں تھی ان کے پاس' پھر بھی مولوائن کا نخرا ساتویں آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔ تو دیکھ لینا۔ جنت! رشتہ تو وہ جو چودھری صاحب نے کردیا ہے' اب کھاری کے نکاح سے پہلے میں نے بھی محفل نہ کرائی تو میرا نام بھی صابرہ نہیں اور اس محفل میں مولوائن کو خود آکر درس دینا ہی پڑے گا۔ پہلے بھی ہم کم نہیں تھے' اب تو ہم لڑکے والے ہیں لڑکے والے۔" وہ اکڑتے ہوئے سر اٹھا کر بولی۔

"ہائے نی رضیہ! تجھے کاہے کو سانپ سونگھ گیا ہے" پھر اس نے اپنے قریب بیٹھی اپنی مصاحبہ خاص کو ڈانٹتے ہوئے کہا "چل اٹھ' بڑی کوٹھڑی کا تالا کھول' اس میں جو ٹرنک رکھے ہیں۔ انہیں دھوپ میں لا کر رکھ۔ میں کوئی کپڑا لتا دیکھوں۔ میں بھی کہوں اس بار میں لاہور جاکر بے وجہ ہی چیزیں کیوں خریدتی چلی جارہی ہوں۔ اب سمجھ میں آیا کہ کھاری کا نکاح جو ہونا تھا۔ اس کے لیے خرید رہی تھی۔" وہ مسکرا کر جنت سے بولیں۔

"نی چل نی اٹھ!" انہوں نے رضیہ کو ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر ڈانٹا۔ "تجھے کاہے کو مرگی پڑ گئی ہے' ایسے ہے جسے اب گری کہ تب گری"

رضیہ نے دوسری ڈانٹ پر اپنا بھاری ہوتا وجود بمشکل چوکی سے اٹھایا۔ اس خبر نے اس کے اندر آگ لگادی تھی۔ کھاری کم بخت جس نے اس سے کبھی اظہار الفت کیا تھا نا کوئی وعدہ وعید' یکدم ہرجائی سیاں نظر آنے لگا تھا۔ رضیہ کے من کی خواہش دل ہی میں رہ گئی اور مولوی کی بیٹی جھپٹا مار کر کھاری کو لے اڑی۔

وہ جھلکتی' کلستی' بل کھاتی بڑی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھسی اور کم از کم دو گھنٹے کھاری کے ہرجائی پن پر آنسو بہاتی رہی۔



"میں آٹھ پہر کا مسافر ہوں' مجھے ایسا لگتا ہے میں دن بھر ادھر ادھر بھٹکتا ہوں' مگر میں مسافر نہیں لگتا۔ لوگ سمجھتے ہیں میں اپنے کاموں میں مصروف ہوں' میں ایک کامیاب بزنس مین کا کامیاب بزنس مین بیٹا ہوں' ہم بزنس پلان کرتے ہیں اور پرافٹ کماتے ہیں' دنیا کی ہر سہولت کریڈٹ کارڈز کی شکل میں ہماری جیب میں ہمارے ساتھ پھرتی ہے۔ میں سوشل تقریبات میں بھی کاروباری فائدے پر نظر رکھتا ہوں' سماجی تعلقات کا بیشتر حصہ بھی کیا فائدہ اور کتنا فائدہ کی بنیاد پر کھڑا رہتا ہے۔ میری دوستیاں' میری دلچسپیاں' میرے خوشی و غم کے پیمانے' زندگی کا حظ اٹھانے کے طریقے لامحدود ہیں' لیکن وہ سب جو میرے اردگرد ہوتے ہیں' ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں جانتا کہ میں دن کے سب پہروں کا مسافر ہوں۔

میں ایک محدود سی جگہ پر بھی دربدر بھٹکتا ہوں' میری آنکھیں اپنے سامنے پھیلے مناظر اور چہروں پر سفر کرتی ہیں اور میری حسیات ہر قسم کی صورت حال میں پنجوں کے بل بیٹھی ہوئی ہیں۔ میرا جسم' میری نظریں' میری تمام حسیں اس پوری کی پوری دنیا میں صرف ایک چہرے کی متلاشی ہیں' ایک وجود کی کسی سمت سے آمد کی منتظر ہیں۔ ایک نام ایک پہچان کی کھوج میں ہیں۔ میرا جسم' میری آنکھیں اور میری تمام حسیات حالت سفر میں ہیں۔ کئی برسوں سے انہیں نہ کہیں قیام میسر ہوا نہ کوئی ایسا پڑاؤ آیا ہے جہاں بیٹھ کر چند لمحوں کو سستالیں۔ میرے کان کسی آواز کے

منتظر ہیں' کوئی ایسی آواز جو کہے۔

"لو یہ ہے نا وہ جس کی تمہیں تلاش تھی' جس کا تمہیں انتظار تھا' جس کے لیے سفر کرتے بھٹکتے پھر رہے ہو۔ لو دیکھ لو' یہ ہی ہے وہ' اپنی آنکھوں سے دیکھ لو' یہ تمہارے سامنے ہے۔"

اس نے سوچتے سوچتے پہلو بدل کر دوسری سمت دیکھا۔ فون کی اسکرین نے روشن ہو کر کمرے میں روشنی کا ایک چھوٹا سا ہالا منور کیا' وہ کچھ دیر روشنی کے اس حلقے کو دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر فون میز پر سے اٹھا لیا۔ فون کرنے والے کا نام پڑھ کر وہ ہلکا سا مسکرایا۔

اور جو اسکرین روشن نہ ہوتی تو سائلنٹ موڈ پر ہونے کی وجہ سے میں کبھی جان نہ پاتا کہ اس نے فون کیا تھا اور نتیجہ میں اس کی جو سننی پڑتیں' وہ بہت سے دن فون کو سائلنٹ پر رکھنے سے روکے رکھتیں۔ اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

"ہیلو۔ توبہ کہاں تھے' اب تو فون بس بند ہی ہونے والا تھا۔" دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔

"یہیں تھا' بس سستی چھائی ہوئی تھی' کون فون اٹھا کر سنتا۔" اس نے کہا۔

"تو پھر اب کیوں اٹینڈ کر لیا' رہنے دیتے۔" خوشگوار لہجہ اچانک ناراض ہو گیا۔

"پھر یہ سوچ کر اٹینڈ کر لیا کہ اس وقت کوئی خاص بندہ ہی کال کر سکتا ہے' باقی لوگ تو فون کرتے وقت دوسروں کے سونے' جاگنے کے وقت کا بہت خاص خیال رکھتے ہیں۔"

"چلو شکر ہے۔ تم نے مجھے خاص بندوں کی لسٹ میں تو شمار کیا۔" وہ خوش ہوتے ہوئے اس کی بات کے دوسرے حصے پر غور کرنا بھول گئی تھی۔

"ہاں تو سناؤ' کیسے مزاج ہیں اسپیشل لیڈی!" وہ مذاق سے بولا۔

"میں لیڈی نہیں ہوں' سنا تم نے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"تم جینٹس میں بھی شمار نہیں ہو سکتیں' سنا تم نے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"میں لیڈی کہلانے کی عمر سے بہت چھوٹی ہوں ابھی۔"

"اچھا پھر باقی خواتین کے لیے تو لیڈیز فرسٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے' تمہارے لیے کیا استعمال ہو گا۔ گرلز فرسٹ" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "نہیں بھئی اس کے لیے تو نئی ڈکشنری ایجاد کرنی پڑے گی۔"

"اچھا چلو خیر چھوڑو۔" دوسری طرف سے محاذ بند کر دیا گیا۔ "ایک مزے کی خبر سنو"

"ہاں پلیز سناؤ۔"

"تمہیں پتا ہے' کھاری کی شادی ہو رہی ہے۔"

"ہائیں' کس کی شادی ہو رہی ہے؟"

"کھاری کی' افتخار احمد عرف کھاری کی"

"وہی لڑکا جو اس روز تمہارے گھر ملا تھا' جو گاؤں سے آیا تھا اور جس کی بندر والے کے جوڑے کے بارے میں کچھ ریزرویشنز تھیں؟"

"ہاں ہاں وہی۔"

"لیکن یار! وہ تو اس روز بالکل نارمل لگ رہا تھا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا' جو لوگ شادی کرنے جا رہے ہوتے ہیں' وہ ایب نارمل ہوتے ہیں؟"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ وہ تو بہت کم عمر سا لڑکا نہیں۔"

"وہ تو پتا نہیں کم عمر ہے کہ نہیں' تم ایک اور بات سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے کہ جس لڑکی سے کھاری کی شادی

ہو رہی ہے۔

She is just a Student
of ninth class

(وہ صرف نویں جماعت کی طالبہ ہے۔)

"مجھے یقین نہیں آ رہا' کیا تمہارے چچا کے ہاں پرانا جاگیرداری نظام رائج ہے' جہاں کم عمر بچے' بچیوں کی شادیاں کر دی جاتی تھیں۔"

"ہرگز نہیں' دراصل یہ بات کچھ اور ہے۔ لڑکی گاؤں کے مولوی صاحب کی بیٹی ہے۔ اور کھاری مولوی صاحب کی بیگم سے قرآن پاک پڑھنے جاتا تھا۔"

"اوہ!" اس نے اوہ کو طول دیتے ہوئے کہا "گویا کچھ اور چکر ہے۔"

"ارے توبہ وہ نہیں' ایک تو تم لوگوں کی سوئی ایک ہی نقطے پر اٹک جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے' کھاری کا مولوی کے گھر آنا جانا تھا۔ مولوی صاحب کی بیٹی کسی اسکول میں زیر تعلیم ہے اور میٹرک کا امتحان دے رہی ہے۔ اچانک ہی مولوی صاحب کو نجانے کیا خیال آیا کہ سردار چچا سے درخواست کرنے لگے کہ ان کی بیٹی کی کسی مناسب جگہ شادی کروا دیں۔ چچا ٹھہرے ہمدرد اور محبت کرنے والے آدمی' کھٹ سے کھاری کا رشتہ پیش کر دیا۔ اس کے پیچھے ان کی کیا لاجک ہے' یہ تو وہی جانتے ہوں گے' بہرحال یوں ہوا کہ کھٹ رشتہ پٹ نکاح ہو رہا ہے۔ تائی صابرہ نے مجھے کال کر کے ساری کتھا سنائی ہے اور دعوت دی ہے کہ کم از کم میں یہ تاریخی شادی ضرور اٹینڈ کروں۔ میں نے پوچھا اگر میں اپنے ساتھ اپنے کچھ اور مہمان بھی لانا چاہوں تو کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا۔ کہنے لگیں مسئلہ کیوں ہو گا۔ تم کچھ چھوڑ سینکڑوں مہمان لے آؤ' لہٰذا میں نے تمہارا ابھی بتا دیا ہے سردار چاچا کو' کھاری کا نکاح بھی اٹینڈ کر لو گے اور گاؤں اور سردار چاچا کا فارم ہاؤس بھی دیکھ لو گے' ہمارے گھر میں تو کوئی انٹرسٹڈ نہیں ہے جانے میں۔ سب بور نگ ہیں۔ خدیجہ' فاطمہ خالہ کو بھی کہا ہے میں نے' دیکھو ان کا کیا موڈ بنتا ہے' کھاری ان سے بھی ملا تھا نا ابھی جب آیا تھا۔ خیر باقیوں کی چھوڑو' تم بتاؤ چل رہے ہو نا؟" وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔

"کہاں گم ہو گئے ہو۔ بتاؤ نا۔"

"پوچھا کیا تم نے؟"

"یہ پوچھا ہے کہ چل رہے ہو کھاری کے نکاح پر کہ نہیں' اتنی سادہ سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اف بھئی کبھی کبھی تم نان اسٹاپ بولتی ہو' نہ کوئی کوما' نہ فل اسٹاپ" اس نے طویل سانس لینے کے بعد کہا۔

"میری سمجھ میں تو آنے دو معاملہ کیا ہے۔"

"تم کبھی کبھی بری طرح شرمندہ کر دیتے ہو۔" وہ جھینپ کر بولی۔

"یہ تو میں نے تمہیں بہت پہلے بتا دیا تھا کہ میں ایسا ہی ہوں' پھر بھی میں معذرت خواہ ہوں۔" اسے احساس ہوا کہ واقعی اس کا دل دکھ گیا ہے۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ نیچی آواز میں بولی "تو پھر بتاؤ نا' چلو گے نا کھاری کے نکاح پر۔" اگلے لمحے اس کے لہجے کا جوش واپس آ گیا۔

"میں کیا کروں گا وہاں جا کر' میں عبداللہ تو ہوں نہیں' جو بیگانی شادی میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔"

"اچھا!" اس کے لہجے میں مایوسی در آئی۔ "میں نے تو سردار چچا سے بات بھی کر لی تھی' چلو اب منع کر دوں گی۔ ہمارا انتظار نہ کریں۔"

"ہمارا۔" وہ فوراً بولا "تم تو جاؤ نا' تم اتنی ایکسائیٹڈ ہو رہی ہو۔"

"نہیں۔ میں نے بھی کیا کرنا جا کر' ویسے بھی فائنل سمسٹر سر پر ہے۔"

"اوہ!" وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ "اچھا یہ بتاؤ ہے کب یہ شادی؟"

"سات آٹھ دن کے بعد۔"

"چلو پھر پلان کرتے ہیں جانے کا' میں سمجھا کل پرسوں ہی ہو رہی ہے' اتنی جلدی جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا نا!"

"ہیں واقعی!" اس کے لہجے میں بشاشت دوبارہ جھلکنے لگی "واقعی تم پلان کرو گے وہاں جانے کے لیے۔"

"ہاں ضرور۔ ہو گا تو دلچسپ ایونٹ۔"

"ہائے! مجھے یقین نہیں آ رہا۔" اس کا لہجہ خوشی سے لرزنے لگا "میں نے فارم ہاؤس میں اور گاؤں میں بہت سی ایسی باتیں نوٹ کی تھیں جو کسی کے ساتھ ڈسکس کرنے کو دل چاہتا تھا مگر میرے ارد گرد کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو ان پوائنٹس کو سمجھے' جن سے' وہ شیئر کیے جا سکیں' اگر تم وہاں چلو گے تو یقیناً" تم سے ڈسکس کیے جا سکیں گے۔"

"کیوں نہیں' ہم ضرور ہر پوائنٹ ڈسکس کریں گے۔"

"لیکن تم آج کل مصروف کہاں ہو؟ تم تو کہتے تھے کہ تم نے اپنے ڈیڈی سے سیزنل آف لیا ہوا ہے۔"

"میں یہاں ہی ہوں تمہارے شہر میں' کل رات ایک میوزیکل کنسرٹ تھا' میں نے ایک گروپ کے لیے گٹار بجایا۔"

"ارے تمہیں گٹار بجانا بھی آتا ہے؟"

"جب میں اسٹوڈنٹ تھا اس وقت سیکھا تھا' اس کے بعد وقت ہی نہیں ملا پریکٹس کرنے کا۔ پچھلے دو دن سے اس کی پریکٹس کر رہا تھا' اور رات کچھ لوگوں کے سامنے بجانے کا مظاہرہ کیا مگر میری یہ کوشش فارغ ہی تھی' مزا نہیں آیا۔"

"تم مجھے بھی بتاتے۔ میں بھی آتی وہاں تمہاری پرفارمنس دیکھنے۔"

"ہاں۔ مجھے یہ خیال آیا تھا لیکن پھر میں نے تمہیں اس کا نہیں بتایا' اس لیے کہ میں ٹیسٹ کرنا چاہتا تھا' پہلے جو تم ہر اس جگہ آن موجود ہوتی تھیں جہاں میں کوئی سوانگ بھرے کسی کام میں مصروف ہوتا تھا' وہ اتفاقات محض مجھے اور تمہیں ایک دوسرے سے ملانے کے لیے تھے یا دل سے دل کو راہ ہونے والا معاملہ ہے' میرا یہ ٹیسٹ ٹوٹلی فیل ہو گیا۔" وہ ہنسا۔

"تمہارا مطلب ہے۔ دل سے دل کو راہ ہونے والا معاملہ نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔۔۔" وہ مسکرایا "وہ اتفاقات محض ہمیں ایک دوسرے سے ملانے کے لیے تھے۔"

"ان اتفاقات کی پھر ضرورت ہی کیا تھی۔" اس کا دل بجھ سا گیا۔

"ان کی ضرورت اس لیے تھی کہ شاید میری لگن سچی ہے' شاید اللہ مجھے کوئی درست راستہ دکھانا چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہوں! اس نے ہوں کو کھینچتے ہوئے کہا "مطلب تو خیر ابھی مجھے خود نہیں پتا جب پتا چلے گا' تمہیں ضرور بتاؤں گا۔"

"اچھا! تو پھر بھاری کی شادی پر جانا ڈن ہے نا۔" اس نے خواہ مخواہ الجھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے واپس اسی موضوع پر جاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ڈن ہے۔"

"ہائے! میں ابھی سے ایکسائیٹڈ ہو رہی ہوں' کتنا مزا آئے گا۔"

"سوچ لو' اچھی طرح جانچ لو' معاملہ کیا ہے' یہ نہ ہو کہ کم عمر لڑکے لڑکی کا نکاح کرانے کی اطلاع پر پولیس وہاں چھاپہ مار رہی ہو اور نکاح اٹینڈ کرنے کے چکر میں سب باراتی بھی گرفتار ہو جائیں۔" اس نے شرارتاً" کہا۔

"میرے سردار چچا بہت سمجھ دار بندے ہیں۔ وہ کوئی فضول اور بچکانہ فیصلے نہیں کرتے جناب۔" اس نے جتایا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا۔ اب ماما آ رہی ہیں' میں فون بند کر رہی ہوں' وہ ساری رات میرے کمرے کی لائٹ آن رہنے پر سخت ناراض رہتی ہیں مجھ سے۔"

"فوراً" لائٹ آف کرو' اور سو جاؤ اب۔"

"ہاں یہ ہی کرنے لگی ہوں۔"

"او کے دین' ٹیک کیئر۔"

"ٹیک کیئر۔۔ ہاں ایک بات اور۔۔۔"

"بولو۔"

"تم نے صرف میری خوشی کے لیے کھاری کے نکاح پر جانے کی ہامی بھری ہے نا' تھینک یو سعد۔"

"تمہارا مایوس ہوتا لہجہ مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا' تم ہنستی مسکراتی مجھے بہت اچھی لگتی ہو ماہ نور! ہنستی رہا کرو' خوش رہا کرو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"تھینک یو اگین" اس نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"ٹیک کیئر' اللہ حافظ!" اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا' اور فون بند کر کے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے' جب بھی میں بری طرح ڈپریسڈ ہوتا ہوں' کسی نہ کسی طرح تمہاری آمد ہو جاتی ہے' اور میرا ڈپریشن ختم ہو جاتا ہے۔ ابھی اگر تمہاری کال نہ آتی تو میں آٹھ پہروں کے مسافر کی مسافرت پر غور کرتا کرتا نجانے کہاں تک پہنچ جاتا۔ تم نے مجھے ایک بار پھر ڈپریشن میں جانے سے بچا لیا۔۔۔ تمہارا کردار میری زندگی میں آپ ہی آپ اہم ہوتا جا رہا ہے ماہ نور! میں اس صورت حال پر خوش بھی ہوں مگر اس اختر سرکار کی باتیں میرے ذہن سے محو نہیں ہو پاتیں' اسی لیے تمہارے بارے میں سوچ کر ڈر بھی جاتا ہوں' خیر تمہارے لیے نجانے کیوں میرے دل سے دعا نکلتی ہے' تم اتنی معصوم ہو اور نیک نیت ہو کہ میرا دل تمہارے لیے دعا گو رہتا ہے' تم ہمیشہ یونہی مسکراتی رہو' خوش رہو۔"

وہ اس کے بارے میں سوچتا سوچتا نجانے کس وقت سو گیا تھا۔



اس پر اس مختصر سے مکان کو گھر بنانے کی دھن سوار تھی۔ ایک ۔۔۔ باون صفحوں کے میگزین نے اس کی زندگی کے کئی رخ بدل کر رکھ دیے تھے' زندگی کتنی اہم ہے' اسے گزارنے کا کوئی خاص ڈھنگ' ایک خاص سلیقہ ہونا چاہیے۔ مکان' مکینوں کو سر پر چھت کا احساس دلاتے ہیں لیکن گھر کا درجہ مکان سے بہت اونچا ہے' گھر مکینوں کو ایک دوسرے سے جڑے ہونے کا احساس دیتے ہیں' گھروں کے مکینوں کے دکھ سکھ' ہنسی' خوشی' غم' آنسو سانجھے ہوتے ہیں' گھروں میں صرف رہا نہیں جاتا' گھروں میں زندگی گزاری جاتی ہے اور زندگی گزارنے کے لوازم بہتیرے ہیں۔ اب یہ تو انسان کی استطاعت پر منحصر ہے کہ کتنے لوازم وہ اپنے لیے مہیا کر سکتا ہے۔

وہ بھی مکان کو گھر میں تبدیل کرنے کے لوازم جمع کرنے کے چکروں میں مصروف تھی۔ گندم کے دانے، چاول اور مکئی جن بوریوں یا تھیلیوں میں ان کے مکان میں آتے تھے، اپنے اختتام تک ان ہی میں پڑے رہتے تھے۔ اس نے اردگرد کے گھروں میں جھانک کر دیکھا، لوگ اناج رکھنے کے لیے بھڑولے بنواتے تھے، بھڑولے اس کی استطاعت سے بہت آگے کی چیز تھے، سو اس نے اباجی کے شاگردوں کے ذریعے کباڑ سے گھی کے پرانے کنستر منگوا کر انہیں دھو مانجھ کر یہ اناج ان میں منتقل کر دیا، مسالے کی تھیلیاں جو مختصر سے باورچی خانے کی دیواروں میں ٹھکی کیلوں پر لٹکی رہتی تھیں، سستے پلاسٹک کے رنگ برنگ ڈبوں میں بھر کر ایک نیچی تپائی پر سجا دیے، لہسن، پیاز اور سبزی رکھنے کی ٹوکریاں بھی اس نے پھیری والے سے اپنے نویں جماعت کے استعمال شدہ رجسٹر اور کاپیاں دے کر خریدی تھیں۔

"دیکھ لینا۔ میں اسی طرح اس مکان کی حالت بدل کر رہوں گی۔"

وہ دل ہی دل میں عہد کرتی پھرتی تھی۔ یہ بات اماں کے سامنے کہنے کا حوصلہ ابھی اس میں نہیں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا جواب میں وہ دنیا کے سامان کی فکر کرنے پر نجانے کیا کیا باتیں سنائیں لہٰذا وہ اپنے خاموش منصوبوں پر خاموشی سے عمل کرنے کے پروگرام ترتیب دیتی رہتی۔ اماں اسے دسویں کے لیے اسکول نہ بھیجنے کا اعلان کر چکی تھیں، وہ اماں کے اس اعلان پر "مصلحتاً" خاموش تھی۔ اسے یقین تھا کہ نویں کا امتحان جس اچھے طریقے سے وہ دے چکی تھی۔ اس کا رزلٹ اسکول سے اسے وظیفہ بھی دلوانے والا تھا اور اپنے لیے ایک دلیل بھی کہ کیوں اس کا دسویں ریگولر طالبہ کی حیثیت سے کرنا ضروری تھا۔

اس کا ذہن ان دنوں اتنے منصوبے بنانے میں مصروف تھا کہ اسے اماں، ابا کے درمیان ہونے والی کھسر پھسر کے غیر معمولی پن کا احساس ہی نہیں ہوا، اور شاید مزید کچھ دن یہ احساس نہ ہوتا اگر اس شام جب وہ چھت سے دھلے کپڑے اتار کر سیڑھیاں اترتے ہوئے کھاری کو اماں کے پاس بیٹھے نہ دیکھ لیتی۔ کھاری کا اماں کے پاس سیپارے کا سبق لینے آنا بھی معمول کی بات تھی۔ اگر وہ کھاری کو روتے ہوئے اماں کے سامنے ہاتھ جوڑتے نہ دیکھ لیتی۔ اس منظر پر وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔

"اس بے چارے نے ایسا کیا کیا ہے۔ جو معافیاں مانگ رہا ہے۔"

اس نے آواز پیدا کیے بغیر سیڑھیاں اترنے کا فیصلہ کیا اور یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو چل رہی تھی۔ عین ان سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی جن کے نیچے بچھی چارپائی پر وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"بھین جی! یہ میرے جڑے ہتھ دیکھ لو، میں سچ کہہ رہا ہوں، میں اس قابل نہیں ہوں۔" کھاری کے الفاظ نے اس کو تجسس میں ڈال دیا۔

وہ کس قابل نہیں تھا جو یوں منتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک سیڑھی مزید نیچے آ گئی۔

"تمہیں کیا پتا کھاری! تم کس قابل ہو، کس قابل نہیں ہو، یہ فیصلہ تم نے نہیں اللہ نے کرنا ہے۔"

"مینوں آپ نوں پتا ہے۔ (مجھے خود کو پتا ہے۔)" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں ان پڑھ، جاہل، نہ میرا کوئی آگا نہ پیچھا، گھاس بوٹ نکالنے والا، جانوراں کو پٹھے ڈالنے والا، جانوراں کے ساتھ جانوراں والی زندگی گزارنے والا، تسی لوگ اس دے نال کیسا ظلم کرنا چاہتے ہو۔" (آپ لوگ اس کے ساتھ کیسا ظلم کرنا چاہتے ہو۔)

"ہائیں! یہ کس کے ساتھ ظلم ہونے کی بات کر رہا ہے؟" سعدیہ ایک سیڑھی مزید نیچے کھسکی۔

"کھاری! تمہیں میری بات کا بھروسا ہے کہ نہیں، تمہیں چوہدری صاحب کی بات پر اعتبار ہے کہ نہیں۔" ماں کا لہجہ سخت ہوا۔

"چوہدری صاحب کی چھوڑیں وہ کچھ ہور سمجھ رہے ہیں، میں نے اپنی صفائی دی۔۔۔ تو ہے، مگر کوئی پتا نہیں ہوئی ہے کہ نہیں۔"

"تم نے مجھے بھی وہ بات سنائی۔" اماں نے کہا۔ "پریشان تو مجھے ہونا چاہیے تھا، غصہ تو مجھے آنا چاہیے تھا۔ سعدیہ کی اس حرکت پر مجھے اسے جوتے مارنے چاہیے تھے۔ لیکن دیکھ لو، مجھے غصہ نہیں آیا، نہ میں ناراض ہوں۔"

اماں کہہ رہی تھیں اور سعدیہ کے اس وقت سمجھ میں آ رہا تھا کہ کان کھڑے ہونے کا محاورہ جو اس نے اردو کی کتاب میں پڑھا، اس کا مطلب اس نے کیا سمجھا تھا اور شاید بورڈ کے امتحان میں وہ اس محاورے پر جملہ غلط لکھ آئی تھی۔

"کیونکہ مجھے پتا ہے، میرا یقین ہے کہ تم دونوں اس معاملے میں معصوم ہو، تمہیں اپنی بچکانہ خوشی میں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی دوسرا تم دونوں کو وہاں اکیلے دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا۔"

سعدیہ ایک سیڑھی مزید نیچے کھسکی۔

"اور بھین جی! تسی سعدیہ سے بھی پوچھا ہے کہ نہیں؟" اب کھاری کی بھیگی آواز اس کے کانوں سے زیادہ واضح ہو کر ٹکرا رہی تھی۔

"پوچھ لیں گے سعدیہ سے بھی۔" اماں کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "وہ لڑکی ہے، اتنا تو اسے پتا ہی ہے کہ آج نہیں تو کل اس کے ہاتھ ہمیں پیلے کرنے ہی ہیں۔ پڑھا ہم اسے سکتے نہیں تو گھر میں یوں ہی بٹھا چھوڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اگر چوہدری صاحب اسے عزت آبرو کے ساتھ تمہارے ہمراہ رخصت کرا کر لے جائیں گے تو ہمارے لیے اور خود اس کے نصیب کے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"ڈھن، ڈھنا، ڈھن، ڈھن۔"

"منجنیق کے گولوں کے بارے میں تاریخ کی کتاب پڑھتے ہوئے جماعت کی ایک لڑکی نے منہ سے گولوں کے برسنے کی جو آواز نکال کر سنائی تھی اور جس پر باقی لڑکیاں کتنی ہی دیر ہنستی رہی تھیں۔ وہی آواز سعدیہ کو اپنے آس پاس کہیں اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے بعد کھاری اور اماں کے درمیان تقریباً" پون گھنٹہ بحث چلتی رہی تھی۔ سعدیہ نے اس بحث کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔

کھاری اپنی کم حیثیتی اور سعدیہ کی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے آنسو بہا رہا تھا۔ اماں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے باور کرا رہی تھیں کہ ان کا فیصلہ اٹل تھا اور ان کے نزدیک ذات، برادری، پیشے، قبیلے اور معاشرتی حیثیت کی نہیں، نیک نیت انسان کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔

کھاری کے خیال میں وہ کوئی بھی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ اسے گناہ گار نہ کیا جائے۔ سعدیہ نے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا، اس ساری گفتگو کا مرکزی موضوع خود اس کی اپنی ذات تھی اور اس کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ اس کے لیے کیا فیصلے کیے جا رہے تھے۔ اس ساری گفتگو کو سن کر اسے سمجھنے اور ہضم کرنے میں اسے کچھ وقت لگا اور اپنے ردعمل کا تعین کرنے میں تھوڑا وقت مزید ضائع ہوا۔ لیکن جب وہ دل و دماغ میں چھڑی جنگ پر قابو پا تی آہستہ قدموں سے باقی کی چار سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو اس کے چہرے پر سکون تھا، وہ اس طرح نارمل تھی جیسے اس نے کوئی غیر معمولی بات سنی ہی نہ ہو۔

"مجھے یہاں سے لے چلو کھاری!" اس نے بچوں کی طرح روتے بلکتے کھاری کے عین سامنے جا کر کھڑے ہو کر کہا۔

کھاری اور آپا رابعہ دونوں ہی اس غیر معمولی لہجے اور پر اعتماد انداز پر اپنی بحث اور رونا دھونا بھول کر منہ کھولے

اسے دیکھ رہے تھے۔

"تمہارے پاس ٹھکانا ہے، تمہارا آگا پیچھا کوئی نہیں، تو سب کو اور تمہیں اس کا پتا تو ہے نا۔" اس نے کہا۔

"یہاں تو جھوٹ کا راج ہے، جھوٹے بھرم اور جھوٹی کہانیاں!" اس نے آپا رابعہ پر ایک نظر ڈالی۔ "یہاں تو کوئی اپنے متعلق ذرا سا بھی پر یقین نہیں، یہاں تو سوال کوئی اور کیا جاتا ہے، جواب کچھ اور ہی ملتا ہے۔ مجھے اس منافقت بھرے مکان سے وہاں لے چلو، جہاں تم رہتے ہو۔"

اس کے لہجے میں اپنے ماں، باپ کے لیے نفرت تھی یا حقارت۔ آپا رابعہ سوچتی رہ گئیں۔

"میں!" کھاری کے کھلے منہ سے بمشکل ایک لفظ نکلا۔ "پر سعدیہ باؤ" اس نے اوھر اُدھر ہاتھ مار کر اپنی چادر پکڑنے کی کوشش کی جو اس کی گریہ زاری کے دوران چارپائی پر کہیں گر گئی تھی۔ "تساں سمجھ نئیں آپ کیا کہہ رہے ہو۔"

"مجھے نہیں پتا، میں کیا کہہ رہی ہوں کھاری! مگر اللہ کا واسطہ، مجھے یہاں سے لے چلو۔" سعدیہ نے ایک دم گھٹنوں کے بل کھاری کے سامنے بیٹھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "جہاں تم رہتے ہو، ہم وہاں ایک چھوٹا سا ٹھکانا بنا لیں گے، جو مکان نہیں ہوگا، گھر ہوگا۔"

"پر سعدیہ باؤ! آپ پڑھے لکھے بندے ہو، ڈاکٹر بننا اے تساں، میں تے صاف ان پڑھ، نہ عقل، نہ تمیز، میں ایسی قابل ہی نئیں تے سر کس طرح اٹھا سکتا ہوں۔"

"تمہیں نہیں پتا کھاری! تم کتنے قسمت والے ہو، اپنی مرضی کی زندگی گزارتے ہو، تمہارے سر پر ایک عزت والے بندے کا ہاتھ ہے، جو تمہیں پیار کرتا ہے، اپنا کہتا ہے، باپ نہیں، پر باپ بن کر دکھاتا ہے۔ یہاں تو نام کا باپ ہے، پر پتا ہی نہیں لگتا، ہے کہ نہیں ہے۔" وہ حقارت بھرے انداز میں بولی۔

"تمہاری ماں نہیں تو اب تک تم برداشت کر چکے ہو، مان چکے ہو کہ تمہاری ماں نہیں ہے، یہاں تو ماں ہے، مگر وہ ماں کے نام پر صرف جبر ہے، حاکم ہے، جس کی حاکمیت میں چھوٹے بندے کی تو مجال ہی نہیں چوں بھی کر جائے۔" وہ ایک بار پھر آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اوپر سے دنیا ایسے ماں، باپ کو اللہ والے لوگ مانتی ہے، جو سارے لوگوں کو یہ جتاتے رہتے ہیں کہ زندگی یوں نہیں یوں گزارنی چاہیے۔ اللہ کا واسطہ ہے کھاری! جو یہ موقع بنا ہے مجھے یہاں سے نکالنے کا تو ضائع نہ کرو، مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔" ایک بار پھر اس کے ہاتھ کھاری کے سامنے جڑ گئے۔

"نئیں سعدیہ باؤ، ابھی تساں ڈاکٹر بننا ہے۔ اونچا بندہ بننا ہے، ان کاموں میں پڑ کر بندہ کچ نئیں کر سکتا۔" کھاری نے چادر کو اپنے ارد گرد لپیٹ کر گویا اس چادر کی پناہ میں جاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے تو تمہارا کیا خیال ہے، یہ دونوں مجھے ڈاکٹر بنائیں گے؟" سعدیہ نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یہ جس آئی پر آئے ہوئے ہیں نا۔" اس نے مزید ایک گستاخانہ نظر آپا رابعہ پر ڈالی۔ "یہ مجھے کسی سے بھی، جو ان کے ہاتھ لگا، چاہے وہ کوئی لولا، لنگڑا، اندھا، فقیر ہی کیوں نہ ہو، بیاہ دیں گے۔ پھر میں ساری عمر بھی ٹکریں مارتی رہوں گی، جس طرح اب مار رہی ہوں تو مجھے باہر نکلنے کا راستہ کہیں نہیں ملے گا۔"

اس کی آنکھوں میں کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے منت، سماجت اور لجاجت اتر آئی۔ کھاری ان نظروں سے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اسے کیا جواب دے۔

میں تو دل سے چاہتا تھا سعدیہ باؤ، تسی ڈاکٹر بنو، یہ آپ کے ماں باپ ہیں، آپ کو پتا نہیں کاہے دا غصہ ہے، ماں پیو سے دل برا نئیں کرتے، کوئی وقتی ناراضی، رنجش، جھگڑا ہو گیا ہے تو غصہ تھوک دو، بھین جی نے خود تساں کو ڈاکٹر بنانا چاہیے نیں۔" اس نے ایک بودا سا جواب دینے کی کوشش کی۔

"تم چاہتے ہو نا، میں ڈاکٹر بن جاؤں۔" سعدیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آہو جی! میں تو دل سے چاہتا ہوں۔" کھاری نے بوکھلائے ہوئے انداز میں سر ہلایا۔

"تو پھر تم ہی ہو جو مجھے ڈاکٹر بنا سکتے ہو۔" سعدیہ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"میں...!" کھاری کے لیے دنیا میں اس سے زیادہ ناقابل یقین بات کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

"ہاں... تم... کھاری! تم مجھ سے شادی کر لو، خدا کے واسطے تم مجھ سے شادی کر لو۔" وہ اس کی بات کا مکمل جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر منتوں، ترلوں پر اتر آئی۔ کھاری نے ایک بار پھر گھبرا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھا، جو یہ ساری گفتگو بت بنی سن رہی تھیں۔

"تم نے دیکھا، میں جو کہہ رہی تھی، وہ غلط تھا یا درست۔" کھاری کو اپنی طرف دیکھتے پا کر انہوں نے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا پتا کہ تم کس قابل ہو، کس قابل نہیں ہو، یہ راز صرف اللہ ہی جانتا ہے۔" کھاری نے ان کی بات سن کر لاشعوری طور پر سر ہلایا۔

"سن رہے ہو نا اس کی باتیں۔" آپا رابعہ نے دکھ اور ناراضی کے ساتھ سعدیہ کو دیکھا۔

"دیکھ رہے ہو نا اس کے تیور۔" اب کے ان کا چہرہ کھاری کی طرف تھا، جو اس ساری صورت حال پر اس طرح سٹ پٹایا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔

"اب اس رویے اور ان تیوروں کے ساتھ اسے اور کہاں دھکا دوں۔" آپا رابعہ نے ہاتھ ملتے ہوئے بین کرنے کے سے انداز میں کہا۔ "اور کون ہے جو ہمارے عذاب سمیٹے گا، کون ہے جو اس لڑکی کو خوش ہو کر اپنی زندگی میں جی آیاں نوں (خوش آمدید) کہے گا، یہ تو تم ہو کھاری بھاگ لگیں تمہیں اور چوہدری صاحب ہیں، اونچا رہے ان کا شملہ سدا، جو ہم سفید پوشوں کی سفید پوشی کے اندر نظر آتے، جھول اور سوراخ دیکھ کر بھی چشم پوشی کر سکتے ہو اور مجھے بتاؤ۔ کس در پر جاؤں اسے لے کر۔" اب وہ دائیں بائیں ملتے ہوئے رونے لگی تھیں۔

"بھین جی!" کھاری نے بے اختیار ان کے کندھے پر رکھنے کو ہاتھ بڑھایا اور پھر نہ جانے کس خیال کے تحت اپنا ہاتھ واپس کھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔

"ٹھیک تیری منتیں کر رہی ہے یہ کھاری بیٹا۔ لے جا اسے، یہاں سے نکال کر لے جا، منافق باپ اور مشکوک ماں کے چنگل سے آزاد کرا لے اس کو۔"

انہوں نے بھی جذباتی انداز میں کھاری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ کھاری نے کانپتی نظروں سے روتی بلکتی آپا رابعہ کو دیکھا اور پھر ان ہی کپکپاتی نظروں کو اٹھا کر سامنے کھڑی سعدیہ تک لے گیا، وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مرنے جینے کے درمیانی عرصے کی سی کیفیت تھی۔ کھاری نے ایک بار اپنی آنکھوں کو زور سے بند کیا، جن کے سامنے منظر بار بار دھندلے ہوئے تھے۔ بند کر کے آنکھیں دوبارہ کھول کر اسے کچھ صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس نے باری باری رابعہ آپا اور سعدیہ کی طرف دیکھا اور سر جھکا دیا۔

☼ ☼ ☼

"جاؤ... میں تم سے بات نہیں کر رہی۔"

پستئی رنگ کی شرٹ اور بلیک ٹائٹس میں اپنے کندھوں تک آتے کالے سیاہ بال کھولے وہ صوفے پر بیٹھی اس سے مخاطب تھی۔ سعد کو یہ منظر خوش گوار اور دلچسپ لگا، اس نے اس کے سیاہ جوتوں پر نظر ڈالی اور اس کے پیچھے

کھڑکی پر تنے فان کلر کے بھاری پردے کو دیکھا۔ نادیہ اور نادیہ سے متعلق ہر چیز آسودگی کا تاثر دے رہی تھی۔ اس نے نوٹ کیا۔ نادیہ کے چہرے کا تناؤ اب نظر نہیں آرہا تھا۔ غالباً" اس نے کسی ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک یا گلوس بھی لگا رکھا تھا۔

"ہاں۔ تمہارے لہجے میں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کھنک ہونی چاہیے۔ مجھے کافی دنوں سے یہ منظر دیکھنے کی چاہ تھی۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"جاؤ باتیں مت بناؤ، تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے کتنے دنوں کے بعد مجھے کال کیا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"میں پچھلے دنوں اتنا مصروف رہا کہ اسکائپ پر آنے کا موقع ہی نہیں ملا، عام کال تو اب تم ریسیو ہی نہیں کرتی ہو۔" اس نے شرارتاً" کہا۔

"ہاں میں ہیلسنکی کی میئر جو ہو گئی ہوں۔" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"کوئی ناممکن بات نہیں، تم فینش پرچم اٹھا کر کھڑی ہو جاؤ، شاید کوئی دن آئے جو اتنے لوگ تمہارے ساتھ کھڑے ہو چکے ہوں کہ تم وہاں پر کسی چھوٹے موٹے عہدے پر تو فائز ہو سکو۔"

"ہے مائنڈ یو مسٹر سعد! میں یہاں اسٹوڈنٹ ویزا پر موجود ہوں، میرے پاس اس ملک کی قومیت ہے نہ پاسپورٹ۔"

"پچھلے کچھ سالوں میں جتنی قومیتیں اور پاسپورٹ تمہارے بدلے ہیں شاید ہی کسی کے بدلے ہوں۔"

"ہاں!" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تو میں کسی بھی چیز کے بارے میں پر یقین نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ ذرا سا بدل گیا تھا۔

"کیا مطلب، پر یقین نہیں ہو؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"سعد! تم ہی بتاؤ۔ میرا وطن کون سا ہے۔ میری زبان، میری قومیت کیا ہے، میں کون ہوں، میں مسلم ہوں، عیسائی ہوں یا یہودی ہوں۔ میری پہچان کیا ہے، کچھ تمہیں پتا ہے کیا؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

سعد کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا، اس کو اس سوال کا جواب سوچنے کے لیے تھوڑا وقت درکار تھا، وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

"نہیں پتا نا۔" وہ طنزاً" مسکرائی۔ "مجھے بھی نہیں پتا۔ مجھے واقعی نہیں پتا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ سعد نے کچھ دیر اس کے وحشت بھرے انداز کو دیکھا اور پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"تم وہی ہو نادیہ، جو تم چاہتی ہو کہ تمہیں ہونا چاہیے۔" اس نے نرمی سے کہا۔ جواب میں نادیہ نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "بعض اوقات ہمیں پوری آزادی مل جاتی ہے، اپنی راہیں متعین کرنے کی، اپنے بارے میں کھل کر فیصلہ کرنے کی، ہمیں کیا ہونا چاہیے، کیسا ہونا چاہیے، ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہمیں کیا نہیں کرنا چاہیے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں اور مانتا بھی ہوں کہ یہ سچویشن بہت کنفیوزنگ ہوتی ہے، جس میں آزادی تو پوری مل جائے مگر گائیڈ لائن کوئی نہ ملے، آپ ہی آپ چلتے جاؤ، آپ ہی آپ راہیں متعین ہوتی جائیں، لیکن جس کو احساس ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی کوئی تو شناخت قائم کرنی چاہیے، وہ بہت لکی ہوتا ہے۔ ایک تو وہ خود کے لیے خود فیصلہ کر سکتا ہے، کوئی سوشل مورلیٹی اینڈ ویلیوز، کوئی خاندانی سسٹم اور کوئی مذہبی حدود و قیود اس پر پریشر نہیں ڈال رہی ہوتیں۔ کسی آزاد پنچھی کی طرح اپنی پرواز کے روٹس خود متعین کرنا بڑی عیاشی ہوتی ہے جناب اور دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ غلط سوچ، غلط قدم، غلط انتخاب، اگر ثابت ہو جائے تو خود اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہرانے کے سوا

کوئی اور چارہ نہیں ہوتا لہٰذا نادیہ بلال! تم بھی وہی ہو جو تم چاہتی ہو کہ تمہیں ہونا چاہیے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ اٹھ کر ذرا فاصلے پر رکھے روم فریج کی طرف گئی اور اس میں سے رس بھری کے جوس کا ٹن نکال کر صوفے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ "لیکن میں تو اپنے بارے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی کہ مجھے کیا ہونا چاہیے جبکہ۔" اس نے منہ بناتے ہوئے ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ "شیکھر کے سامنے میں دعوا کر چکی ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ اور وہ بھی پاکستانی مسلمان۔"

"اس دعوا کے جواب میں شیکھر نے کیا کہا۔"

"اس نے یوں دیکھا جیسے اسے نہ یقین آیا ہو اور میرا مذاق اڑا رہا ہو۔"

"اس کا مطلب ہے نادیہ! تمہارا دعوا اس سے مختلف ہے جو در اصل تم ہو۔"

"پھر میں ایسا کیا کروں جو ویسی نظر آؤں جیسا میں نے دعوا کیا۔"

"پہلے تم یہ فیصلہ تو کر لو، تم کیا ہونا چاہتی ہو اور ہاں نظر آنے اور ہونے میں بھی فرق ہوتا ہے، یاد رہے۔" اور جب فیصلہ کر لو تو یہ بھی یاد رکھنا کہ کسی بھی چیز کے بارے میں انفارمیشن تمہاری رسائی سے باہر نہیں ہے، لیکن سب سے پہلے خود سے پوچھ تو لو۔"

"ٹھیک ہے۔" نادیہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے خود کو سیدھا کیا۔ "ہو سکتا ہے جب ہم اگلی بار بات کریں تو میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"ہاں اچھی بات ہے، کنفیوژن میں رہنے سے بہتر ہے انسان یکسوئی حاصل کر لے۔"

سعد نے کال ختم کرنے سے پہلے کہا اور اس کال میں آخری نظر نادیہ پر ڈالی۔ اس کی ٹی شرٹ پر لکھے الفاظ ایک نظر میں ہی پڑھے جا سکتے تھے۔

Religion should be used to
bring people to gether not
bLOW them up

اس نے نادیہ کی ٹی شرٹ کے الفاظ پڑھے اور زیر لب مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"سر! کیا آپ آج رات ڈنر بھی گھر ہی پر کریں گے۔" یہ رازی تھا جو انٹرکام پر ان سے پوچھ رہا تھا۔

"رازی غریب میرے سارا دن گھر پر رہنے سے پریشان ہو گیا شاید۔" انہوں نے رازی کی بات سن کر دل میں سوچا۔

"یقیناً" ان کا جواب مختصر تھا۔

"او شیور سر" رازی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اس روز وہ اور اس کا ماتحت عملہ ایک امتحان سے گزر رہا تھا۔ رات کو ایک امتحان اور سہی۔

"سر! صوفی اپنے ہاتھ سے بلیک پیپر پرانز تیار کر رہی ہے، اور فش ان وائٹ ساس بھی آپ کو یقیناً" پسند آئے گی اس کے علاوہ اگر آپ کچھ لینا چاہیں تو بتائیں۔"

اس نے اپنے چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا باس اس کو دیکھ نہیں رہا تھا۔

"سوری رازی! آج میرا ایسی فوڈ کھانے کا کوئی موڈ نہیں ہے' یہ مینیو پھر کبھی سہی۔" انہوں نے ریوالونگ چیئر کو گھماتے ہوئے اپنے پیچھے دیوار میں جڑی کھڑکی سے پار دیکھا۔ تاحد نظر سر اٹھائے اونچے سرسبز درخت ان کے سامنے کھڑے تھے۔

"پھر سر؟" رازی کے چہرے کی مسکراہٹ لمحہ بھر کو غائب ہوئی' لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اسے دوبارہ اسی جگہ سجا لیا جہاں وہ پہلے موجود تھی۔

"ٹنڈوں کا دلمہ بنانا آتا ہے ضوفی کو؟" انہوں نے ہنوز سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹٹ... ٹنڈوں کا کیا سر؟" رازی کی آواز اس فرمائش پر بری طرح لڑکھڑا گئی۔

"اور خرفے کا ساگ۔"

"سس... سر! ایک منٹ سر! میں نوٹ کرلوں ذرا۔" رازی نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ پنسل پکڑے۔

"اور مکھڈی حلوہ۔" وہ شاید رازی کی کوئی بات سنے بغیر اپنی دھن میں بولے چلے جارہے تھے۔

"ٹٹ ٹنڈوں کا کیا تھا سر اور ساگ کون سا؟" رازی کچھ الفاظ سمجھ نہیں پایا تھا۔ "اور ح حلوہ... سر! کس چیز کا حلوہ؟" وہ پیشانی پر ہاتھ ملتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے پوچھ ہی رہا تھا کہ انٹرکام دوسری طرف سے بند کردیا گیا۔

"او مائی گاڈ!" اس نے تیزی سے ایک بار پھر اپنی پیشانی مسلی اور ڈرتے ڈرتے دوبارہ ٹاپ فلور پر موجود آفس ایکسٹینشن کا نمبر ملایا۔ ایک' دو' تین بار بیل بجی' لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔

"آج کا ڈنر' ڈنر نہیں کیریر کا سب سے بڑا امتحان ہے ضوفی!" کچھ دیر بعد اس نے پینٹری میں راشن کے جار چیک کرتی ضوفی کو سناؤنی سنائی۔

"آج کا ڈنر ہی نہیں' آج کا لمحہ لمحہ ایک امتحان ہے ڈارلنگ!" ضوفی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "سر پوچھ رہے ہیں کہ گھر میں آٹا کس فلور مل سے آتا ہے اور چاول کی کوالٹی کیا ہے۔ وہ کوکنگ آئل کے بارے میں بھی پوچھ رہے ہیں اور مسالاجات کی کوالٹی جانچنے کے لیے ان کے نمونے بھی منگوائے ہیں۔"

"او خدایا خیر!" رازی نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر ہمیں نئی ایکسٹینشن دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اب ہمارے امیجیٹ باس سعد سلطان ہوں گے۔"

"فیصلہ ریورس ہوچکا ہے رازی! اپنی فائل سے گروسری بلز نکالو پچھلے تین ماہ کے' سر پوچھ رہے ہیں کہ سرونٹس کو سہولتوں کی مد میں کس طرح کیٹگرائز کیا گیا ہے۔" ضوفی نے سب جار چیک کرنے کے بعد ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"دعا کرو باس کے سر پر چڑھے اس جنون کی مدت صرف ایک ہی دن ہو۔" رازی نے اپنے آفس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں تم کچن ٹیبل پر رکھا وہ پیپر پڑھ لو جو آج کے ڈنر کا مینیو ہے۔ میری دعا ہے وہ سب تمہیں یا دونوں ککس میں سے کسی ایک کو بنانا آتا ہو۔"

رازی آفس اور ضوفی کچن کی طرف مڑ گئی۔ "ٹنڈوں کا تسمہ' گھرنے کا ساگ اور ہٹھنڈے کا حلوہ۔"

ضوفی نے رازی کے ہاتھ کا لکھا مینیو پڑھا۔ شام تک سب جاننے والوں کے ککس اسے جواب دے چکے تھے۔ کوئی بھی اس مینیو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ضوفی تیز دماغ اور باہمت لڑکی تھی۔ رات بلال سلطان کی ڈنر ٹیبل پر جو ڈنر سرو کیا گیا تھا اس کی تعریف کرتے ہوئے بلال نے ضوفی کی اگلی تنخواہ میں اضافے کا اعلان کیا تھا۔

"مگر یہ کارنامہ تم نے کیسے سرانجام دے لیا ڈارلنگ؟" رات سونے کے لیے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے رازی نے ضوفی سے سوال کیا۔

"برین..." ضوفی نے اپنے سر کی طرف مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔ "ایسے کارنامہ سرانجام دینے کے لیے برین چاہیے' تھنکنگ برین۔" وہ مسکرائی۔ "جو اتفاق سے تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"پھر بھی..." رازی نے راستے میں رک کر اس سے جواب پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"باس صرف ناسٹیلجک ہو رہا تھا سویٹ ہارٹ' اسے ٹنڈوں اور ساگ کی شکل دیکھے عرصہ ہوچکا اور حلوہ بھی شاید کبھی نہیں کھایا اس نے' اسی لیے اس نے ان چیزوں کا نام لیا' تمہیں ان ڈشز کی ورائٹی سمجھنے میں غلطی ہوئی جو کہ ظاہر ہے باس سے دوبارہ نہیں پوچھی جاسکتی تھی اور اس کے سلسلے میں مجھے کہیں سے مدد بھی نہیں مل رہی تھی' سو میں نے سوچا ناسٹیلجک کے باس کے لیے ڈشز میں رکھے ٹنڈوں' ساگ اور حلوہ کی جھلک ہی کافی ہوگی اور تم نے دیکھا۔ وہ کافی تھی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"مانتے ہونا برین؟" اس نے ایک بار پھر اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"مانتا ہوں' بالکل مانتا ہوں۔" رازی نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "یو آر اے جینئس۔" وہ مسکرایا۔

"اور ہاں اس مینیو کے ذریعے مجھے ایک کلیو (Clue) اور ملا۔" ضوفی بھی مسکرائی۔

"وہ کیا؟"

"باس نے یہاں سے وہاں تک کوئی لمبی فلائٹ لی ہے اتنے سالوں میں۔" ضوفی نے نیچے سے اوپر تک اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ ٹیل می۔"

"یقین کرلو۔" ضوفی مسکرائی۔ "جو لوگ یہ لمبی فلائٹ بھرتے ہیں' انہی پر بڑھتی عمر کے دوران ایسے دورے پڑتے ہیں' ٹنڈوں کا تسمہ' گھرنے کا ساگ اور ہٹھنڈے کا حلوہ... آٹے کی کوالٹی' چاول کی جنس' آئل کا حساب اور سرونٹس کی کیٹیگریز' مان لو رازی...

its another story of rags to ritches

رازی نے اس کی بات پر غور کیا۔ "ہوگی یار!" پھر اس نے لاپروائی سے کہا۔ "لیکن اب تو وہ ملینئر ہے اور یہ ہی اصل میں میٹر کرتا ہے کہ وہ اب کیا ہے۔"

"ہاں مگر ٹنڈوں کا تسمہ اور گھرنے کا ساگ۔" ضوفی بال جھٹکتے ہوئے ہنسی۔

"کم آن یار! چلو سوتے ہیں' بہت تھک گئے ہیں آج ٹنڈوں اور ساگوں کے چکر میں' وہ پہلے جو تھا اسے کسی نے نہیں دیکھنا' اس ملک کے سارے بڑے لوگوں کی ایسی ہی کہانیاں ہیں۔"

رازی نے ضوفی کی کمر میں بازو ڈال کر آگے چلتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

خدیجہ نے کھلے گیٹ سے گاڑی باہر نکالی اور گیٹ وے کی صفائی کرتی ملازمہ کو گیٹ بند کرنے کا کہہ کر خود سیدھی سڑک پر رواں دواں ہوگئیں۔ ملازمہ نے گیٹ بند کیا اور گیٹ وے پر ربر پائپ سے پانی کی بوچھاڑ کردی۔ اسی دم باہر سے گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

"لو ابھی بند کیا تھا' ابھی پھر کوئی آگیا۔" وہ پائپ پھینکتے ہوئے بڑبڑائی اور آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ باہر کالے رنگ کی ایک بڑی گاڑی کھڑی تھی۔

"ہاں جی۔" اس نے گاڑی کے قریب جا کر آنے والے سے پوچھا۔

"آپ پلیز گیٹ پورا کھول دیں۔ مجھے گاڑی اندر لے کر جانی ہے۔" آنے والا ایک کم عمر لڑکا تھا جسے اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"پر اندر تو میں پورچ دھو رہی ہوں' جی ساری جگہ پانیوں پانی ہوئی ہے۔" وہ بولی۔

"آپ پلیز بعد میں دھو لیجئے گا' مجھے گاڑی اندر لے جانے دیں۔" آنے والے نے کہا۔ ملازمہ نے اس پر احسان کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا مانجھا جھٹک کر چھینٹے اڑاتے ہوئے گیٹ کھولا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔

"کون ہے بھئی؟" بیرونی دروازہ کھول کر فاطمہ باہر آئیں۔

"السلام علیکم! میں ہوں۔" اس نے گاڑی سے باہر نکل کر کہا۔

"ارے وعلیکم السلام۔ آؤ بھئی آؤ۔" فاطمہ اس کو دیکھ کر مسکرائیں اور اسے لیے اندر لاؤنج میں آگئیں۔

"ہے تو عجیب سی بات' مگر کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ساتھ والے گھر سے آپ کے گھر میں کھڑی گاڑی نظر آسکتی ہے یا نہیں۔" اس نے صوفے پر بیٹھ کر پہلی بات کی۔

"ہوں!" فاطمہ نے چشمہ درست کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ "اول تو دن کے اس وقت میں ساتھ والے گھر میں کوئی ہوتا ہی نہیں' ہو بھی تو جھانک کر دیکھنے سے ہی پتا چل سکتا ہے کہ یہاں یہ گاڑی کھڑی ہے البتہ۔"

ان کے اطمینان دلاتے جملے سے مطمئن ہو کر ٹیک لگا کر بیٹھتا بیٹھتا وہ اس البتہ پر پھر سے چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"البتہ کیا؟"

"البتہ یہ کہ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔"

"اوہ۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا گیا۔ "یہ تو ہے' مگر میرا خیال ہے تاڑنے والے چار بجے سے پہلے تو گھر نہیں آتے۔"

"ہاں شاید۔" فاطمہ مسکرائیں۔ "تو پھر اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہو؟"

"ڈرا ہوا نہیں' گھبرایا ہوا ضرور ہوں۔ وہ سوال بہت کرتی ہے اور ناراض بھی بہت جلدی ہو جاتی ہے۔"

"پھر اس کو بتا کر ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے۔" انہوں نے پوچھا۔

"اس کی بھی ایک وجہ ہے' وہ میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دوسری خالہ کدھر ہیں' نظر نہیں آرہیں۔"

"خدیجہ کچھ ضروری کام نمٹانے گئی ہے' ابھی کچھ دیر پہلے ہی نکلی ہے' اسے علم ہوتا کہ تم آرہے ہو تو کل چلی جاتی' آج نہ جاتی۔"

"چلیں خیر' آپ تو ہیں نا۔" اس نے کہا۔ "آپ کو برا تو نہیں لگا' میرا یوں بے تکلفی سے بلا اطلاع چلے آنا۔"

"ہرگز نہیں... بلکہ بہت اچھا لگا' مجھے تکلفات سے ویسے بھی سخت چڑ ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔ "ماہ نور کی ممی کو شاید اچھا نہ لگتا اس طرح میرا بغیر اطلاع کے آنا' اس لیے پوچھا۔"

"ماہ نور کی ممی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتی ہیں' اسی لیے ان کو وقت سے ادھر ادھر ہونا اچھا نہیں لگتا' ہم ٹھہرے بے کار سے ریٹائرڈ لوگ' ہمیں فرق نہیں پڑتا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"یہ بتاؤ' چائے پیو گے یا کافی؟"

"کچھ بھی نہیں' آپ بس بیٹھ جائیں پلیز' مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے انہیں منع کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر یہ کھاؤ۔" وہ ڈائننگ ٹیبل سے ڈرائی فروٹ کی ڈش اٹھا لائیں۔

"ٹھیک ہے یہ چلے گا' لیکن اب آپ بیٹھ جائیں پلیز۔"

"ہاں پوچھو' کیا پوچھنا ہے۔" وہ پستے کے خول اتارتے ہوئے بولیں۔

وہ دو یا ڈھائی گھنٹے تک ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

"بس اب میں چلتا ہوں۔" ڈھائی گھنٹے بعد وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

"بس چل بھی دیے۔" انہوں نے وہ دو چار پستے جو شروع میں اٹھائے تھے اور جنہیں وہ چھیلنے کے بعد کھانا بھول گئی تھیں' واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بہت دیر سے بیٹھا ہوں' اب چلنا چاہیے۔ وہ دوسری خالہ ابھی بھی نہیں آئیں۔"

"ہاں۔ اس کے کام زیادہ تھے۔ بینک کے چکر' پنشن ٹرانسفر کرانا' یوٹیلیٹی بلز کی پے منٹ اور ڈاکٹر سے بھی اپائنٹمنٹ ہے۔ اس لیے وہ بھی تین' چار بجے تک ہی پہنچے گی۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

"فاطمہ خالہ! میں آپ سے کلیوز (clues) لینے آیا تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں آپ بھی الجھ گئیں' آئی ایم سوری۔" اس نے کہا۔

"نہیں بیٹا! تمہاری باتوں نے میرے ذہن کے چند بند گوشے بھی کھول دیے ہیں' مجھے ابھی کچھ وقت دو سوچنے کے لیے۔ ہو سکتا ہے کچھ کلیوز مل جائیں اور راستے ادھر کو چل پڑیں' جو تمہاری منزل ہے۔"

فاطمہ نے خلوص سے کہا۔ جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"فاطمہ خالہ! ماہ نور کی دوستی مجھے بے حد عزیز ہے۔ ماہ نور میری زندگی میں میری دوست بن کر یوں نہیں آئی جیسے میرے باقی دوست ہیں۔ ماہ نور کا میری زندگی میں آنا غیر معمولی بات ہے' اسی لیے وہ میرے لیے بہت اسپیشل ہے' وہ ابھی معصوم ذہن کی مالک لڑکی ہے' بڑی بڑی اور الجھی ہوئی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں' وہ الجھ جاتی ہے' پریشان ہو جاتی ہے اور آخر میں ناراض ہو جاتی ہے' اگرچہ اس کے ناراض ہونے پر اسے منانے میں مجھے بہت مزا آتا ہے' لیکن میں اسے الجھانا نہیں چاہتا' اسی لیے دن کے اس حصے میں آپ کے پاس آیا ہوں' مجھے امید ہے کہ آپ اسے نہیں بتائیں گی۔"

"تم فکر مت کرو۔" وہ مسکرائیں۔ "ویسے الجھنے اور ناراض ہونے سے زیادہ اسے یہ بات بری لگتی ہے کہ اس کے بجائے کسی اور موضوع پر بات کی جائے۔"

"خصوصاً" اگر میں کروں تو۔" وہ مسکرایا۔

"میں تمہارے مزاج کو سمجھ گئی ہوں سعد بیٹا! تمہارے ذہن کی الجھنوں کو بھی سمجھنے لگی ہوں۔ اس روز میں حیران تھی' اس لڑکے کو اتنا تجسس کیوں ہے' آج سمجھ میں آیا کہ تم فرمائش کر کے ماہ نور کے ذریعے ہم دونوں سے کیوں ملے۔ مجھے یقین ہے' ایک روز تم ضرور کھوج لگا لو گے اور اس کو ڈھونڈ نکالو گے' مگر میری تم سے ایک ریکویسٹ ہے بیٹا!"

"جی پلیز کہیے۔" اس نے کہا۔

"ماہ نور بہت حساس اور معصوم لڑکی ہے۔ اس کی نیت بہت اچھی ہے' جو نیک نیت لوگ ہوتے ہیں' صرف وہی اس دنیا میں پر خلوص بھی ہوتے ہیں۔ بیٹا! کوشش کرنا ماہ نور کبھی تمہارے ہاتھوں ہرٹ نہ ہو' کیونکہ تم سے دوستی کے معاملے میں وہ زیادہ ہی حساس ہے۔"

"میں جانتا ہوں خدیجہ خالہ!" اس نے سر اٹھا کر ماہ نور کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور میں سمجھتا بھی ہوں۔ میری بھی کوشش رہے گی کہ وہ کبھی میری وجہ سے ہرٹ نہ ہو۔" اس نے ان کی طرف دیکھا۔

جواب میں وہ محبت سے مسکرا دیں۔



"تین دن رہ گئے ہیں باقی نکاح میں۔ بس کردے اب یہ رونا دھونا' کوئی روٹی ٹکر کھالں سے۔ اپنی کوئی شکل صورت ٹھیک کر پتر جی!"

ماسٹر کمال نے کھاری کو چوہدری صاحب کے سامنے لا کھڑا کرتے ہوئے چوہدری صاحب کی نظر میں اپنے نمبر بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بھلا ہے ماسٹر کمال! پتا نہیں کون سی بات دل سے لگالی ہے اس نے۔" چوہدری صاحب نے اٹھ کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو ادھر میرے پاس' میں تمہیں بتاتا ہوں' اب میں نے کیا سوچا ہے۔" انہوں نے اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر کمال دودھ پتی تو بنوا کر بھجواؤ ادھر' میں ذرا دو باتیں تو کرلوں اس سے۔" انہوں نے ماسٹر کمال کو وہاں سے کھسکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو بیٹا جی! اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ چپ کر کے نکاح نہیں کرنا' ذرا ہلا گلا کریں گے' تیری کون سی بار بار شادی ہونی ہے۔ میں نے لاہور سے کیٹرنگ اور ایونٹ مینجمنٹ والوں کی پوری ٹیم بلوائی ہے' تیری شادی کو پورا گاؤں یاد رکھے گا کئی سال۔ لوگوں کو پتا چلے گا چوہدری سردار نے بچہ گود لیا تھا تو اس کے سارے شگن بھی پورے کیے' تمہارے جوڑے میں نے اس درزی سے سلوائے ہیں' جس سے میں اپنے کپڑے سلواتا ہوں' تمہاری دلہن کے لیے بری چودھرائن خود تیار کروا رہی ہے' میں نے چیدہ چیدہ بڑے بڑے لوگ بلائے ہیں شادی میں شرکت کے لیے اور تمہیں پتا ہے' ماہ نور بھی آرہی ہے تمہاری شادی میں شرکت کے لیے۔"

وہ شاید کھاری کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور انہوں نے دیکھا تھا کہ سب باتوں میں سے صرف ایک ماہ نور کی آمد کی خبر پر اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں۔ ماہ نور نے خود کہا کہ وہ آنا چاہتی ہے۔" انہوں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "چاہتا تو میں یہ ہی تھا کہ وہ سارے جی (گھر والے) آئیں' مگر باقی سب تو تم نے دیکھا ہی ہے کہ کتنے مصروف رہتے ہیں۔ ماہ نور اور اس کے شاید کوئی دوست' سہیلیاں آئیں' ان کو گاؤں' فارم ہاؤس اور گاؤں دکھاؤں گا کہ بچو دیکھو ہمارے گاؤں میں بھی شہروں جیسی شادیاں ہوتی ہیں۔ ایونٹ مینجمنٹ والوں نے ادھر جنگل میں منگل بنا دینا ہے دیکھنا۔ موسیقی کا پروگرام بھی رکھنا ہے آخر میں' جب مولوی صاحب اور ان کی گھر والی واپس گھر چلے جائیں گے نا اس کے بعد۔" وہ شرارت سے ہنسے۔

"چوہدری جی! میں تساں نال اک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" اچانک کھاری کی خاموشی ٹوٹی۔

"ہاں' ہاں بیٹا جی! ضرور کرو' ایک نہیں دس کرو۔" وہ شاید اس کی دلجوئی کرنے کی تمام کوشش کر رہے تھے۔

"میں تہاڈیاں (آپ کی) ساری باتاں مانوں گا' پر تساں میری اک من لو۔"

"ہاں ہاں بیٹا تو کہہ تو سہی۔" وہ اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولے۔

"اک صرف نکاح نہ کرو' ودیار (رخصتی) کر کے لے آؤ۔" اس نے کہا۔ "دوسرا میرے نال وعدہ کرو۔ آپ سعدیہ نوں ڈاکٹری پڑھاؤ گے' جتنے وی پیسے لگ جائیں' جتنا مرضی خرچا آجائے۔"

اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا' جیسے وہ یہ بات منوا کر چھوڑے گا۔

"ہاں پتر جی! ضرور' ضرور۔" وہ گڑبڑاتے ہوئے بولے۔ "مگر وہ شادی کے بعد پڑھ لے گی؟" انہوں نے سوال کیا۔

"ہاں جی۔ ضرور پڑھ لے گی، میں اس نوں ضرور ڈاکٹر بناؤں گا۔" وہ عزم کے ساتھ بولا۔ "آپ اپنی ذمہ داری تے اس نوں لے کر آرہے ہو نا، آپ اسے وعدہ ضرور کرو۔"

"وعدہ بھئی وعدہ۔ پکا وعدہ۔" چوہدری صاحب دو منٹوں میں ہی قائل ہو گئے۔ "مگر اس کو ڈاکٹر بنا کر خود کیا اس کی ڈرائیوری کرو گے۔"

"میرا کیا ہے، میں کچھ بھی کرلوں گا، اصل مسئلہ تے اس غریب کا ہے۔" اس نے کہا۔

"چلو پکا وعدہ ہوا، اگر وہ پڑھنے پر رضامند ہوئی تو ضرور پڑھاؤں گا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔ "مگر کھاری باؤ! یہ رخصتی والی بات تو ہم نے مولوی صاحب سے کی ہی نہیں۔"

"اب کرلیو نا، میں صرف نکاح نئیں کرانا، رخصتی بھی کرانی اے۔" کھاری اتنے دن جلتے، کلستے رہنے کے بعد گویا تپا ہوا فولاد بن کر باہر نکلا تھا۔

"چلو پوچھ کر دیکھ لیتے ہیں، لیکن اگر وہ نہ مانے تو۔"

"نہ مانے تو نکاح توں وی مکر جائیو (نہ مانے تو نکاح پر بھی نہ مانیے گا۔)" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"اچھا!" چوہدری صاحب ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "اور کوئی حکم۔"

"اور بی بی جی نوں کہہ دیو، میلاد محفل بعد میں کرالیں۔ او ناں نوں بھی فارم ہاؤس بلا لو نا اتنے دن۔" اب کے کھاری کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"ہاں یہ تو ضرور ہو سکتا ہے اور آسانی سے ہو سکتا ہے۔" چوہدری صاحب فوراً بولے۔ "اور کچھ۔"

"نہیں بس۔ اینہا ای (اتنا ہی) اس نے سر ہلایا۔

"ہن میں جاؤں (اب میں جاؤں) وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہاں جاؤ اب۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"اور ہاں اگر اپنے کسی خاص یار بیلی کو بلانا ہو تو بتا دینا۔"

"اپنا یار بیلی!" کھاری نے واپس اپنے کمرے میں آتے ہوئے غور کیا اور ایک نام، ایک چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین پر روشن ہو گیا۔

"نہ تو ابھی بابے منگو کا میلہ ہے نہ کوئی اور میلہ، کیا کہہ کر بلاؤں او تھوں، سعد یہ باؤ تو نے کس وخت میں ڈال دتا مجھے۔"

اس نے سوچا اور اپنا موبائل فون نکال کر اس پر ایک نمبر ملانے لگا۔ یہ موبائل فون اسے ماسٹر کمال نے ادھار دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اتنا میں نے شاہ بانو کو کہا تھا میرے ساتھ چلے، اچھی بھلی تیار بھی ہو گئی تھی، عین وقت پر بولی نہیں جی میرے تو اپنے کزن کی شادی آگئی ہے۔" ماہ نور نے کہا۔

وہ اور سلمان، سعد کے ساتھ فارم ہاؤس جا رہے تھے۔ ماہ نور کی منت سماجت کے بعد سلمان بمشکل ایک رات کے لیے وہاں جانے پر مانا تھا۔ اسے اگلی صبح واپس آجانا تھا۔

"اسے پتا ہے نا تم کتنا اسے تنگ کرتی ہو جب اس کے ساتھ کہیں باہر جاتی ہو۔" سلمان نے اسے چھیڑا۔

"شاہ بانو بتا رہی تھی، یہ دونوں اسلام آباد میں کسی میوزیکل کنسرٹ میں گئیں یہ وہاں کسی سنگر کو دیکھ کر بے قابو ہو کر اس کی طرف بھاگی، تم کون ہو، تم کون ہو کرتی۔" سلمان نے سعد کو بتایا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے سعد کے چہرے پر

گہری مسکراہٹ چھا گئی۔

"اچھا پھر؟" اس نے دانستہ کہا۔

"پھر کیا۔ بے چاری شاہ بانو کے لیے اتنی ایمبریسنگ سچویشن تھی یہ۔ اس کے بعد وہ بے چاری اس کے ساتھ کہیں جانے سے گھبراتی ہی ہے۔"

سعد نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ماہ نور کی طرف دیکھا، جو سلمان کی بات پر جو اس کے خیال میں بے موقع بات تھی، جھلا کر سر جھٹک رہی تھی۔

"دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہے۔" سعد کے فون پر کسی مخصوص کالر کی کالر ٹیون بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور کال ڈراپ کر دی۔ ماہ نور نے سعد کی طرف دیکھا، کیونکہ اگلے ہی لمحے فون اسی ٹیون کے ساتھ دوبارہ بجنے لگا۔ تین، چار بار ایسا ہونے کے بعد سعد نے فون سوئچ آف کر دیا۔

"اٹینڈ کر لیتے آپ، ہو سکتا ہے کوئی ضروری بات کرنی ہو کسی کو۔" سلمان نے کہا۔

"میں ڈرائیو کرتے ہوئے کالز اٹینڈ نہیں کیا کرتا عموماً۔" سعد نے کہا اور کن اکھیوں سے ماہ نور کو دیکھا جو خود بھی کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

"فلزا!" ماہ نور نے اس کو خود کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر کہا اور اسے نہ جانے کیوں لگا کہ یہ نام سن کر سعد ہلکا سا گڑبڑا گیا تھا۔

"ظہور۔" اس نے سعد کی گڑبڑاہٹ دیکھنے کے بعد لفظ مکمل کیا۔ "میرا مطلب ہے فلزا ظہور کی چار کول اسکیچنگ تقریباً ایسے ہی مناظر پر مشتمل تھی، ہے نا۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کھیت، عمارتیں، پیدل چلنے والے، ٹریکٹر، ٹرالر، درخت، سڑکوں کے کنارے کچے راستے، کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیاں، سعد نے باہر کے مناظر پر نظر ڈالی اور سر ہلا کر سامنے دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

اس نے وہیل چیئر کے پہیوں کو ہاتھ سے گھمایا، اس سے وہیل چیئر آگے پیچھے ہوئی۔ اب اسے اپنے اعضا کو حرکت دینے میں مزا آنے لگا تھا۔ بالکنی سے نیچے جھانک کر اس نے سڑک پر موجود لوگوں کو دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصباتی بازار تھا۔ جس میں اچھے جنرل اسٹورز بھی تھے اور پان سگریٹ کے کھوکھے بھی، سبزی اور گوشت دکانیں بھی تھیں اور دودھ دہی والا بھی سامنے ہی بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس نے سبزی والے کو دیکھا، کچھ تازہ، کچھ باسی سبزی سامنے رکھے وہ اپنے قریب رکھی پانی کی بوتل جس کے ڈھکن میں اس نے سوراخ کر رکھے تھے اٹھا کر سبزی پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگا تھا، اسے شام تک اس سبزی کو قابل خرید شکل عطا کیے رکھنی تھی۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ دکان چاہے سبزی کی ہے یا دودھ، دہی کی، نائی کی ہے یا موچی کی، حلوائی کی ہے یا بیکری کی، پانچ روپے میں گھنٹہ بھر بات اور شام سات بجے سے صبح چھ بجے تک مفت کال قسم کے اشتہار سب نے اپنی دکانوں پر چسپاں کر رکھے ہیں، کیا یہ سب ہی کریڈٹ بیچتے ہیں موبائل فونز کا؟"

اس نے یسمی آنٹی سے کہا جو چائے کے دو کپ ٹرے میں لیے اس کے قریب رکھی کرسی پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔

"ہاں، کیونکہ ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ اب ایک دوسرے سے بات کرنا رہ گیا ہے، ہر شخص چاہے اس کی جیب میں پندرہ روپے ہی کیوں نہ ہوں، پانچ اپنے پاس رکھ کر دس کا کریڈٹ ضرور خریدے گا، کیونکہ یہ لوڈ اسے ایزی لی دستیاب ہو جاتا ہے اور ہم سب اس ایزی کا لوڈ اٹھانے کو خوشی خوشی تیار رہیں۔"

یسمی آنٹی نے چائے میز پر رکھنے کے بعد اپنی سلائی کڑھائی کی ٹوکری سے کروشیے کی سلائی اور اون کا گولہ باہر

نکالتے ہوئے کہا۔
"آپ نے مجھے بھی ایک سلائی لاکر دینی تھی۔" سارہ نے انہیں یاد دلایا۔
"ہاں۔۔۔" انہوں نے اس کے کمزور ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ "نیچے بازار میں جانے کی فرصت ہی نہیں ملی' جس دن گئی ضرور لادوں گی۔"
"مجھے اب سمجھ میں آنے لگا ہے کہ سعد نے مجھے گلوز اور ڈوکیوں لاکر دیے تھے۔" اس نے اون کا ایک گولہ نکال کر اسے ایک ہاتھ سے پھینک کر دوسرے ہاتھ سے کیچ کرنا شروع کیا۔
"کیوں بھلا۔"
"اس پریکٹس سے میری کلائیوں' انگلیوں اور پیچھے بازوؤں کے پٹھے مضبوط ہونا شروع ہو گئے ہیں۔" اس نے کہا۔ "سعد کے ذہن میں نہ جانے کیسے ایسے خیال آجاتے ہیں۔" اس نے سامنے پہاڑوں کے اردگرد اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہوں!" سیمی آنٹی نے اس کی بات پر غور کرنے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ "سارہ! تمہیں وہ اسٹوری یاد ہے آسکر وائلڈ کی دی ہیپی پرنس۔"
"ارے ہاں!" اس نے مسز پیٹر کی کتابوں کے ذخیرے میں پہنچنے کے بعد یاد کیا۔
"مجھے یاد ہے۔ پرنس کا وہ مجسمہ جس کے تمام قیمتی اسٹونز وہ پرندہ اتار کر ضرورت مندوں کو جا کر دے آتا ہے۔"
"اور پرنس کی آنکھ سے جو آنسو ٹپکتا ہے' وہ بھی یاد ہے۔" سیمی آنٹی نے کہا۔
"ہاں بالکل یاد ہے۔"
"اس آنسو کو کبھی بھولنا بھی نہیں' یہ جو پرنس ہوتے ہیں نا' ان کی آنکھوں سے یوں ہی آنسو نہیں ٹپکا کرتے۔"
"اچھا نہیں بھولوں گی۔" اس نے لاپروائی سے ان کی بات سننے کے بعد کہا اور سرمئی پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔
"آپ ابھی اندر کس سے بات کر رہی تھیں؟" انجم آیا تھا کیا سودا دینے۔" اسے یاد آیا۔
"نہیں۔۔۔ میں فون پر بات کر رہی تھی۔" سیمی آنٹی نے اون کے گولے سے دھاگا کھولتے ہوئے کہا۔
"کس کا فون تھا؟"
"سعد کا فون تھا' خیریت پوچھ رہا تھا اور بتا رہا تھا' وہ مزید کچھ دن چکر نہیں لگا پائے گا۔"
"کیوں؟" اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
"وہ اس لڑکی کے چچا کے ہاں کوئی شادی کی تقریب اٹینڈ کرنے گیا ہوا ہے' جو اس کے ساتھ ایک مرتبہ یہاں آئی تھی۔ کیا نام تھا بھلا اس کا؟"
سیمی آنٹی نے اس کی طرف دیکھا۔ اون کا گولہ اس کے ہاتھ سے گر کر لڑھکتا ہوا کچن کے دروازے کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا ایک سرا البتہ ابھی بھی سارہ کے ہاتھ میں تھا۔
"ماہ نور!" پھر انہیں خود ہی یاد آگیا۔ "وہ ماہ نور کے چچا کے ہاں کوئی فنکشن اٹینڈ کرنے گیا ہوا ہے۔"
"وہ لڑکی۔۔۔ وہ تو واپس چلی گئی۔" اسے کوئی بات یاد آرہی تھی' جسے یاد کرتے ہوئے وہ دم بخود بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں کیا حال ہے بھئی افتخار احمد' میں اتنے دن سے تمہیں فون کر رہا تھا' تم نے کال اٹینڈ ہی نہیں کی میری۔"
"میں ذرا نا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا بہانہ لگائے۔ "ہاں میرا ناجی ٹھیک نہیں سی پچھلے دنوں۔ آپ سناؤ ٹھیک ہونا جی۔"

"ہاں بھئی' فٹ ہوں بالکل۔"
"بھائی رضوان الحق صاحب! ایک عرض کرنی تھی۔"
"آپ حکم کرو افتخار بھائی؟"
"کھاری جی کھاری' افتخار نہیں کھاری کہنا ہے آپ نے مجھے۔"
"او سوری بھائی کھاری جی! حکم کرو۔"
"آپ نے پرسوں ادھر پہنچنا ہے جی پنڈ ہمارے۔"
"پرسوں۔" وہ حیران ہوا۔ "پرسوں کیوں کھاری بھائی؟ میلے کی تاریخ تو ابھی دور ہے۔"
"میلہ نئیں جی ادھر فاتحہ ہو رہی ہے جی!"
"نہیں!" وہ گھبرا کر بولا۔ "خیر تو ہے نا بھائی افتخار؟"
"پتا نہیں جی خیر ہے کہ نہیں۔ اب تساں کو کیسے بتاؤں بھائی رضوان الحق! آپ دے اس نکے بھرا (چھوٹے بھائی) دی شادی ہو رہی ہے' تسی آنا ہے ضرور' تسی ہی تو ایک یار بیلی ہو اپنے۔" اس نے فراٹے سے بولتے ہوئے کہا۔
"واہ' واہ' واہ۔۔۔ مبارک ہو بھائی کھاری! کیا بات ہے آپ کی۔" وہ بے اختیار خوش ہوا۔
"بس پھر تساں آنا ہے۔"
"ضرور بھائی! ضرور' سمجھو پہنچا کہ پہنچا۔ آپ بھائی ہو میرے' آپ بلاؤ اپنی شادی میں اور میں نہ آؤں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

☼ ☼ ☼

"کیسا لگا پھر بیٹا جی ہمارا فارم ہاؤس؟"
شام کو چوہدری صاحب نے سعد سے ملاقات کے دوران پوچھا' سارا دن وہ کھاری کی شادی کے انتظامات اور مولوی سراج سرفراز سے معاملات طے کرنے میں مصروف رہے تھے۔
نکاح کے بجائے شادی کی بات سن کر مولوی سراج پہلے پس و پیش کر رہا تھا۔ مگر پھر اس کی گھر والی نے بخوشی اس بات کی منظوری دے کر ان کی جان مولوی صاحب سے چھڑائی تھی اور اب شادی کی خبر سن کر تو پورا گاؤں ہی اس

تقریب میں شامل ہوگیا تھا۔ لوگ ان کے پاس آکر اپنی اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ کچھ حاسد انہیں مشورہ دے رہے تھے کہ ڈیرے کے ایک ملازم کی شادی پر وہ کیوں اتنا دھوم دھڑکا کر رہے تھے۔ سادگی سے نکاح کر کے لڑکی گھر لے آئیں۔ کچھ لوگ مولوی سراج کی قسمت پر رشک کرنے والے بھی تھے۔ ان ہی چکروں میں وہ صبح کے یہاں پہنچے ہوئے اپنے بھائی کے دونوں بچوں اور ان کے مہمان سعد سے ملاقات نہیں کر پائے تھے۔

"سب کچھ ہی تقریباً" پرفیکٹ ہے۔" سعد نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ "میں تو یہاں پہنچنے کے فوراً" بعد سو گیا اور یقین جانیے مجھے مدتوں کے بعد اتنی مزے کی نیند آئی' بہت پرسکون اور مزے کا ماحول ہے یہاں۔"

"چلو بیٹا! یہ تو اچھی بات ہے کہ تمہیں یہاں آکر اچھا لگا۔" چوہدری صاحب خوش تھے۔

"ماہ نور بیٹا جی! آج نکاح کی تقریب عشاء کے بعد ادھر ہماری طرف ہی ہوگی' مولوی صاحب اور ان کا بال بچہ ادھر ہی پہنچ جائے گا' تمہاری تائی ادھر پہنچی کہ نہیں ابھی۔"

"سب ادھر ہی ہیں سردار چاچا! اتنی رونق ہے اندر والے حصے میں کہ وہاں سے آنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آپ سے ملنے ادھر آگئی بس۔"

"ہاہا... انجوائے کرو ہم دیہاتیوں کے فنکشن' بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔" وہ ہنسے۔

"سردار چاچا! باہر صحن میں بڑی بڑی کڑاہیوں میں وہ اور رنج کلر کی ڈھیر ساری مٹھائی کیوں بن رہی ہے۔" سلمان جو ابھی باہر سے اندر آیا تھا' حیران ہوتا پوچھ رہا تھا۔

"یہ گاؤں کی ایسی تقریبات کی خاص روایت ہے' ہر آنے والے کی شکرپاروں اور جلیبیوں سے تواضع کی جاتی ہے' تم نے چکھی؟" انہوں نے پوچھا۔ سلمان نے سر ہلاتے ہوئے اشارہ دیا کہ نہ اس نے چکھی ہے' نہ چکھنے کا ارادہ ہے۔

"ارے یہ تو بڑا دلچسپ منظر ہوگا۔" سعد نے کہا۔ "کیا میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"ہاں' ہاں کیوں نہیں' اس طرف چند ملازم ہی ہیں یا باہر سے آنے والے ادھر سے گزر کر اندر والے حصے میں جاتے ہیں۔" چوہدری صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

وہ چوہدری صاحب کے ساتھ پچھلی طرف آگیا۔ یہ ایک ایسی کھلی جگہ تھی جہاں بڑے بڑے چولہے زمین میں گڑے تھے۔ ان ہی چولہوں پر بڑی کڑاہیاں رکھ کر وہ مٹھائی تیار کی جا رہی تھی جو گرم گرم ہی پلیٹوں میں رکھ کر مہمانوں کو پیش کرنے کے لیے بھجوادی جاتی تھی۔

سعد کو یہ منظر دلچسپ لگ رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی گفتگو' شادی بیاہ کی ایک مخصوص چہل پہل' جہاں ہر شخص مستعد اور عجلت میں لگ رہا تھا۔ وہ چوہدری صاحب کے قریب موڑھے پر بیٹھا کتنی دیر سے ان لوگوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ پچھلے گیٹ سے لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔

"چوہدری صاحب' مولوی صاحب کی فیملی آگئی ہے۔" کسی نے چوہدری صاحب کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

"اوہ... انہیں عزت سے' طریقے سے ادھر لے جاؤ' جہاں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔" چوہدری صاحب اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ فالتو مردوں کو وہاں سے نکالنے کے بعد مولوی صاحب کی بیوی اور بیٹی کو اندر لایا گیا تھا۔ سر تاپا بڑی چادروں میں لپٹی وہ دو خواتین اندر داخل ہوئی تھیں۔ بچی کو ایک ملازمہ اپنے ساتھ اندر لے جا رہی تھی۔ سعد اس طرف نظر ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا نظریں جھکا کر کھڑا تھا۔ مگر اندر آتی آپا راب... کی نظر اندر داخل ہوتے ہی اس پر پڑی تھی۔ اس کے بعد شاید وہ قدم اٹھانا بھول گئی تھیں۔

(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

آمنہ علی محسن

میرے پیتل کو سونا

میں جاگی تو ویلنٹائن ڈے کے پھول میرے سرہانے رکھے تھے اور تپائی پر "آئی لو یو" کا خوبصورت کارڈ میرا منتظر تھا۔ شمشاد کی یہ ادا مجھے بے حد پسند ہے۔ سرشاری کی کیفیت میں گنگناتی ہوئی میں ڈرائنگ روم میں آئی تو بے بی آستین چڑھائے جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔

"گوگا کر رہا کیا ہے؟" خوش دلی سے میں نے پوچھا۔

"ردی کاغذ اور پلاسٹک کی بوتلیں بیچتا ہے۔" بے بی نے کانوں میں پہنی نئی بالیوں کو نمایاں کرتے ہوئے جواب دیا۔

"پلاسٹک کی بوتلیں بیچنے والا تمہیں کھلائے گا کہاں سے؟" میں چیخ اٹھی۔

"دو تین سو کی دیہاڑی لگ جاتی ہے گوگے کی۔ کہتا ہے مجھے بڑا سکھی رکھے گا۔" بے بی نے بھولپن سے کہا اور کرسی پر چڑھ کر پنکھے کے پر صاف کرنے لگی۔

"دو سو کی دیہاڑی میں دو کلو آٹا اور ایک کلو سبزی آتی ہے۔ تم گوگے سے بالیاں لے کر ہوا میں اڑتی پھرتی ہو۔ تمہارا دماغ خراب ہے بے بی۔" میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں بڑبڑاتی ہوئی ٹیرس میں چلی آئی۔

میں کالج میں پڑھاتی ہوں۔ پچیس ہزار میری تنخواہ ہے۔ بچوں کا کوئی خرچا نہیں۔ مگر مکان کا کرایہ دینا پڑتا ہے۔ بجلی' گیس کے بل بھی جان نکال لیتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ کتنی مشکل سے میں مہینہ گزارتی ہوں۔ شمشاد کی جاب چل رہی ہو تو بیس پچیس ہزار وہاں سے بھی آجاتا ہے' مگر سچ بات تو یہ ہے کہ پہلے تو چار پیسے جمع ہو جاتے تھے بینک میں۔ لیکن اب بچتا کچھ نہیں سب



خرچ ہو جاتا ہے۔ سفید پوشی کا بھرم ہی بس قائم ہے۔

بے بی عادت کی بہت اچھی تھی۔ صاف ستھری، سلیقے سے کام کرنے والی لڑکی، نین نقش اچھے، بات کرنے کی تمیز۔ کام کرنے والیوں جیسے فضول نخرے نہیں تھے۔ اس لیے ٹک گئی۔ ورنہ میرے گھر میں مہینے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ کوئی رکتی نہیں۔ کچھ میرا مزاج بھی شاید تیز ہے۔ کم از کم شمشاد کا کہنا تو یہی ہے کہ میں خوامخواہ غصہ کرنے لگتی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ملازمہ کو ڈانٹنے لگتی ہوں۔ اس لیے وہ کام چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ گھر کا نقصان مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ غصہ آ ہی جاتا ہے اور پھر جب تنخواہ مناسب اور وقت پر دیتی ہے تو کام بھی اپنی مرضی سے لینا ہے۔ میری یہ بات جائز ہے۔ مگر کام چوروں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ دن بعد وہ سنہری چوڑیاں مجھے دکھا کر خوش ہو رہی تھی۔

"سونے کی نہیں ہیں۔ اتنا خوش نہ ہو۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ کر چوڑیاں دیکھیں۔

"باجی! سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔ کسی کو کیا پتا اصلی سونے کی نہیں ہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"نقلی ہیں۔ آرٹیفیشل۔ ردی کاغذ بیچنے والا سونے کی چوڑیاں کہاں سے لائے گا" میں نے کہا۔

"باجی! آپ کے کنگن تو اصلی سونے کے ہیں نا؟" اس نے میری کلائی پکڑ کر کنگن چھوئے۔

"ہاں! یہ اصلی سونا ہے۔ بالکل خالص۔" میں نے تفاخر سے کہا۔

"کتنے بھاری اور پیارے کنگن ہیں۔ صاحب جی نے لے کر دیے ہوں گے؟" وہ مرعوب ہو گئی۔

اس کی بات سن کر مجھے چپ لگ گئی۔ میں بھلا کیا جواب دیتی۔ شمشاد سے مجھے محبت کے سوا کبھی کچھ نہیں ملا۔ مجھے شاید کبھی خواہش نہیں رہی۔ ہماری پسند کی شادی ہے۔ مجھے شمشاد سے محبت تھی اور ہے۔ مگر کنگن، لاکٹ میں نے خود ہی پیسہ پیسہ جوڑ کر بنائے۔

"اگر وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تو پھر ان کنگن، چوڑیوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ اصلی ہوں یا نقلی کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے اسے محبت کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر خود اپنے آپ پر مجھے ہنسی بھی آئی۔ میں ایک ان پڑھ لڑکی کو محبت کے بارے میں اتنی گہری بات سمجھا رہی تھی، جو لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنے والدین کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور جسے کچرے سے پلاسٹک کی بوتلیں چن کر بیچنے والا ان پڑھ لڑکا کچے پکے خواب دکھا رہا تھا۔

گزشتہ کئی دنوں سے یہی ہو رہا تھا۔ بے بی کبھی کانوں میں بالیاں پہن کر چہکتی۔ کبھی انگلی میں چاندی کی انگوٹھی گھما گھما کر مجھے دکھاتی۔ ظاہر ہے گوگا اسے یہ سب تحفے دیتا تھا اور وہ گوگے کا نام لے لے کر جی رہی تھی۔ مجھے بھی اچھا لگتا تھا، جب وہ اپنے دل کی بات میرے ساتھ شیئر کرتی۔



اتوار کی چھٹی تھی۔ چھٹی والے دن میں دیر تک سوتی ہوں۔ سارے ہفتے کی تھکن اتارنا ہوتی ہے۔ میرے جاگنے سے پہلے ہی شمشاد اپنے کسی دوست کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہ دونوں حسب معمول اپنے کسی نئے بزنس کے بارے میں پلاننگ کر رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ یہ بھی حسب روایت صرف کاغذی پلاننگ ہو گی۔ نری زبانی باتیں۔

میری آنکھ کھلی تو بے بی نے کچن صاف کر دیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں جھاڑ پونچھ ہو چکی تھی اور وہ ٹیرس کے پردے دھونے کے لیے اتار رہی تھی۔

"بے بی اتنی جلدی کیا تھی؟ آج چھٹی تھی۔ تم بھی دیر سے آ جاتیں۔" میں نے پیار سے کہا۔

"جب کام ہی کرنا ہے تو پھر دیر سویر کیا باجی!" اس نے میری طرف دیکھے بغیر بجھے لہجے میں کہا۔ میں چونک گئی۔ آج اس کے لہجے میں روزانہ والی تازگی نہیں تھی۔

"کیا ہوا بے بی! خیریت تو ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"سب خیر ہے۔" اس نے پردہ اتارتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ میں نے دیکھا، اس کا چہرہ بجھا بجھا لگ رہا تھا۔

"لگ تو نہیں رہی خیر۔ کیا بات ہے، بتاؤ مجھے۔" میں نے کریدا۔

"کوئی بات نہیں باجی! ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ مگر اس کا لہجہ اس کی بات کا عکاس نہیں تھا۔

"کچھ تو ہے، جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ چھوڑو کام۔ ادھر آؤ۔ مجھے بتاؤ۔" میں نے اسے کلائی سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ وہ مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بولو!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"ابا نے گوگے کو نہ کر دی ہے۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"نہ کر دی ہے؟"

"جی باجی! کل شام گوگے نے میرا رشتہ مانگا تھا۔ مگر ابا راضی نہیں ہوا۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"بس! اتنی سی بات پر تم اتنی پریشان ہو گئی ہو" میں نے کہا۔

"اتنی سی بات؟ باجی یہ اتنی چھوٹی بات تو نہیں ہے۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"چھوٹی سی بات ہی ہے پاگل۔ اگر تم گوگے کو پسند کرتی ہو اور وہ بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو پھر یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔

"دیکھو! شادی تمہیں کرنی ہے۔ زندگی تم دونوں کو ایک ساتھ گزارنی ہے۔ تمہارے ابا کو اس پر کیا اعتراض ہے؟"

"ابا کو گوگے کی عادتیں پسند نہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا اور میری ہنسی نکل گئی۔

"کیوں؟ ایسی کیا عادتیں ہیں گوگے میں؟"

"پان بہت کھاتا ہے۔ تمباکو ہر وقت پیتا رہتا ہے اور کبھی کبھی ناچ دیکھنے بھی جاتا ہے۔" بے بی نے سادگی سے کہا۔

"اور یہ سب تمہارے ابا کو پسند نہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ان سب باتوں کے باوجود گوگا تمہیں پسند ہے؟"

بے بی نے دوبارہ مثبت جواب دیا۔

"تو یہی بات تو میں تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ گوگا تمہیں پسند ہونا چاہیے۔ تمہارے ابا کو نہیں۔ وہ تمہیں بیاہنا چاہتا ہے۔ تمہارے ابا جی کو نہیں۔" میں نے قہقہہ لگایا۔ مگر میری ہنسی پر بھی اس کا چہرہ بجھا رہا۔

"تمہیں پتا ہے، میرے ابو کو بھی شمشاد پسند نہیں تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"باجی! آپ کے ابا جی کو۔۔۔"

"ہاں!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ابو شمشاد کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر مجھے شمشاد پسند تھا۔ ہم دونوں نے ابو کو منانے کی کوشش کی۔ مگر ابو نہیں مانے۔"

"نہیں مانے؟"

"نہیں! وہ شمشاد کے ساتھ میری شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔" میں نے بتایا۔

"مگر آپ کی شادی تو صاحب جی سے ہو گئی۔۔۔ کیسے؟" بے بی حیران تھی۔

"کورٹ میرج۔"

"کورٹ۔۔۔ مرج؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ہم دونوں نے اپنی مرضی سے عدالت میں جا کر شادی کر لی۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اپنی مرضی سے؟ ابا جی سے پوچھے بغیر؟"

"ہاں! ابو سے پوچھے بغیر۔ ابو کو بتائے بغیر۔ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے اور اسی لیے تمہیں کہہ رہی ہوں کہ اگر تمہارے ابا جی نہیں مانتے۔ مگر گوگا اور تم دونوں شادی کرنا چاہتے ہو تو فکر کی بات نہیں۔ میں تمہاری کورٹ میرج کرا دوں گی۔"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتی رہی۔ مجھے یقین ہے میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ اس دن بجھی بجھی کام میں لگی رہی۔ وہ کام ختم کر کے جانے لگی تو

میں نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔

"ابا جی کی مرضی کے بغیر کیسے باجی؟" وہ الجھی الجھی چلی گئی۔

میں اس کی سادگی پر اندر ہی اندر ہنستی رہی۔ یہ کس زمانے کی لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی نہ سہی۔ مگر آج کل تو ہر لڑکی اپنا حق جانتی ہے۔ میں نے تو دس سال پہلے اپنی مرضی کا قدم اٹھالیا تھا۔ ابو راضی نہیں تھے۔ مگر شمشاد مجھے پسند تھا۔ میں نے اپنی پسند سے شادی کرلی۔ تب بھی یہ فیصلہ بہت مشکل تھا۔ مگر میں نے ہار نہیں مانی۔ شمشاد سے شادی کے بعد بہت میں نے مشکل حالات دیکھے۔ کوئی آسائش، کوئی راحت مجھے میسر نہیں تھی۔ مگر یہ اطمینان حاصل تھا کہ شمشاد میرا ہے۔ وہ میرے سوا کسی اور کا نہیں ہے۔

کئی دن گزر گئے۔ بے بی کام پر نہیں آئی۔ مجھے بہت مشکل پیش آرہی تھی۔ کالج کے لیے نکلنے سے پہلے ناشتا بنانے اور کچن سمیٹنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ بے بی تھی تو کالج سے واپسی پر صاف ستھرا گھر اور کھانا تیار ملتا تھا۔ کپڑوں کی دھلائی اور گھر کی صفائی تو کئی ماہ سے میری ذمہ داری نہیں رہی تھی۔ اب یہ سب مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ چاروناچار کر رہی تھی۔ مگر موڈ آف ہی رہتا۔ شمشاد کی جاب بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ زیادہ وقت گھر پر ہی گزارتا۔ اسے کہا، بے بی کا پتا کرو۔ مگر شمشاد کو اس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ بظاہر اس کی غیر حاضری کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ مگر مجھے لگتا تھا، ضرور اس معاملہ میں گوگے والی بات بھی شامل ہے۔ ایک بار خیال آیا، بے بی کے باپ کو بے بی اور گوگے کے میل ملاپ کی خبر ہو گئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس کے باپ نے بے بی کو کام پر آنے سے روک لیا ہو۔ پھر فوراً سوچا کہ کہیں بے بی گوگے کے ساتھ بھاگ نہ گئی ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ بے بی ایک ڈرپوک لڑکی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

چار ماہ بعد اچانک بے بی مجھ سے ملنے میرے کالج آگئی۔ میں اسٹاف روم میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے سرخ رنگ کا کڑھائی والا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ ہاتھوں پر مہندی اور نئی نویلی دلہنوں جیسا رنگ روپ۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں بے بی؟" میں نے اسے گلے سے لگالیا۔

"میری شادی ہو گئی باجی!" اس نے شرما کر کہا۔

"ارے واہ! مبارک ہو۔ کس سے کی شادی؟" میں نے خوشدلی سے پوچھا۔

"گوگے سے۔" اس نے شرما کر دھیمی آواز میں گوگے کا نام لیا۔ پہلے بہت بے تکلفی سے گوگے کا نام لیا کرتی تھی۔

"ابا مان گئے؟"

"جی باجی! بڑی مشکل سے منایا گوگے نے۔ منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے۔ پاؤں پڑ گیا۔"

"یہ سب گوگے نے؟" میں حیران رہ گئی۔

"جی باجی! پان چھوڑ دیے۔ تمبا کو چھوڑ دیا۔ ناچ دیکھنا بند کر دیا۔ اتنے مہینے بس یہی کیا گوگے نے۔" اس نے بہت معصومیت سے کہا۔

"اور اگر ابا نہ مانتے تو؟"

"کیسے نہ مانتا۔ ابا جیسے کہتا رہا گوگا کرتا رہا۔ پھر کیوں نہ مانتا ابا؟" بے بی نے قطعیت سے کہا۔

"بے بی! ایک بات بتاؤ۔ اگر تمہارے ابا پھر بھی راضی نہ ہوتے تو... تم اپنی مرضی سے شادی کر لیتیں؟" میں نے پوچھا۔

"اپنی مرضی سے؟ اماں ابے کے بغیر؟" وہ بولی۔

"ہاں! اماں ابا کے بغیر؟" میں نے کہا۔

"نہ... توبہ... نہ باجی" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"تم گوگے کے بغیر رہ لیتیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"پتا نہیں بعد میں گوگے کے بغیر رہ لیتی یا نہیں مگر آپ مجھے بتاؤ۔ عید پر آپ کو اپنے ابو یاد نہیں آتے؟ شب برات پر دل نہیں چاہتا کہ آپ کی امی نئے کپڑے

جوتے لے کر آپ کے گھر آئیں؟"

پتا نہیں بے بی نے کیا کچھ کہا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ مجھے تو گیلی آنکھوں سے اس کا چہرہ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دس سال بعد اس نے آئینہ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ میں اپنا چہرہ اس میں صاف دیکھ سکتی تھی۔ گوگے نے پان تمباکو' ناچ سب چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ بے بی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دس سال پہلے میں نے شمشاد کے لیے اپنے ماں باپ' بہن بھائی' گھر بار سب چھوڑ دیا۔ شمشاد بھی میرے باپ کو منا سکتا تھا۔ ابو کی تو کوئی شرط بھی نہیں تھی۔ انہیں شمشاد کی بے روزگاری اور لاابالی پن پر اعتراض تھا۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ شمشاد کی ڈھنگ کی کوئی جاب ہو جائے۔ قدم جم جائیں تو پھر ہماری شادی ہو۔ میں ابو جی کی دعاؤں سے رخصت ہوتی تو ہر عید' شب برات پر اپنی بانہوں میں سر چھپا کر نہ رویا کرتی۔

"تم خوش تو ہو ناں؟" میں نے ان پڑھ لڑکی سے پوچھا۔

"بہت خوش باجی!" اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"اللہ کرے! ہمیشہ خوش رہو۔" میں نے اسے دعا دی۔ "میرے گھر کام کرو گی؟"

"نہیں باجی!" اس نے انکار میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"گوگے نے منع کر دیا ہے۔" وہ بولی

"کام کرنے سے منع کر دیا ہے یا میرے گھر کام کرنے سے منع کیا ہے؟"

"آپ کے گھر کام کرنے سے منع کیا تھا۔ اسی لیے میں پھر آپ کے گھر نہیں آئی۔" اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

"کیوں؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"اس دن آپ نے مجھے جو بات بولی تھی کورٹ مرج والی۔ ابا کے بغیر شادی والی۔ وہ میں نے گوگے کو بتائی تھی۔ وہ بہت غصہ ہوا۔ کہنے لگا' جو تمہیں ایسی غلط بات بتائے' الٹا راستہ دکھائے' اس کے گھر نہیں جانا۔"

"غلط بات؟ الٹا راستہ؟" میں ششدر رہ گئی۔

"جی باجی! گوگا کہتا تھا' ہم شادی کریں گے تو گھر والوں کی خوشی سے۔ ورنہ گھر سے بھاگ کر اپنی مرضی سے کورٹ مرج نہیں کریں گے۔" ردی کاغذ چننے والے لڑکے سے مجھے یہ توقع نہیں تھی۔

"اب تو وہ مجھے کسی کے گھر بھی کام کرنے نہیں دیتا۔ کہتا ہے' وہ پہلے سے زیادہ محنت کرے گا۔ زیادہ کمائے گا اور مجھے گھر بٹھا کر کھلائے گا۔" بے بی نے مجھ سے کہا۔ اس کے لہجے میں وہ طمانیت تھی جو کسی لیکچرار کو نصیب نہیں تھی۔ مجھے ٹیچنگ پسند ہے۔ میں اپنے شوق سے کالج میں پڑھاتی ہوں۔ مگر میرا بھی دل چاہتا ہے کہ شمشاد کمائے اور میں گھرداری کروں۔ دس سال میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میں ہی کماتی رہی ہوں اور وہ بھی دو مہینے' کبھی چار مہینے ملازمت کرکے پھر گھر بیٹھ جاتا ہے۔

"باجی! یہ چوڑیاں اور بالیاں میں واپس کرنے آئی تھی۔" اس نے پرس سے نکال کر آرٹیفیشل چوڑیاں' بالیاں مجھے پکڑا دیں۔

"یہ تو تمہاری ہیں۔ مجھے کیوں دے رہی ہو؟ میں نے تو تمہیں نہیں دیں۔" میں حیرت زدہ تھی۔

"صاحب جی نے دی تھیں۔" اس نے ایک لمبا سانس لیا اور میرے سانس کی ڈوری کو توڑتی ہوئی چل دی۔

"یہ بات بھی میں نے گوگے کو بتا دی تھی۔" اس نے دروازے میں رک کر کہا۔ پیچھے مڑ کر مجھے دیکھے بغیر وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے ہر ہر رشتہ صرف اس زعم میں تیاگ دیا تھا کہ شمشاد صرف میرا ہے۔ اور آج اپنے اس زعم کے ملبے پر میں تہی داماں کھڑی تھی۔

☆

عظمیٰ افتخار

ساحلوں کا جہاں اور

"امی! ہم ماموں کے ساتھ نہیں جائیں گے۔" سامعہ ناراض چہرہ لیے ماں کے سامنے کھڑی تھی۔

"گرمیوں کی چھٹیوں میں سے دو ہفتے اور سردیوں کی چھٹیوں میں سے چند دن وہاں مہمان بن کر رہنا اور بات ہے اور ہمیشہ کے لیے جانا بالکل الگ بات ہے۔"

کچھ دیر پہلے بڑے ماموں ضیا حسن کا فون آیا تھا۔ ماموں کی بات سننے کے لیے سامعہ نے اسپیکر کا بٹن دبا دیا تھا اور اب ان کی بات نے سامعہ اور اس سے چھوٹی منائل دونوں کو دکھی کر دیا تھا۔ دونوں کے لیے بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں کا گھر ایسا ہی تھا جیسے ایلس کے لیے ونڈر لینڈ۔ خوب کھانا، پینا، کھیلنا، سونا۔ وہاں ہر چیز کی بہتات تھی اور ہر چیز سیروں کے حساب سے تھی۔ جبکہ ارفع اس ونڈر لینڈ سے بہت پہلے باہر آ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بڑے ماموں کوئی ایسی ہی بات کریں گے، اس لیے وہ چاہتی تھی کہ امی، ماموں سے اکیلے میں ہی فون پر بات کر لیں۔

"سامعہ! تم کیوں امی کو پریشان کر رہی ہو۔ اگر تم اس طرح امی سے ضد باندھو گی تو منائل جو ہر بات میں تمہیں کاپی کرتی ہے، وہ بھی ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کرے گی۔" ارفع نے نرمی سے بہن کو سمجھانا چاہا۔ ارفع کی نسبت سامعہ مزاج کی تیز تھی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی اور آج کل تو وہ ویسے ہی ہر بات پر شدید ردِ عمل کا اظہار کرنے لگی تھی۔

"امی! سامعہ آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم واقعی بڑے ماموں کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ آپ نے سنا نہیں، وہ کیا کہہ رہے تھے؟" منائل بھی سامعہ کے برابر میں آ کھڑی ہوئی۔

"یہی کہ ارفع سیکنڈ ایئر کر چکی ہے۔ آگے پرائیویٹ پڑھ لے گی۔ پھر بس اس کے بیاہ کا سوچنا ہے۔ آگے سامعہ اور منائل بھی ہیں۔" سامعہ نے منائل کی بات کاٹ کر ماموں کا کہا ایک ایک لفظ تلخ لہجے میں ادا کیا تھا۔

"امی! ہم کیا کسی پر بوجھ ہیں؟" منائل کا لہجہ معصومیت لیے ہوئے تھا۔ وہ چھٹی کلاس میں تھی اور اتنے بڑے کرہ ارض پر اس کا ننھا سا وجود بوجھ ہے یا نہیں، وہ ماں سے یہ بات جاننا چاہتی تھی۔

"تمہارے ماموں کے گھر جا کر رہنا اب ہماری مجبوری ہے۔ کیونکہ تمہارا باپ مر چکا ہے۔" سعیدہ کی بات پر منائل کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ ماں کے لفظوں کی کاٹ سہہ نہ پائی اور روتی ہوئی اندر چلی گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ روتی ہوئی منائل کو چپ کرانے کے سو جتن کرتیں۔ مگر ابھی انہوں نے اسے جانے دیا تھا۔

"میں کیسے تم تینوں کی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہو سکتی ہوں؟" سعیدہ نے باری باری اب ارفع اور سامعہ کا چہرہ دیکھا۔ سامعہ کے چہرے پر ابھی تک ناراضی کا تاثر تھا۔ جبکہ ارفع اب ماں کے برابر میں بیٹھ چکی تھی اور آہستہ آہستہ ان کا کندھا سہلا رہی تھی۔ گویا لمس کی زبان میں انہیں تسلی دے رہی تھی۔

"لوگ کیا کہیں گے کہ دو، دو ماموؤں کے ہوتے ہوئے بیوہ بہن اور اس کی بچیاں بے آسرا پڑی ہیں۔ ہمیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے سبب پیدا کر دیا۔ میں کئی راتوں سے پریشان تھی کہ جانے اب کیا ہو گا۔ خدا نے میری عبادت کی لاج رکھ لی ہے۔ تو تم لوگ بے کار کی باتیں کر رہی ہو۔ ہمیشہ اپنی ساری ضیاء بھائی کسی دن بھی آ جائیں گے۔" سعیدہ چڑ کر غصے میں بڑبڑاتی اندر والے کمرے میں چلی گئیں۔

"ارفع آپی! آپ کیوں خاموش رہیں؟ آپ نے میرا اور منائل کا ساتھ کیوں نہ دیا؟ اب ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک ہو گا جو قصے کہانیوں، فلموں اور ڈراموں میں ہوتا ہے۔ بیوہ بہن، یتیم بھانجیاں، دو وقت کی روٹی اور سارے گھر کا کام۔"

سامعہ کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔ ارفع نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ سامعہ کے دائیں پہلو سے ذرا سے آگے ہو کر ماں کو اندر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کھڑکی سے اندر کا منظر نمایاں تھا۔ وہ سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسے پتا تھا اب امی آرام سے سو جائیں گی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے پریشان تھیں کہ اب زندگی کا سبب کیا ہو گا؟



☆ ☆ ☆

"بابا! یہ امی اتنے طویل سجدے کیوں کرتی ہیں؟" ارفع نے مسکراتے ہوئے بابا کے آگے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ پیش کیا۔ وہ اکثر دیکھا کرتی تھی۔ تہجر کی نماز کے فوراً" بعد بابا کو چائے پینے کی طلب ہوتی تھی مگر امی کی نماز ہی ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اور وہ بے چارے بنا چائے پیے ہی دکان کھول کر بیٹھ جاتے تھے کہ لوگ صبح صبح ناشتے کے لیے اکثر انڈے' ڈبل روٹی' یا پاپے لینے کے لیے آتے تھے۔ تب خاموشی سے بابا کو اچھی سی چائے پلانے کی ذمہ داری ارفع نے لے لی تھی۔ کیونکہ ناشتے تو وہ' دس بجے کے قریب کرتے تھے۔ وہ ماں کی نسبت باپ سے زیادہ قریب تھی۔ اس لیے اپنے سارے سوال وجواب بھی بابا سے کیا کرتی تھی۔ امی نے اس کے سیدھے سوالوں کے جواب بھی کبھی نہ دیے تھے۔ اور بابا اس کی لایعنی باتوں پر بھی کبھی برہم نہ ہوتے تھے۔ وہ ان کی پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ ذہین' سمجھ دار اور خیال رکھنے والی۔

"شاید وہ اللہ سے کوئی پھر سبب مانگتی ہو۔"

"سبب؟" ارفع نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

"ہاں! سبب... مجھے احساس ہے' میں اس کی ساری خواہشات اور خواب پورے نہیں کرپایا... کیاپتا اسے بھی احساس ہو۔"

وہ ایک لمحے کے لیے دل گرفتگی کے حصار میں آتے اور اگلے ہی لمحے درختوں کی کھوہ میں چاول کے ٹوٹے' چینی اور آٹا ملا کر ڈالنے لگتے... ساتھ ساتھ کہتے بھی جاتے۔

"رازق۔ رازق تو ہی رازق..."

سلطان رحیم کی خوبصورت آواز اس کے کانوں میں پڑتی تو وہ بھی ان کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملائے جاتی۔

منابل نے اس کی سمت کروٹ لی اور پیر اس کے اوپر رکھ دیا۔ وہ ایک دم چونک کر اپنے خیالات سے باہر آئی۔ نائٹ بلب کی مدھم سی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور وہ باپ کی یادوں کے ساتھ کسی گزرے ہوئے اجلے دن میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے منابل کی ٹانگ احتیاط سے اپنے اوپر سے ہٹائی۔ وہ رات کو روتے روتے سوئی تھی۔ اب تک اس کے پپوٹے سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔ منابل کے سرہانے اشفاق صاحب کی کتاب "بابا صاحبا" دھری تھی۔

وہ آہستگی سے اٹھی اور اسی مدھم سی روشنی میں اپنے نوٹ پیڈ پر کتاب میں پڑھی ہوئی لائنیں نوٹ کرنے لگی۔

"تائی پیدھو نے کہا۔ میں جوانی میں بیوہ ہوگئی۔ چار بچوں کا بوجھ' نہ کام' نہ کار۔ میں نے دو روپے کے کاغذ پر اللہ سے شراکت نامہ کرلیا کہ کام میں کرتی جاؤں گی۔ فکر میری جگہ تو کرتے جانا۔ اس نے رضامندی کرلی۔ جب سے اب تک ہمارا شراکت کا کاروبار بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔"

قلم کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ بھی حرکت میں تھی۔ کیا خوب ایمان اور تقویٰ کا عالم تھا۔

☆ ☆ ☆

فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس نے بستر چھوڑ دیا تھا۔ اسے لگا' اس کی پلکیں جڑی ہی نہ تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بابا اسے روز جگاتے تھے اور وہ کسمساتے ہوئے دوبارہ تکیے کے اندر منہ چھپائے جاتی تھی۔

"ابھی اٹھتی ہوں بابا!" اس جملے کی گردان اتنی ہی سرعت سے بلند ہوتی چلی جاتی تھی۔ جتنی ان کے اٹھانے کی شدت...

"واہ بیٹا! واہ... رات کو اقبال کو دہراتی ہو...

"اک تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں"

اور صبح ہوتے ہی مکر جاتی ہو...

"کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں! نیند تمہیں پیاری ہے"

اور اس شعر کے ساتھ ہی اس کی باہم مضبوطی سے جڑی پلکیں پٹ سے یوں کھل جاتیں گویا وہ سوئی ہی نہ تھی۔ اسے لگتا' اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے بندے سے اک پیار بھرا شکوہ کیا ہو۔ شکوہ تو محبت کی علامت ہوتا ہے اور اللہ کی یہ محبت کی حرارت' بابا کے توسط سے اس تک پہنچتی اور وہ جاگ جاتی۔ بابا مسجد جاتے جاتے اسے ہدایت کرجاتے کہ اپنی باقی دونوں بہنوں کو بھی جگادینا۔

"بابا۔" اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔ وہ شفقت کا ہیولا کہیں گم ہوگیا تھا۔ اس نے دونوں چھوٹی بہنوں کو جگایا۔ وہ دونوں کسمسا کر بالکل اسی کی طرح تکیوں اور لحاف میں منہ چھپانے لگیں۔

جانے کیوں چھپنے کا عمل ڈھونڈنے سے مشروط ہوتا ہے اور کسمسانے کا ہاتھ لگانے اور جگانے سے۔ آج اسے جگانے والے ہاتھ نہ تھے تو وہ کسمسانا بھول گئی تھی۔

وہ کمرے سے نکل آئی۔ واش روم کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنی ماں نظر آئی۔ سجدے میں گری گریہ وزاری کرتی ہوئیں۔ سردیوں کی طویل راتیں بھی ان کے لیے طویل نہ ہوتی تھیں۔ وہ ماں سے قریب نہ تھی مگر اسے اپنی ماں کی آنکھوں میں دکھ' دعا' التجا' شکوہ سارے رنگ نظر آجاتے تھے۔ اس لیے وہ ان آنکھوں میں کم ہی دیکھا کرتی تھی۔ وہ یعنی ارفع سلطان فقط اٹھارہ سال کی تھی۔ اسے لگتا تھا زندگی میں جتنے رنگ اس نے دیکھے ہیں۔ شاید ہی کسی کی آنکھ نے کھوجے ہوں گے اور جتنے موازنے اس نے کیے ہیں' شاید ہی اس کے ہم عمر اس سے آشنا ہوں۔

باہر کی دنیا میں' خواب' خواہش' رنگ' خوش بو اس کا آنچل پکڑنے کی کوشش کرتے تھے' بلکہ اسے گمان غالب تھا کہ اس کے کزنز کے بیگز سے تو تتلی اور جگنو بھی نکلتے ہوں گے۔ آئی فون' آئی پیڈ' ٹیبلٹ' جدید کیمرے' جدید موبائل' کمپیوٹر' نت نئے ڈریسز اور اسٹائلش سی اسٹیشنری۔ شکر تھا کہ اس نے پہلے گورنمنٹ کے اسکول اور پھر گورنمنٹ کے کالج میں پڑھا تھا۔ جہاں سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ کی عمارتوں پر ہوئے پیلے رنگ و روغن کی طرح۔ اور گھر کی دنیا... دو کمرے... دو کمروں کے درمیان ایک لمبی راہداری اور اس راہداری کو بھی کمرے کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا تھا اور وہیں ٹی وی بھی دیکھا جاتا تھا۔

راہداری میں سے ہی ایک راستہ کچن اور واش روم کی طرف جاتا تھا۔ باہر ایک چھوٹا سا صحن تھا اور صحن میں ہی بابا کی دکان کے لیے چھوٹا سا اندرونی دروازہ تھا۔ اسے لگتا تھا' بابا کی دکان کے ناپ تول اور پیمائش کے اوزان اور ترازو گھر کے اندر بھی فٹ ہوگیا تھا۔

جس کمرے میں بیٹھنا ہے' بس وہیں کی بتی جلانی ہے۔ سردی کے دو جوڑے اور گرمی کے دو... سیل میں تلاش کیے ہوئے کپڑے' جوتے' سوئیٹر اور بیگ۔ عید بقر عید پر بننے والے اچھے کپڑے احتیاط سے اٹھا کر سوٹ کیس میں رکھ دیے جاتے۔ خاندان بڑا تھا اور تقاریب کے مواقع بہت' کبھی عقیقہ' کبھی سالگرہ' کبھی شادی... وہ اچھے کپڑے جس طرح نکالے جاتے' اسی قرینے سے واپس اپنی جگہ پر چلے جاتے۔

پٹز' کوکیز' کیک' پیسٹریز' میکرونی' پاستا' براؤنیز ان کی زندگی کا حصہ نہ تھے' بلکہ ان کی جگہ پاپے' باقر خانی' نمکین بسکٹ... یا پھر بہت ہوا تو ان کی ماں ہی کبھی پتیلے میں چین رکھ کر کیک بنادیتی تھیں...

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور واش روم کی طرف جانا چاہا کہ ماں کی آواز آئی۔

"بیٹا ارفع! باہر صحن کی لائٹ بند کردو۔" آنسو میں ڈوبی آواز۔

یقیناً" اس کی ماں خدا سے ایک بار پھر مورل سپورٹ مانگ رہی تھیں۔ ماموں کا فون آنے کے بعد اب انہیں ماموں کے آنے کا انتظار تھا۔ جس گھر میں وہ بیاہ کر گئی تھیں' اب اسے خیرباد کہنا تھا۔

ارفع صحن میں آئی تو سردی کی لہر نے اسے کپکپانے پر مجبور کردیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں بغلوں میں دابے اور آگے بڑھ کر صحن میں جلتے انرجی سیور کا سوئچ آف کیا۔ یکلخت اندھیرا پھیل گیا کہ سورج ابھی نکلا نہ تھا۔ مگر اس کی ماں کے نزدیک اب مزید اس بلب کو

جلانا عیاشی کے مترادف تھا۔
وہ نماز کے لیے جائے نماز پر کھڑی ہوئی تو سامعہ اور مناہل بھی اس کے برابر میں آکھڑی ہوئیں۔
وہ تینوں بالترتیب اٹھارہ، سولہ اور تیرہ سال کی تھیں۔
مگر زندگی نے انہیں اسی، ساٹھ اور تیس کا کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"رات کافی دیر تک تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی رہی۔" وہ ماں کو چائے دینے آئی تو انہوں نے پوچھا۔
"جی امی۔۔۔ وہ میں پڑھ رہی تھی۔" ارفع اتنا ہی کہہ کر چپ ہوگئی۔
"آج کل تو تم کالج نہیں جارہیں، پھر اتنی دیر تک لائٹ جلا کر پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بجلی کے نرخ تو آسمان کو چھو رہے ہیں۔"
ارفع نے چپ چاپ سن لیا۔ وہ ماں کو کیا بتاتی کہ رات بھر اس کا قلم چلتا رہا۔۔۔ وہ جلد از جلد مسودہ مکمل کرکے آج ہی پوسٹ کرنا چاہتی تھی۔ مگر رات اس کے لفظوں میں روانی نہ تھی۔ وہ کئی بار اٹکی۔۔۔ سنبھل سنبھل کر لکھتی رہی کہ ہر بار بابا اس کو گائیڈ لائن دیتے تھے۔
قلم میں روشنائی ختم پر تھی اور لکھنے کے لیے بھی چند ہی صفحے بچے تھے۔ وہ جلدی میں کمپیوٹر شیٹ نکال لائی اور اسی پر لکھنے لگی جو اپنے پروجیکٹ کے لیے سنبھال کر رکھی تھی۔ ہر بار کی طرح پہلے رف رجسٹر پر اور پھر خوش خطی سے لکھنے کا اس کے پاس وقت نہ تھا۔ نئے نکور کاغذ پر پہلی بار ہی درست لکھنا۔۔۔ مشکل کام تھا۔ مگر وقت اسے ہر راستے سے آشنا کرتا جارہا تھا۔
وہ جانتی تھی، جب وہ صبح اٹھے گی تو اس کی ماں کیلنڈر پر ایک اور کراس کا نشان لگادیں گی۔ ماموں نے صرف ایک فون پر اکتفا کرلیا تھا۔۔۔ نہ اب تک خود آئے تھے اور نہ رضا ماموں کو بھیجا تھا اور نہ ہی تقویت دینے کے لیے روپے۔ چاہے چند سو ہی سہی۔
اس نے لفافے میں ایڈیٹر کے لیے ایک خط بھی لکھ کے رکھا تھا کہ کہانی کا اعزازیہ جلد از جلد بھیج دیا جائے۔ اگلے ماہ پر موقوف نہ کیا جائے اور ساتھ اپنی مجبوری کا تذکرہ۔ اسے یقین تھا، لکھے گئے مکمل ناول کے اتنے پیسے تو مل ہی جائیں گے کہ مہینے کا آخر بہت تنگی سے نہ گزرے۔
"چلو! تم دونوں تیار ہوجاؤ۔ اسکول نہیں جانا کیا؟" اس نے سامعہ اور مناہل کو مخاطب کیا۔ سامعہ میٹرک میں تھی اور مناہل چھٹی جماعت میں۔ اور وہ خود انٹر پری میڈیکل کا امتحان دے کر فارغ تھی۔ ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا۔ جو بابا کی زندگی کے بعد مشکل لگتا تھا۔ مگر وہ اب تک اپنے خواب سے دست بردار نہیں ہوپائی تھی۔
"جلدی کرو۔۔۔ میں تم دونوں کو چھوڑ کر آؤں گی۔"
ارفع نے دونوں کو تیزی سے ناشتا کرنے کا اشارہ دیا۔
"تم۔۔۔ تم کیوں جاؤ گی دونوں کو چھوڑنے؟ میں جاؤں گی۔ تمہارا باپ مرا ہے۔ ماں ابھی زندہ ہے۔"
"اف۔۔۔" اس نے زور سے آنکھیں میچی تھیں، تاکہ اس جملے کے کرب کو اندر ہی اتارے۔ وہ کہہ نہ سکی کہ امی! آپ عدت میں ہیں۔ اور شاید کچھ لمحوں کے لیے سعیدہ بھی یہ بات بھول گئی تھیں۔
"امی پلیز۔۔۔ شمسہ باجی ابھی اپنے اسکول جانے کے لیے نکلیں گی۔۔۔ یہ دونوں بھی ان کے ساتھ چلی جائیں گی۔ مجھے نانا ابو سے کچھ کام ہے۔ پھر کالج کی لائبریری کی کتابیں بھی واپس کرنی ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی کالج چلی جاؤں گی۔"
ارفع نے ماں کو پوری بات سے آگاہ کیا۔ شمسہ باجی کے سسر کو ارفع، سامعہ اور مناہل تینوں، نانا ابو کہا کرتی تھیں۔ ارفع کے بابا سلطان رحیم بھی اپنے ہر کام میں نانا ابو سے مشاورت لیا کرتے تھے۔ ارفع کو یقین تھا، وہ اسے بھی یقیناً کوئی اچھا مشورہ ہی دیں گے۔
"پر بیٹا! لوگ کیا کہیں گے۔ چھوٹا سا محلہ ہے۔ باتیں بنتے دیر نہیں لگتی۔۔۔ اور اگر تمہارے بڑے ماموں آگئے تو؟" سعیدہ کے ادھورے جملے میں انجانے خدشات تھے۔
"ہونہہ۔۔۔ لوگ۔" یونیفارم میں ملبوس سامعہ نے طنز سے سر جھٹکا۔ ارفع نے ایک نظر سامعہ کو دیکھا اور پھر ماں کے کندھے پر تسلی سے ہاتھ رکھتے ہوئے سلیقے سے دوپٹا اوڑھنے لگی۔
وہ اپنی ماں کی آنکھوں میں اکثر دیکھتے ہوئے اجتناب برتتی تھی۔ اسے لگتا۔۔۔ اگر سامعہ، مناہل اور خود اس کی جگہ تینوں بیٹے ہوتے۔۔۔ تو ماں کی آنکھوں کی جوت جو ماند پڑتی جارہی تھی، اس میں ان بیٹوں کو دیکھ کر کوئی کوندا تو لپکتا۔
سرو کے درخت کی طرح قد نکالتی بچیاں۔۔۔ روز افزوں مہنگائی اور باپ کا سایہ نہ ہونا۔۔۔ اس کی ماں کوئی اتنی بوڑھی تو نہ تھیں۔ فقط اڑتالیس سال کی عمر۔۔۔ اور بہت بوڑھے تو اس کے بابا بھی نہیں تھے۔ مگر پھر بھی چپکے سے آنکھیں موند گئے۔
سامعہ اور مناہل کے ساتھ گھر کی چوکھٹ کو پار کرتے ہوئے اس کے دل کو کسی نے زور سے مسلا تھا۔ ابا کی کریانے کی دکان بیس دن سے بند پڑی تھی۔ وہ دکان جسے وہ چاہ کر بھی ایک بڑے جنرل اسٹور میں نہ بدل پائے تھے جب ہر روز بڑھتی مہنگائی نے ان کے شانے جھکانے شروع کردیے تھے تو اس کی ماں نے سلائی مشین سنبھال لی تھی۔
پچاس پچاس روپے بچانے کے لیے وہ اجرت پر آنے والی چھوٹی چھوٹی فراکوں کو خود ترپائی کرتی اور بٹن ٹانکتی تھیں۔ اس نے اکثر اپنی ماں کو انگلیوں کی پوروں کو دباتے دیکھا تھا۔
"چلیں ارفع آپی۔۔۔ اسکول سے دیر ہورہی ہے۔" مناہل نے ارفع کو ہلایا۔ اس نے چونک کر سر جھٹکا اور باہر کے راستے پر قدم بڑھادیے۔

☼ ☼ ☼

"سعیدہ! اپنا اور بچیوں کا سارا سامان باندھ لو۔ کل میں رضا کو بھیجوں گا۔ وہ تمہیں اور بچیوں کو آکر لے

جائے گا۔ ڈیلر کو میں نے گھر اور دکان دکھا دی ہے اور اسے بتا بھی دیا ہے کہ یہ گھر اور دکان رینٹ پر دینی ہے۔ وہ جلد ہی کرائے دار لے آئے گا۔ گھر اور دکان کا جو بھی مناسب کرایہ بنے گا' وہ تم لوگوں کو ملتا رہے گا۔ یوں تمہارا اور بچیوں کا خرچ چلتا رہے گا۔ ارفع سیکنڈ ایر کے پیپر دے چکی ہے۔ اب وہ پرائیویٹ پڑھ لے گی کہ سامعہ اور منابل کی تعلیم کا خرچا ہی بہت ہو گا۔ ابھی تو دونوں پیدل چلی جاتی ہیں۔ مگر میرے گھر آنے کے بعد تو ان کے اسکول کا فاصلہ بہت بڑھ جائے گا۔۔۔ ظاہر ہے کہ وین لگانی پڑے گی۔ کہاں وہ شہر کے مرکز میں موجود گھر کہاں یہ مضافاتی علاقہ۔۔۔ اور پیٹرول اور سی این جی کی جو صورت حال ہے' وہ تم بھی جانتی ہو گی۔ مگر میں نے اور رضا نے سوچ لیا ہے کہ ہم باری باری تمہاری ذمہ داری سنبھال لیں گے۔ ایک مہینے کا خرچا وہ برداشت کرے گا اور ایک مہینہ کا خرچا میرے ذمے ہو گا۔ آخر کو ان تینوں کا بیاہ بھی پھر ہماری ہی ذمہ داری ہو گا۔ اوپر تلے کی تین بیٹیاں ہیں تمہاری۔۔۔ کوئی بیٹا ہوتا تو بات بھی تھی۔"

بڑے بھائی ضیاء بلا تمہید کے کہتے چلے گئے۔

"شکر مانو سعیدہ! کہ تمہیں ایسے بھائی ملے ہیں' جو تمہارا اتنا خیال رکھ رہے ہیں۔ ارے! آج کل تو اپنی اولاد کا بوجھ اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ کجا کہ پرائی اولاد پالنا۔" ساحرہ ممانی نے ضیا ماموں کی بات آگے بڑھائی۔

عاصم' ضیا ماموں کا بیٹا اپنے آئی فون سے کھیلنے میں مگن تھا۔ وہ اٹھا اور کچن میں چائے بناتی ارفع کے پاس چلا آیا۔

بڑے ماموں اور ممانی کا کہا ایک ایک لفظ بنا کسی رکاوٹ کے' دو قدم کے فاصلے پر بنے کچن میں موجود ارفع کے کان میں پڑ رہا تھا۔ شیشے کی نازک سی چائے کی پیالیاں دھوتے ہوئے اس کا ہاتھ کئی بار کانپا۔ وہ اور احتیاط سے پیالیاں دھونے لگی۔ دل ٹوٹ جائے یہ تو عام سی بات تھی' مگر پیالیاں ٹوٹ جاتیں تو نقصان کون بھگتتا۔

سعیدہ خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھی بھائی بھاوج کی بات سن رہی تھیں۔ وہ جو کہہ رہے تھے حقیقت تھی۔ اس چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں رشتوں کی جمع' تفریق' ضرب' تقسیم جاری تھی۔ شہر کی زندگی میں انہیں بس مہینے کے آخر میں ہی کبھی کبھار تنگی و مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر اب شاید یہ گردن ہمیشہ جھکی رہنے والی تھی کہ احسانوں کا بوجھ شاید ہر بوجھ سے بھاری ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"میرا آئی فون فائیو دیکھا ہے؟ کیسا زبردست ہے۔ بڑی اسکرین ہے اس کی۔ آئی او ایس' اپ گریڈڈ ہے اور ڈسپلے تو کمال کا ہے۔"

عاصم کچن کے سلیب پر چڑھا ارفع کے سامنے اپنے آئی فون کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ ارفع کی توجہ اس کے آئی فون کی طرف نہ تھی۔ اسے بس یہ خیال تھا کہ وہ یہاں سے اٹھ کر چلا جائے تو وہ دودھ کا چھوٹا سا ساشے پانی میں گھول کر چائے میں شامل کرے۔ ورنہ وہ اس پر ہنستا' اس کا مذاق اڑاتا۔ اس نے عاصم کی طرف سے تھوڑی سی پیٹھ موڑ لی۔

"یہ فون پاپا نے میری برتھ ڈے پر دیا تھا۔۔۔ انہیں دینا ہی تھا۔ میرا او لیول کا رزلٹ جو اتنا شان دار آیا ہے۔" عاصم فخر سے اترایا' پھر مزید گویا ہوا۔

"بلکہ پاپا نے تو مجھے اے لیول کرنے کے لیے لندن بھیجنے کا بھی پورا انتظام کر لیا تھا۔۔۔ مگر یار! یہ پھوپھا کی ڈیتھ نے سارا کام خراب کر دیا۔"

چائے کی پیالیاں ٹرے میں سیٹ کرتے ہوئے ارفع کا ہاتھ ایک بار پھر کانپا۔۔۔ اس نے عاصم کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ مگر اس کے بابا' سلطان رحیم کی موت کا یوں تذکرہ کر رہا تھا' جیسے بجلی کی لوڈشیڈنگ کے باعث کچھ کہہ رہا ہو۔

"اب تم تینوں ہمارے گھر رہنے آجاؤ گی۔ تم لوگوں کی لیونگ' اسکولنگ' ایٹنگ' وین اب سب ہمارے گھر سے ہو گا۔۔۔ تو مما نے منع کر دیا کہ اگر پاپا میرے باہر جانے کے ایکسپینسز اٹھائیں گے تو تم لوگوں کو کیسے لک آفٹر کریں گے۔ ایٹ لیسٹ مرنے والے پرسن کو اپنے بچوں کے لیے کچھ تو چھوڑ کر جانا چاہیے نا' تاکہ وہ دوسروں پر بوجھ نہ بنیں۔ تھینک گاڈ! میرے پاپا کا تو اپنا بزنس ہے۔"

اردو' انگریزی کی ملاوٹ سے آلودہ' عاصم کی فراٹے سے چلتی زبان۔۔۔ ارفع یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ پھر عاصم کے چہرے پر ساحرہ ممانی کا چہرہ اگ آیا۔

سال بھر پہلے کی بات تھی۔ جب ارفع نے اردو تقریری مقابلے میں صوبے بھر میں اول انعام جیتا تھا۔

"لو! یہ بھی کوئی مقابلہ ہوا۔۔۔ اردو میں تو ہر کوئی اول آسکتا ہے۔ میرا عاصم تو انگلش ڈیبیٹ جیت کر آتا ہے۔ اردو زبان تو اسے آتی ہی نہیں۔"

ساحرہ ممانی کے لہجے میں آنچ دیتا غرور تھا۔ ارفع نے سوچا' ممانی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ عاصم کو واقعی اپنی زبان نہیں آتی تھی' یہ تو کسی پرائے کی زبان تھی۔ یا پھر عاصم بھی ان اپنوں میں شامل تھا جو ماریں بھی تو چھاؤں میں ڈالتے ہیں۔۔۔ لیکن کیا جو تکلیف اپنوں کے کہے لفظوں سے روح میں اترے' وہ چھاؤں ملنے پر ڈھل جائے گی؟

ارفع نے ذرا سا سر اونچا کر کے کچن سے ذرا پرے کمرے میں جھانکا۔ سعیدہ اب تک بھائی بھاوج کے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

چائے ابل ابل کر پتیلی میں کم ہوتی جا رہی تھی' اس نے پانی میں دودھ کا ساشے کھول کر حل کیا اور چائے میں شامل کر دیا۔ عاصم اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور اگر اب وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا بھی تو ارفع کو پروا نہ تھی۔ تین دن پہلے جو سوال سامعہ نے اس سے کیا تھا' آج اس کا جواب وہ عاصم کی باتوں میں کھوج چکی تھی۔

"لوگ کیا کہیں گے؟" یہ سوچ کر وہ اپنی چھوٹی سی زمین اگر دوسرے کے حوالے کر دے گی تو آسمان میں اپنا ستارہ کیونکر تلاش کرے گی۔

سامعہ ٹھیک کہتی تھی' ماموں کا گھر ان کے لیے صرف ایلس کا ونڈر لینڈ تھا۔ اگر وہ تینوں اس ونڈر لینڈ کو اپنا گھر سمجھنے کی کوشش کریں گی تو ان کا بھی وہ ہی حال ہو گا' جو قصے' کہانیوں' فلموں اور ڈراموں میں یتیموں کے ساتھ ہوتا دکھایا جاتا ہے۔

ماموں' ممانی اور عاصم کو چائے پیش کرتے ہوئے وہ بہت آسودہ اور مطمئن تھی۔ ماموں کی باتوں کے خوش دلی سے جواب دیتی رہی۔ عاصم کے آئی فون فائیو کو ہاتھ میں لے کر خود بھی اس کے فیچرز دیکھے اور پھر کھلے دل سے آئی فون کی تعریف کی۔ فیصلے کے لیے ایک ہی لمحہ کافی ہوتا ہے اور وہ لمحہ اس کی زندگی میں بھی در آیا تھا۔

تائی پیدھو کی طرح اس بار اس نے بھی خدا سے شراکت نامہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بس اسے اپنی ماں کو اس بار سبب کے بجائے مسبب الاسباب کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ پھر اسے یقین تھا کہ وہ بڑے ماموں کو خود لوٹا دیں گی۔

☼ ☼ ☼

اور اگلے دن پورے محلے نے دیکھا' سلطان رحیم کی کریانے کی دکان پھر سے کھلی ہوئی تھی۔۔۔ مگر اس بار دکان کھولنے والا سلطان رحیم نہیں' بلکہ ارفع سلطان تھی۔ اس نے گلے پر شمسہ آپا کے سسر کو بٹھایا ہوا تھا۔۔۔ جن کو وہ صرف نانا ابو کہتی ہی نہیں' سمجھتی بھی تھی اور خود ان سے ذرا پیچھے کرسی اور ایک چھوٹی سی میز رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ جس پر اس کا لکھنے کا سامان بھی تھا' ترازو اور باٹ بھی۔۔۔ کہ توازن کی پیمائش تو اسے بچپن سے آتی تھی۔ جب پرائیویٹ ہی تعلیم حاصل کرنی تھی تو اپنی چھوٹی سی زمین کیا بری تھی۔



رشکِ حبیبہ



وہ بہت خوب صورت وادی تھی۔۔۔۔ تازہ گلابوں کی مہک سے معطر فضا دور اوپر گھٹاؤں سے ڈھکے آسمان میں کسی سیاہ بادل کے پیچھے سے جھانکتا سورج ۔۔۔۔ اور اس کی آنکھ سے پھوٹتی شرارت کی کرنیں دور تک سنہرا رنگ بکھیر رہی تھیں۔۔۔۔

سر پہ اڑتے سفید پرندوں کے منظم غول سے بے نیاز میں پاؤں تک آتی کاسنی فراک پہنے نرم مخملیں گھاس کی چادر پہ ننگے پاؤں چلتے ہوئے گلابی ربن لپٹی ٹوکری میں رنگین گلاب اکٹھے کر رہی تھی۔

زرد، سفید، سرخ، گلابی، نارنجی۔۔۔۔

"اف! گلاب کے اتنے نایاب اور خوب صورت رنگ۔۔۔۔"

فرطِ مسرت سے میرے لبوں کی گلابی پنکھڑی کھل کر گلاب ہوئی جا رہی تھی۔ میں کسی شہزادی کی طرح اس دلفریب وادی میں سیر و تفریح کا لطف اٹھا رہی تھی۔ چلتے چلتے میں تھک کر نیلے شفاف پانی کی جھیل کنارے آ بیٹھی۔ جھیل میں تیرتی نارنجی، آسمانی اور سیاہ، سفید مچھلیاں آپس اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ان کے چکنے چمکیلے بدن پانی کی شفاف سطح سے دکھائی دیتے بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے پانی میں اپنا ہاتھ ڈبویا۔ پانی ہلکا ٹھنڈا تھا۔ میرے ہاتھ سے خوفزدہ ہو کر وہ چمکیلے بدن والی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھرکتی، پھدکتی آگے چلی گئیں۔ میں نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور ہتھیلی کی اوک میں پانی بھر کر چھپاک سے منہ پر دے مارا۔

"اللہ جی۔۔۔۔!" میری چیخ بے ساختہ تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

بستر، تکیہ، چہرہ، کاندھے اور میرے بالوں کی لٹیں ۔۔۔۔ سب کو پانی کی بوچھاڑ نے بھگو دیا۔

"اف۔۔۔۔!" میں اپنے چہرے سے پانی جھٹکتی ابھی تک بدحواس تھی اور ایک مدھری ہنسی نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

"دفعہ ہو جاؤ بدتمیز یہاں سے۔" میں نیند سے اٹھائے جانے کی بوکھلاہٹ پہ قابو پا کر اب سامنے کھڑی زرمین کو خونخوار نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ناولٹ



"اتنی مشکل سے تو ادھر آنے کی اجازت ملتی ہے۔ اس پر بھی تم کہتی ہو دفع ہو جاؤں۔" وہ ہنسی سمیٹ کر قدرے تلخ ہوئی۔ میں نے یک بہ یک اپنے غصے پر چار حرف بھیجے۔

"تو میں کون سا تمہیں دھکے دے کر نکالنے لگی ہوں مگر قسم سے اتنا خوب صورت خواب تھا لیکن تمہاری اس فضول حرکت سے چکنا چور ہو گیا۔" میں نے مصنوعی تاسف سے سر ہلایا اور وہ رائٹنگ ٹیبل پر خالی گلاس رکھتی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

یکایک اس کا چہرہ اچانک خزاں رسیدہ شاخ سے ٹوٹے زرد پتے کی طرح بے رنگ سا ہو گیا۔

"تمہیں پتا ہے زیب! میری آنکھیں بند ہوتی ہیں تو ایک رستہ دکھائی دیتا ہے... سنسان رستہ... اس رستے پر کوئی چاپ نہیں ابھرتی... کوئی آہٹ نہیں ہوتی... دھول نہیں اڑتی... اس رستے پر کوئی نہیں آتا... میں منتظر آنکھوں سے اس وقت تک بیٹھی رہوں گی جب تک کہ کوئی شہزادہ اس طرف نہ آ نکلے اور میری آنکھیں سیراب نہ ہو جائیں... میرے لیے خوب صورت خواب یہی ہو سکتا ہے کہ میری اجاڑ شخصیت کو سنوارنے والے مسیحا کی چاپ اس کی آہٹ مجھے سنائی دینے لگے اور میری آنکھیں اس کے دیدار سے آراستہ ہو جائیں۔" وہ بولتے بولتے اداس ہو گئی۔

"پتا نہیں بھئی... ایسی بے رنگ سوچیں تمہاری ہی ہو سکتی ہیں۔" میں ہاتھ سے بال سنوارتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں... ایسی بدرنگی صرف میرے ہی وجود کے لیے ہے۔ تمہارے لیے تو ہر طرف رنگ ہیں کیونکہ تم نے ہمیشہ پھولوں کی نرمی محسوس کی ہے۔ تمہاری سماعتوں میں ہمیشہ محبت کا رس ٹپکا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں اشک نہیں، جگنو چمکتے ہیں..." وہ یاسیت بھرے لہجے میں کہتی آبدیدہ ہونے لگی۔

"زری...!" میں بے اختیار اس کے قریب آئی۔ وہ جھکی پلکوں میں نمی چھپانے کی سعی کر رہی تھی۔ مجھے پتا تھا وہ اتنی حساس کیوں تھی۔ شاید اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو اتنی ہی حساس ہوتی۔

میں نے اسے اپنے بیڈ پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس نے بے دردی سے آنکھیں مسل ڈالیں۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی؟" سب جاننے کے باوجود میں نے پوچھا۔

"اچھا تم حلیہ درست کر کے آؤ پھر بتاتی ہوں۔" زرمین نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے مجھ پر بھرپور نظر ڈالی... اس کی مسکراہٹ مجھے اپنے حلیے کی بے ترتیبی کا احساس دلانے لگی۔ میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔



نرم و نازک، خوب صورت پرکشش سراپا اور غلافی آنکھوں والی زرمین دو مہینے قبل ہی میرے پڑوس میں آئی تھی۔ پھر دوستی ہونے میں وقت نہ لگا۔ وہ لوگ اپنے گھر کی تعمیر کی وجہ سے چند مہینوں کے لیے کرائے کے گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔

جاوید انکل پرائیویٹ جاب کرتے تھے۔ زرمین کے دو بڑے بھائی تھے اور وہ اکلوتی بہن اور بیٹی تھی۔ اس کے دونوں بھائی پڑھے لکھے برسر روزگار تھے یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مالی لحاظ سے وہ لوگ اچھے خاصے مستحکم تھے۔ پھر بھی زرمین کی شخصیت عجیب سی تھی۔ مجھے پتا نہیں کس چیز نے زرمین کی طرف اس قدر مائل کیا کہ میری اور اس کی گاڑھی چھننے لگی۔ وہ بہت محتاط سی تھی۔ اس کی کوئی دوست نہ تھی۔ وہ کہیں آتی جاتی بھی نہ تھی۔ پہننے اوڑھنے اور فیشن کے معاملے میں بھی بے نیازی سی تھی۔ مجھے لگتا تھا اسے زندگی سے دلچسپی نہیں۔ حالانکہ محض بیس برس کی عمر میں ایسی بھی کیا آدم بے زاری؟

میں اس سے دو برس چھوٹی تھی مگر اتنی بھی نا سمجھ نہ تھی کہ اس کی ذات کا پراسرار پردہ مجھے تجسس آمیز الجھن سے دوچار نہ کرتا۔

میں نے اس کی شخصیت کا اسرار کھوجنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کے نزدیک ہوتی گئی۔ محض دو برس کا فرق ہم دونوں کی دوستی میں کوئی دیوار نہ کھڑی کر سکا۔ وہ مجھے اپنی ہر بات بتانے لگی۔ جیسے تیار بیٹھی ہو کہ کوئی پوچھے تو "تم ایسی کیوں ہو؟" اور وہ اپنے دل کا ہر پہلو الٹ پلٹ کر دکھا دے۔

وہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی اور دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی مگر اس کے باوجود اس کے بھائیوں نے اسے میٹرک کے بعد پڑھنے نہ دیا۔ اس کو کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے کپڑے ڈھیلے ڈھالے تھیلے نما ہوتے تھے۔ وہ میک اپ نہیں کر سکتی تھی۔ غرض ہر طرح کی رنگینی اس کے لیے ممنوع تھی... اتنی پابندی آخر کیوں؟

میں نے جب اس سے یہ سوال کیا اس کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

"انہیں میری خوب صورتی سے ڈر لگتا ہے۔"

"ہیں؟" میں الجھ گئی۔

"انہیں لگتا ہے کہ میں... میں ان کی عزت... میں اپنے خوب صورت چہرے سے..." وہ بات کا مفہوم سمجھانا چاہ رہی تھی۔ میں تھوڑا بہت سمجھ جانے کے باوجود اس سے سننا چاہ رہی تھی۔

"وہ میری لاابالی عمر اور... اور میری خوب صورتی سے ڈرتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے میں... میں فتنہ ہوں۔" وہ متزلزل لہجے میں لڑکھڑاتے اعتماد سمیت رو دینے کو تھی اور میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

"تم کہو۔ میری شکل خوب صورت ہے تو اس میں میرا قصور ہے؟" میں جھلا کر بولی تو پھر وہ خود کو روک نہ سکی اور رو پڑی اور مجھ پر یہ عقدہ اس روز کھلا کہ اگر قریبی رشتوں سے اعتماد اور بھروسے کی چادر نہ ملے تو جذبات و احساسات یتیم ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کوئی راہ چلتا بھی ہمدردی کے بول بول دے تو ہم اپنے جذبات و احساسات اس کی جھولی میں ڈال کر ان کی کفالت اس راہ چلتے کے ذمے کر دیتے ہیں۔ جیسے زرمین نے اپنے سارے جذبات و احساسات میرے سامنے ڈھیر کر دیے اور میں نے بخوشی ان کی کفالت شروع کر دی۔

پھر چاہے اپنی امی کی کسی معمولی ڈانٹ کے باعث نکلنے والے دو قطرے آنسو ہی کیوں نہ ہو۔ زرمین میرے ہی کاندھے پر سر رکھ کر بہاتی... اور میں اسے دلاسے، تسلیوں سے بہلا لیتی۔

اس معصوم کے لیے میں اور کر ہی کیا سکتی تھی سوائے جذباتی سہارا اور طفل تسلیاں فراہم کرنے کے۔

امی، بابا، شاہ زمان اور میں... میرا چھوٹا سا خاندان اور ڈھیر ساری خوشیاں... یہ تھی میری متاع حیات اور کل کائنات۔ شاہ زمان دسویں اور میں گیارہویں جماعت میں زیر تعلیم تھی۔ ہم دونوں ہی امی، بابا کے لاڈلے تھے۔ مجھے میرے گھر سے ملے اعتماد، بھروسے اور اعتبار کی مضبوط ڈھال نے ہمیشہ بہت سہارا دیا۔

بابا بہت نرم و حلیم طبیعت شخص تھے۔ امی جان بھی روایتی سی والدہ تھیں... تھوڑی نرم، تھوڑی گرم۔ شاہ زمان گھر میں سب سے چھوٹا نٹ کھٹ اور بے حد شرارتی لڑکا تھا۔ ہم دونوں گھر میں خوب ہنگامہ مچائے رکھتے۔

کبھی کوئی ڈش ٹرائی کرتے اور کچن میں بری طرح تباہی مچانے پر خوب عزت افزائی کرواتے۔ کبھی کسی کارٹون موی سے لطف اٹھاتے اور کبھی کرکٹ سے گھر کے صحن میں دھما چوکڑی مچاتے۔ محلے کے چھوٹے بچے بھی ہمارا خوب ساتھ دیتے... مگر عمر بڑھتی ہے تو مشاغل بھی موسموں کی طرح تبدیل ہونے لگتے ہیں... ہمارے شوق بھی شکل تبدیل کرنے لگے... اور سارے معصوم مزے قصہ پارینہ بن گئے۔

مجھے لگتا تھا زمان مصروف رہنے لگا ہے اور اسے لگنے لگا مجھے وقت نہیں ملتا۔

صبح کالج، دن کی نیند، شام کی کوچنگ اور رات گئے تک پڑھائی، گھر کے بکھیڑے... مجھے واقعی وقت کم ملتا تھا اب اور جو تھوڑی بہت فراغت میسر آتی اسے میں زرمین کی سنگت میں گزارنا پسند کرتی۔ پھر شاہ زمان اپنی مصروفیات میں مگن ہو گیا اور میں زیادہ تر زرمین

کے گھر آنے جانے لگی۔ اس کے گھر میں دوپہر میں کوئی نہیں ہوتا تھا' ماسوائے اس کی والدہ اور اس کے ۔۔۔ لہٰذا امی کے علم میں لا کر میں اس کی طرف چلی جاتی۔

میری امی کو وہ بہت پسند تھی۔ شریف' ڈری' سہمی' خوب صورت سی لڑکی کتنی حیادار تھی کہ ماں باپ کے سامنے نگاہیں نہ اٹھاتی تھی اور جب میں نے امی سے اس کی باتیں شیئر کیں تو وہ اور متاثر ہو گئیں۔

میں بس کسی طرح اس کو اس اذیت بھرے محبوس ماحول سے آزاد کروانے کی خواہش مند تھی۔

زرمین اور میرے گھر میں آمد و رفت کا سہرا ہماری خاندانی شرافت و نجابت کے سر تھا۔ ہم لوگ اس محلے کے خاصے پرانے مکین تھے۔ اور یوں بھی ہمارے طور طریقے بہت محتاط اور شریفانہ تھے کہ زمان یا بابا جان کی غیر موجودگی میں کوئی مرد ہمارے گھر میں داخل نہ ہوتا ماسوائے وقت ضرورت کے ۔۔۔ لیکن زرمین جتنی پابندیاں مجھ پر نہیں تھیں۔ میری خواہشات' ضروریات اور فرمائشیں ہر چیز پوری ہوتی تھیں۔ مجھے گھر سے باہر کسی سے بھی کسی قسم کی جذباتی آسودگی حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

مگر زرمین کو تھی ۔۔۔ اور اب میں اس کی شکایتوں' پریشانیوں اور غموں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے تھکنے لگی تھی۔

میں زرمین کو اس رنجیدہ ماحول سے چھٹکارا دلوانا چاہتی تھی ہمیشہ کے لیے مگر کوئی راہ نہ نکل رہی تھی ۔۔۔ پھر ایک دن جب سورج مغرب کی حد میں پہنچا اور شام کے رخسار شفق رنگ ہوئے تو میرے پاس بہت دیر سے آئی بیٹھی زرمین جانے کا قصد کرتی اٹھ گئی۔

"میں چلوں گی اب۔ اماں نے کہا تھا ابا جی کے آنے سے پہلے لوٹ آؤں۔" وہ سر پہ دوپٹا درست کرتی باہر کی طرف بڑھی اور میں بھی پیچھے پیچھے پاؤں میں سلیپر اڑستی اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

زرمین دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ کھولا اور پھر جھجکتے ہوئے باہر نکلنے کے بجائے سر جھکا کر پیچھے ہو گئی۔ میں نے ذرا سی گردن اونچی کر کے اس کے پیچھے سے جھانکا۔ سامنے تنویر بھائی کھڑے تھے۔

"آ جائیں تنویر بھائی ۔۔۔" میرے کہنے پر وہ اندر آ گئے۔ میں نے سلام کرتے ہوئے دوپٹا سر پہ ڈالا۔

وہ خوش دلی سے جواب دے کر خیریت پوچھنے لگے میرے جواب دینے کے دوران زرمین جا چکی تھی ۔۔۔ نجانے کیوں مجھے لگا جیسے تنویر بھائی کی نظروں نے چوری چوری زرمین کا پیچھا کیا ہو۔

ہماری لائن میں ہمارے گھر سے دائیں طرف زرمین کا گھر تھا اور بائیں طرف تنویر بھائی کا ۔۔۔ وہ ایم سی ایس کرنے کے بعد بہت بہترین پوسٹ پر جاب کر رہے تھے۔ اکلوتے' خوبرو اور خاصے شرمیلے قسم کے تنویر بھائی مجھے بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھتے تھے۔ میں اور شاہ زمان ان سے اس لیے بے تکلف تھے کہ ہم دونوں نے ان سے ہوم ٹیوشن لی تھی۔ بعد میں ٹیوشن دینے سے معذرت کر لی تھی۔ اس طرح ہمارا ان سے باضابطہ تعلق تو بے شک ختم ہو گیا مگر پھر بھی وہ ہمارے گھر میں اور خاص کر میرے اور شاہ زمان کے لیے بہت محترم تھے۔

ابھی وہ شاہ زمان کا کمپیوٹر ٹھیک کرنے آئے تھے۔ وہ شاہ زمان کے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے آدھے ادھورے ضعیف اندازے پر الجھتی کو چنگ کے لیے تیار ہونے لگی۔ لیکن میرے اندازے کو درستگی کی سند بہت جلد مل گئی۔

میں نے بریانی بنائی تھی ۔۔۔ زرمین کے گھر پلیٹ بھر کر دینے کے بعد امی کے کہنے پر میں تنویر بھائی کے گھر بھی لے آئی۔ شاہ زمان میرے ساتھ آیا تھا۔ وہ تنویر بھائی کے کمرے میں چلا گیا اور میں آنٹی کے پاس لاؤنج میں آ گئی۔ وہ غالباً" ٹی وی دیکھ رہی تھیں میں نے پلیٹ دے کر واپس آنا چاہا تو انہوں نے زبردستی چائے کے لیے روک لیا۔

"زیب! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" میں لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ آنٹی کچن میں تھیں۔ جب تنویر بھائی میرے مقابل صوفے پر آ بیٹھے۔

میں حیران رہ گئی۔ وہ بہت کم گو تھے۔ ضرورت کے علاوہ کم از کم مجھ سے تو بات نہیں کرتے تھے مگر اب میرے مقابل آ بیٹھے تھے۔

"وہ کون تھی اس دن تمہارے گھر میں؟" ان کی نظریں ادھر ادھر تھیں۔ گویا وہ مجھ سے نگاہ ملانے سے کترا رہے تھے اور میں اتنی ہوشیار تو تھی کہ ان کا انداز بھانپ سکتی۔ چہرے پر پھیلی ہلکی سی خفت کی سرخی اور بے چارگی سے بھرپور انداز و آواز ۔۔۔

"کون زرمین؟" مجھے سمجھنے میں دقت کیسے ہو سکتی تھی۔

میرا نام لینا تھا کہ انہوں نے براہِ راست مجھے دیکھا۔ ان کے لبوں نے بہت آہستگی سے "زرمین" کے نام کو چھوا۔ میں ہولے سے مسکرائی۔

"ہاں ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ کون ۔۔۔ میرا مطلب تمہاری کون ہے؟"

وہ حد درجہ نروس دکھائی دے رہے تھے اور مجھے ان کو اس طرح دیکھ کر ۔۔۔ بہت لطف آیا ۔۔۔ اتنا سنجیدہ شخص اور اس قدر بے بسی ۔۔۔ میں دل ہی دل میں خوب ہنسی۔

"زیب! میری مدد کرو گی بہنا!" اب کے انہوں نے اس قدر لجاجت سے کہا کہ میں بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

میری دوست کے لیے نجات کا روزن وا ہو رہا تھا۔ مجھ سے زیادہ خوشی کسی کو ہو سکتی تھی بھلا۔

میں نے تنویر بھائی کی خواہش زرمین کے گوش گزار کی تو وہ گلابی پڑ گئی ۔۔۔ مجھے اندازہ لگانے میں دقت نہ ہوئی کہ "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔" کچھ دنوں تک میں زبانی پیغامات رسانی کرتی رہی۔ تنویر بھائی کو زرمین کے حالات کہہ سنائے' زرمین سے جا کر تنویر بھائی کی بے قراریاں اور بے چینیاں بیان کیں۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی کسی بہانے میں تنویر بھائی کی طرف چلی جاتی۔ کبھی وہ کسی بہانے آ جاتے ۔۔۔ لیکن پھر اس طرح مشکل ہونے لگی۔ میں کب تک ان کے گھر بہانے بہانے سے جاتی رہتی ۔۔۔ ان کے پاس بھی وجہ ختم ہونے لگی میرے گھر تک آنے کی۔ پھر مجھے بھی خفت ہونے لگی اور تنویر بھائی بھی ہچکچانے لگے تھے۔

کئی باتیں اس طرح کی ہوتیں جو وہ بے اختیار میرے سامنے کہہ جاتے اور میں سن کر سرخ پڑ جاتی ۔۔۔ مجھے بھی زرمین کے جذبات ان تک پہنچانے میں مشکل ہوتی ۔۔۔ ہم دونوں کے درمیان ایک انجانا سا گریز آنے لگا۔

اس کے پاس موبائل کا سوال ہی نہ تھا اور میرے پاس یہ سہولت تو تھی مگر موبائل پہ مکمل مالکانہ حقوق حاصل نہ تھے۔ سو اس حوالے سے میں زرمین کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔

ان ہی دنوں ایک روز دوپہر میں تنویر بھائی شاہ زمان کا پوچھنے گھر آئے۔ وہ گھر پہ اس وقت نہیں ہوتا تھا یہ بات انہیں اچھی طرح معلوم تھی۔ میں نے اندر سے ہی آواز لگائی "کون؟"

انہوں نے شاہ زمان کا با آواز بلند دریافت کیا پھر ذرا قریب ہو کر دروازے سے لگتے ہوئے بولے۔

"چھت پر آؤ ۔۔۔" میں نے امی کے غسل خانے میں ہونے کا اطمینان کیا اور چھت پر چلی گئی۔

انہوں نے ایک کاغذ پتھر میں لپیٹ کر چھت پر پھینکا اور اپنے صحن میں کھڑے تنویر بھائی نے اشارے سے مجھے وہ خط زرمین تک پہنچانے کو کہا ۔۔۔ اس خط میں حالِ دلِ عاشق کے علاوہ کیا ہوتا اور یوں ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کا رابطہ شروع ہو گیا۔

زرمین نے اس خط کا جواب لکھنا چاہا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے حسب توقع مجھ سے مدد مانگی۔ میں سو جان سے تیار بیٹھی تھی۔

میں نے اس کی کیفیت اور اس کے جذبات کی ترجمانی کرتا خط تحریر کر کے اس کے سامنے رکھا تو وہ ستائش سے مسکرائی۔

"واہ زیب!" اس کے کہنے پر میری گردن اکڑ گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اسے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں کر لے مگر وہ بے پروائی سے بولی۔

"چھوڑو نا یار۔۔۔ کون سا انہیں پتا چلے گا کہ تم نے لکھا ہے۔ ہینڈ رائٹنگ سے کیا ہوتا ہے۔ ویسے بھی میری لکھائی کتنی بے ترتیب ہے تمہیں معلوم ہے۔"

"تو تم نے کون سا نمبر لینے ہیں۔" میں کہنا چاہتی تھی مگر نجانے خاموش کیوں رہ گئی۔

اس کی ہینڈ رائٹنگ واقعتاً" خراب تھی۔ میں اگر ذرا بھی محتاط اور سمجھ دار لڑکی ہوتی تو ضرور اصرار کر کے اسے اس کی رائٹنگ میں خط لکھنے پر مجبور کرتی۔ مگر پھر میں زیب جہاں نہیں ہوتی کوئی سمجھ دار لڑکی ہوتی۔

یوں تنویر بھائی کے خطوط کا جواب میں تحریر کرنے لگی۔ زرمین کی زبان اور میرے قلم حرکت کرتے۔۔۔ پھر میں اپنی چھت سے رقعہ ان کے صحن میں پھینک دیتی اور وہ اپنی صحن سے میری چھت پر۔۔۔

تنویر بھائی بھی خطوط میں اپنا نام نہ لکھتے، نہ زرمین کو نام لے کر مخاطب کرتے۔ ان خطوط کا آغاز و اختتام محبت بھرے القابات پر ہوتا تو زرمین نے بھی یہ ہی روش اپنائی۔

تنویر بھائی کے سارے خطوط میری الماری میں رکھے تھے کیونکہ زرمین وہ سارے خطوط اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی تھی۔۔۔ اس کے بڑے بھائیوں کے مظالم کی داستان سن کر تو میں لاکھ لاکھ شکر کرتی کہ میرا کوئی بڑا بھائی نہ تھا اور یہ بڑے بھائی کتنی مضبوط ڈھال ہوتے ہیں بہنوں کے لیے، یہ عقدہ بھی مجھ پر بعد از وقت کھلا۔

زرمین اور تنویر بھائی کا معاشقہ زوروں پر تھا اور میں ہنوز ان کے بیچ نامہ بر کا کردار نبھا رہی تھی۔۔۔ اس بات سے قطعی بے نیاز کہ میرا یہ قابل اعتراض عمل میری اقدار کو کتنی ٹھیس پہنچا رہا ہے۔ میرے والدین کے اعتماد اور بھروسے کا خون کر رہا ہے۔

اس طرح کی بے ایمانیاں میں اگر اپنے لیے کرنے کا سوچتی تو ضرور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ میں ہزار ہا توبہ کرتی مگر وہ ہی بے ایمانیاں میں صرف ہمدردی کے نام پر زرمین کے لیے کر رہی تھی۔

مجھے تو بس زرمین کی مدد کا خیال ہے۔ وہ اتنی مشکل میں ہے۔ میرے ذرا سے تعاون سے اگر وہ خوش رہنے لگے تو مجھے کیا فرق پڑ جائے گا۔

دل کو بہلانے کے لیے میرے پاس بہت اچھے اچھے خیالات تھے۔۔۔

میں اس بات سے انجان نہیں تھی کہ میری آنکھ مچولی سے اب ارد گرد کے لوگ مانوس ہونے لگے تھے مگر چونکہ کوئی چور میرے دل میں نہیں تھا اس لیے میں بے پروا تھی۔ مجھے زمانے کا خوف نہ تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔ محض "نامہ بر" کو کس رسوائی کا خوف۔ زرمین کی مدد کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی میرے لیے۔ لیکن لوگوں کے لیے یقیناً" یہ بات قابل اعتراض تھی۔



رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا مگر نیند تھی کہ آکر نہ دے رہی تھی۔ رہ رہ کر زرمین کا سسکتا وجود میری نگاہوں میں گھوم گھوم جاتا اور میں نئے سرے سے بے چین ہو جاتی۔ تنگ آکر بستر چھوڑ دیا۔۔۔ کروٹیں بدل بدل کے پہلو دکھنے لگے تھے۔

تنویر بھائی کو اپنی فیملی کے ساتھ کسی رشتہ دار کی فوتگی میں اچانک شہر سے باہر جانا پڑ گیا۔ ورنہ آج کل میں وہ زرمین کے گھر نکاح کا پیغام بھیجنے والے تھے۔

ادھر زرمین کے بھائیوں نے اس کی شادی طے کر دی تھی اور زرمین کی جان پر بن آئی تھی۔ مگر تنویر بھائی کی غیر موجودگی نے مجھے بھی مفلوج کر رکھا تھا۔ بھلا میں کیا کر سکتی تھی سوائے پریشان ہونے کے۔۔۔

اس حد درجہ کی بے بسی نے مجھے بے چین کر چھوڑا تھا۔ میں کچھ دیر کمرے میں ٹہلتی رہی پھر سر درد کی گولی کی تلاش میں رائٹنگ ٹیبل کی دراز کھنگالنے لگی۔

گولی تو نہ ملی البتہ وہ سیاہ کور والی ڈائری مل گئی جو زرمین نے مجھے میری سالگرہ پر تحفتاً" دی تھی۔

میری زندگی کی وہی لگی بندھی عام سی کہانی تھی کوئی ایسی ٹریجڈی تھی نہ لو اسٹوری جو قابل تحریر ہوتی سو میں نے کبھی یہ ڈائری وغیرہ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

زرمین کی بات نہ میں امی سے شیئر کر سکتی تھی نہ بابا سے۔۔۔ ایسا تو خواب میں بھی سوچنا عبث تھا اور شاہ زمان سے لاکھ بے تکلف سہی، مگر بھائی بہن کی مخصوص جھجک آڑے تھی۔۔۔ میں وہ ڈائری لے کر بیڈ پر آ بیٹھی اور اپنے احساسات اس ڈائری میں بیان کرنے شروع کیے۔۔۔ روز اول سے لے کر ایک ایک بات، ایک ایک راز اور ایک ایک احساس۔۔۔

اپنے اندازے، مفروضے۔

زرمین کا خوف۔

تنویر بھائی کی بے اختیاری۔ غرض حرف حرف لکھ ڈالا۔

گدائے وقت کے ہاتھ میں رات کا آخری درہم باقی تھا جب میں نے قلم بند کر کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھا کر زور سے مروڑیں۔۔۔

ایک تواتر سے چیخ پیخ کی آوازوں نے کلمۂ احتجاج بلند کیا۔

ساری بھڑاس صفحات پہ نکالنے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

میں یوں ہی نیم دراز تھی۔ ذرا سی سر کھسکا کر مکمل دراز ہوئی اور ڈائری کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ یہ تمام روداد بالکل ایک افسانوی سا تاثر دے رہی تھی۔

افسانہ جس کے تین کردار۔۔۔

ایک مظلوم و بے بس لڑکی زرمین۔

ایک محبت کرنے والا شخص تنویر ابراہیم۔

اور ایک پُر خلوص، نیک نیت دوست زیب جہاں۔

کچھ ہی دیر میں میری بند پلکوں پہ نیند پورے طمطراق سے براجمان ہو گئی۔

میں پُر سکون سی نیند کی آغوش میں محو خواب تھی اور میرے سرہانے رکھی ڈائری کے کھلے صفحات کو ہواؤں کی انگلیاں تیزی سے پلٹ رہی تھیں۔۔۔ شاید اختتام خوش رنگ جاننا چاہتی تھیں مگر افسانہ ابھی نامکمل تھا۔



اس روز میں گھر پہ اکیلی تھی۔ امی جان خالہ امی کی طرف عیادت کی غرض سے گئی تھیں۔ مجھے بھی کہا تھا ساتھ چلنے کو مگر آج کل زرمین کو میری زیادہ ضرورت تھی۔ زمان اپنے دوستوں کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کے لیے گیا تھا مگر واپسی پر اسے خالہ کے گھر سے امی کو لیتے ہوئے آنا تھا۔

میں نے امی سے اجازت لے رکھی تھی سو ان کے روانہ ہونے کے بعد زرمین کے گھر آگئی۔ وہ مجھے سامنے پاتے ہی رو پڑی۔

وہ لوگ کل یہاں سے شفٹ کرنے والے تھے اور تنویر بھائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ انہوں نے دو چار دن کا کہہ کر ہفتہ بھر نکال دیا تھا۔ زرمین کی حالت واقعی قابل رحم تھی یا شاید میں نے ہی ضرورت سے زیادہ اس کے رنج کو حواسوں پر سوار کر رکھا تھا۔

اپنی امی کی وجہ سے وہ بالکل سرد و سپاٹ چہرہ بنائے ہوئے بیٹھی تھی جیسے بڑی مشکل سے خود کو کمپوز کر رہی ہو۔ میں نے بغور اس کا انداز ملاحظہ کیا اور تاسف سے سوچ کر رہ گئی۔

"کتنی گھٹن ہوتی ہو گی نا بے چاری کو۔۔۔ کس طرح آنٹی کے سامنے خود پہ جبر کر کے بیٹھی ہے۔"

میں شام کے سات بجے گھر آگئی۔ تھوڑی دیر بعد بابا بھی آگئے۔ میں چائے بنا کر چھت پر لے گئی۔ بابا بھی وہیں آگئے۔ میں چائے پی کر ٹہلنے لگی۔ منڈیر سے جھانکنے پر مجھے تنویر بھائی اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے نظر آئے۔ میں بے اختیار خوش ہو گئی۔

مگر افسوس کہ بابا موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد امی اور زمان بھی آگئے۔۔۔ اور میرا تنویر بھائی کے گھر جانا ناممکنات میں شامل ہو گیا۔

وہ بھی مجھے دیکھ چکے تھے۔

نہ جانے کیوں مجھے ان کی آنکھیں وضاحت دیتی ہوئی محسوس ہوئیں یا شاید پشیمان سی۔۔۔ میں سمجھ

نہیں سکی۔
جلے پاؤں کی بلی کی مانند میں یہاں سے وہاں چکراتی رہی مگر مجھے تنویر بھائی کے گھر جانے کا کوئی مناسب جواز نہ ملا۔
بارہ بجے تک میرے گھر کے تمام افراد اپنے اپنے بستر میں محوِ خواب تھے..... سوائے میرے۔
کل زرمین لوگ یہاں سے نقل مکانی کر جاتے اور محبت بھرا یہ افسانہ مجانے کتنے دنوں کے لیے التوا کا شکار ہو جاتا اور ایسے میں کہیں زرمین اپنے ساتھ کچھ کر گزری تو..... جیسا کہ اس نے مجھے کہہ رکھا تھا۔
"میں تنویر کے بغیر مر جاؤں گی۔ تم دیکھنا زیب..... میری شادی کسی اور سے ہوئی تو بہت برا ہو گا۔ تم میری شادی میں نہیں میری میت میں آؤ گی..... دیکھنا ایسا ہی ہو گا۔"
مجھے ہر صورت کوئی نہ کوئی امید کل ہی اس کے ہاتھ تھمانا تھی۔ اور اس کے لیے آج ہی تنویر بھائی سے بات کرنا ضروری تھا۔
"ایک کاغذ پر لکھ کر لے جاؤں گی..... ان کے گھر میں پھینک دوں گی۔ وہ یقیناً "پتھر گرنے کی آواز سے سمجھ جائیں گے کہ میں ہی ہوں۔" دل نے اس حرکت کو بالکل سہل دکھلایا۔
"اگر کسی نے دیکھ لیا تو..... رات کے اس وقت؟" دماغ نے سرزنش کی۔
"کوئی نہیں دیکھتا۔ اگر دیکھ بھی لے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ کون سا میں عشق جھاڑ رہی ہوں۔" دل نے اس حرکت کو بالکل جائز قرار دیا۔
"تمہیں خوف نہیں آئے گا..... رات کے اندھیرے سے ڈر نہیں لگے گا؟" دماغ نے دوسری طرف کا سکہ بھی دکھایا۔
"میرے لیے تو صرف رات اندھیری ہے۔ اس معصوم کی تو ساری زندگی اندھیر ہو جائے گی۔"
دل نے شدومد سے دلیلیں دیتے ہوئے دماغ کی ساری دلیلیں رد کر دیں۔
ساری سوچیں چھو ہو گئیں اور میں رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر خط تحریر کرنے لگی۔ یہ پہلا خط تھا جو میں اپنی طرف سے تحریر کر رہی تھی۔ زرمین کی طرف سے لکھے گئے خطوط میں وہ اپنا نام نہ لکھواتی تھی مگر اس خط میں نجانے کیا سوچ کر میں نے اپنا نام بھی تحریر کر دیا۔
شاید مجھے واقعی اپنے عمل پر کوئی پشیمانی اور ملال نہیں تھا۔ خط مکمل کر کے میں نے ایک بار متن پر توجہ دی۔

تنویر بھائی!
آپ کہاں رہ گئے تھے۔ آپ کے پیچھے زرمین کی شادی طے ہو گئی۔ کل وہ لوگ یہاں سے شفٹ کرنے والے ہیں..... زرمین کہتی ہے خودکشی اس کے لیے بہت مشکل نہیں ہے اگر جدائی مقدر بنی تو..... آپ مجھے بہن سمجھتے ہیں تو خدا کے لیے زرمین کی زندگی بچا لیجیے۔ وہ پہلے ہی کون سا زندوں کی طرح ہے..... آپ کو آپ کی اس محبت کا واسطہ جو آپ اس سے کرتے ہیں!"

آپ کی بہنا زیب

میں خط لے کر دبے پاؤں چھت پر پہنچی۔ ابھی میں کاغذ پتھر پر لپیٹ رہی تھی جب مجھے تنویر بھائی کے گھر میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے گردن اونچی کر کے ان کے صحن میں جھانکا تو وہ وہیں کھڑے ہماری چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غالباً" وہ میرے ہی منتظر تھے۔ مجھے یک دم اطمینان ہوا کہ تنویر بھائی بھی زرمین کے لیے اتنے ہی بے کل ہیں جتنی کہ زرمین۔

انہوں نے مجھے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ شاید ان کے پاس بھی خط تھا۔ میں پتھر میں لپٹے کاغذ کو بھیگتی ہتھیلی میں بھینچے منتظر کھڑی تھی۔ رات کی کالی آنکھیں لانبی گھنی پلکیں زور زور سے جھپکتی مجھے خوفزدہ کر رہی تھی مگر میں دل کڑا کیے کھڑی رہی۔
چند لمحوں نے زندگی کی بازی ہاری تو میرے قدموں میں کاغذ لپٹا پتھر آ گرا۔ میں نے بے تابی سے اٹھا کر اسے کھول لیا۔ وہ خط حسب سابق زرمین کو لکھا گیا تھا۔

"عزیز از جان!
مجھے یہ بتاتے ہوئے بے حد تکلیف ہو رہی ہے مگر تمہیں اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں..... میری پھوپھی مرحومہ کی بیٹی رباب سے میری شادی طے کر دی گئی ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح انکار کر سکوں مگر رشتوں کا پاس رکھنے کے لیے مجبوریوں کی زنجیر مجھے از خود پہننی پڑے گی۔ میں چاہ کر بھی ان زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتا..... مجھے بھول جاؤ..... تمہارے حق میں یہ ہی بہتر ہے میں کل واپس چلا جاؤں گا۔ اگلے ہفتے میری شادی ہے۔
ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا ورنہ ایسی کوئی بددعا دے دو جو مجھے بھی اس زبردستی کے بندھن سے آزاد کر کے موت کے حوالے کر دے۔ میں اتنا کٹھور نہیں کہ خودکشی کر کے اپنے ماں باپ کو تاعمر پشیمان و بے قرار چھوڑ جاؤں..... خدا حافظ!"
خط پڑھ کر میرے ہاتھوں سے جان نکل گئی۔ کاغذ میرے قدموں میں گرا۔
"زرمین کا کیا ہو گا اب؟" بڑا سا سوالیہ نشان میرے سامنے پھن اٹھائے کھڑا تھا۔ "وہ تو مر ہی جائے گی۔" دل نے سسکاری بھری۔
"صرف اس شخص کی وجہ سے۔" غصے کی آنچ تیز ہوئی اور دماغ کھول اٹھا۔
"ایسے مردوں کو تو جان سے ہی مار دینا چاہیے۔ پہلے اس کو اپنی محبت کے حسین خواب دکھا کر اس کی آنکھیں سجا دیں اور اب مجبوریوں کی درانتی سے سارے خواب اجاڑ دینے کے درپے ہے۔" دماغ پھر ابلنے لگا۔
"کچھ نہیں ہو سکتا اب۔ نہ تم انہیں جان سے مار سکتی ہوں نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہو۔ کھیل ختم ہو گیا۔" دل نے خود ترسی کی انتہا کر دی۔
"اتنی آسانی سے چھوڑ دوں؟" دماغ تڑخ گیا۔
"نہیں..... کم از کم کٹہرے میں تو گھسیٹوں گریبان تو کھینچوں، ملامت تو کروں، موردِ الزام تو ٹھہراؤں..... فردِ جرم تو سناؤں کچھ تو کروں جس سے بلکتے دل کو کچھ سکون میسر آئے۔"
میں نے ایک قہر بھری نظر ان پر ڈالی اور سرعت سے نیچے آ کر ایک پیپر پر فقط ایک سطر گھسیٹی۔
"مجھے آپ سے ملنا ہے ابھی۔"
اس وقت مجھے یاد تھی تو صرف زرمین۔ غصہ تھا تو صرف تنویر بھائی پر۔ اور پاس رکھنا تھا تو صرف اپنی پُرخلوص دوستی کا۔
میں وقت کا لحاظ بھول گئی۔ میں لوگوں کی عقابی نظریں بھول گئی۔
میں لوگوں کی تیز دھار زبانیں بھول گئی۔
میں نے اپنا لکھا پہلے والا خط ڈسٹ بن میں اچھال دیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔
میں ایک زوردار طمانچہ ان کے منہ پر مارنا چاہتی تھی۔ انہیں لعن طعن کرنا چاہتی تھی۔
میں نے وہ چھوٹی سی پرچی تنویر بھائی کے صحن میں پھینک دی۔ انہوں نے پڑھ کر بے یقین نظروں سے مجھے دیکھا۔ میرے چہرے پر بہت غضب ناک تاثر تھا۔ وہ پلٹ کر اندر گئے۔
"نہ ملنے کے لیے یہ وقت مناسب ہے۔ نہ ہی بات کرنے کو مزید کچھ باقی ہے۔" انہوں نے اس بار بال پین میں وہ چٹ رول کر کے بال پین میری طرف اچھال دیا۔
"آپ جواب دہی سے بچ نہیں سکتے۔ صبح آپ پھر چلے جائیں گے۔ مجھے آپ سے ابھی بات کرنی ہے۔" میں حتمی طور پر یہ لکھ کر کاغذ ان کے پیروں کے پاس پھینکا اور آگے بڑھ کر اپنی چھت کی منڈیر پھلانگ کر ان کے گھر کے کچن کی چھت پر اتر گئی۔
وہ بہت بے بسی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی چھت تھی تو نیچی مگر سیڑھیاں نہ تھیں اترنے چڑھنے کے لیے، سو مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ چھلانگ مارنی پڑے گی۔ درازی قد کے سبب وقت زیادہ نہ ہو گی مجھے یہ بھی اندازہ تھا۔
تنویر بھائی نے مجھے بچانے کی کوشش کی تھی۔ مگر پھر بھی میں لڑکھڑا کر گری۔ میں سنبھل کر کھڑی ہوئی۔

"تمہیں پتا ہے کتنی احمقانہ حرکت کی ہے تم نے۔" وہ دانت پیستے ہوئے مجھے گھور رہے تھے۔

"ہاں ہاں دانش مند تو آپ ہی بچے ہیں دنیا میں۔" میں پہلے ہی غصے میں تھی۔ انہوں نے چند لمحے مجھے قہربار نظروں سے گھورا۔ میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے خوفی سے دیکھتی رہی۔

"پاگل لڑکی.... کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔" وہ دبی آواز میں مجھے گھرکتے ہوئے کلائی سے پکڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف لے گئے۔ میں ان کے پیچھے گھسٹتی گئی۔

"بولو کیا بات ہے اور جلدی دفع ہو۔" انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا تنویر بھائی! وہ مر جائے گی۔"

میں نے وہ ساری باتیں ان سے کہیں جو خط میں تحریر کی تھیں۔ انہوں نے لب بھینچ لیے۔ رخ موڑ لیا۔

"تمہیں لگتا ہے مجھے تکلیف نہیں ہو رہی۔ میں خوش ہوں اس سب سے؟ مگر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ ماں باپ کا اکلوتا ہوں ان کی بات کا بھرم نہ رکھوں؟"

وہ بے بس تھے مگر میں ابھی بھی انہیں ملامتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"تم اب جاؤ زیب! چلو تمہیں پہنچا دوں۔" انہوں نے مجھے کلائی سے پکڑ کر دروازے تک لے جانا چاہا۔

"میں اتنی مشکل سے ادھر تک آئی ہوں۔ مجھے وہ لفظ بتا دیجیے جس سے یہ جان لیوا خبر زرمین کو کم سے کم تکلیف سے دوچار کرے۔ میں آپ سے تسلی بخش جواب لیے بنا نہیں جاؤں گی۔ مجھے آپ پر بھروسا نہیں۔" میں نے اڑیل پن دکھایا اور جم کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے ایڈیٹ!" وہ دھاڑ اٹھے غالباً" ان کی برداشت کی حد تمام ہو گئی تھی۔

گو کہ میں سہم گئی تھی۔ مگر ان کی اگلی بات بھی بہت اچھی طرح میرے چھکے چھڑا گئی۔

"میں آفس کے ضروری کام سے فقط ایک دن کے لیے ادھر آیا ہوں۔ گھر میں اس وقت مما پاپا کوئی نہیں ہیں.... اب خدا کے لیے چلی جاؤ یہاں سے۔"

اگرچہ وہ فوراً" ہی اپنی زوردار آواز قابو کر چکے تھے مگر ان کی پیشانی کے بلوں میں کمی نہیں آئی تھی۔

میں ایک لمحے کے لیے سُن سی رہ گئی اور اگلے ہی پل....



دروازے پر دھڑا دھڑ ہوتی دستک نے بھی زیب کے منجمد وجود پر اثر نہ کیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے زمین کو گھورتی مکمل طور پر غائب دماغ سی بیٹھی تھی۔ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے تنویر ابراہیم کرنٹ کھا کر اٹھا۔

اور وہی ہوا جس کی ایسے موقعوں پر توقع کی جا سکتی ہے۔

دروازہ کھولنے میں تاخیر ہوتی تو دروازے کے اس پار کھڑے لوگ دیوار پھاند کر اندر آنے میں دیر نہ لگاتے۔ ضرور کسی نے زیب کو اس کے گھر میں کودتے دیکھ لیا تھا۔ دروازے سے اندر آنے والے محلے کے چند محترم مکین تھے۔ کل تک ان محترم مکینوں میں زیب کے بابا کا بھی شمار ہوتا تھا۔ مگر آج زیب کی ایک غلط حرکت کی وجہ سے وہ سر اٹھانے کے قابل نہ تھے تو ان لوگوں کے ہمراہ اس گھر کی دہلیز کیا پار کرتے۔

ذلت' بدنامی' بدکرداری....

ہر طرح کی گندگی کا داغ زیب کی پیشانی کو داغ دار کر گیا۔

تنہا گھر میں ایک مرد کے ہمراہ درمیانی شب میں کسی نامحرم لڑکی کا برآمد ہونا....

ذلت کی کون سی پستی تھی جہاں سے زیب کو کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

اور تنویر ابراہیم.... وہ خجالت کے سبب کچھ بول ہی نہ پا رہا تھا۔

اس کی بند مٹھی سے آزاد ہو کر گرا وہ کاغذ جس میں تنویر نے زرمین کے لیے آخری پیغام لکھا تھا اور جو زیب تنویر ابراہیم کے منہ پر مارنے کی خواہش میں لے کر یہاں تک آئی تھی۔ جس میں تنویر نے زرمین کا نام کہیں نہیں لکھا تھا۔

اور صحن میں گری وہ چٹ' جس میں ان دونوں نے مختصر فقروں میں باتیں کی تھیں.... ہر چیز ان کے خلاف گئی.... تنویر کم اور زیب زیادہ.... مگر معتوب دونوں ٹھہرے۔

اب لوگوں کے ہونٹوں پر دھری انگلیاں بھی ہٹ گئیں۔ ہر کوئی اپنی آنکھوں دیکھی اشارے بازی اور خطوط کے لین دین کا منظر بیان کرنے لگا....

بے حیائی' دیدہ ہوائی' بے غیرت' بے دید.... کیا نہ گالیاں اس کے کردار سے نتھی کر دی گئیں۔

اسی وقت مولوی کو بلا کر ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔

وہ مر جانے کی' اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی' اپنے بے گناہی کا بیان دینے کی مہلت کی بھی حق دار نہ ٹھہری۔

تنویر ابراہیم کے چہرے پر بے بسی و لاچاری کی ایک داستان رقم تھی۔

بابا' شاہ زمان اور امی.... کوئی بھی تو نہ آیا تھا اس کے پاس.... وہ ادھر وہیں صوفے پر بیٹھی بیٹھی.... زیب جہاں سے زیب تنویر ابراہیم بن گئی۔



چوٹ بہت گہری تھی۔ درد بھی بہت شدید اٹھا تھا۔ وقت کے مرہم نے بھی اس کی تکلیف کم نہ کی تھی۔ چار سال گزر گئے.... مگر اس کے دل سے احساس زیاں نہ گیا۔ دل میں چبھی پھانس نے اسے کبھی آسودگی کا جام نہ تھمایا تھا۔

اپنے گھر والوں کا سوچتی تو ان کی بدنامی کا سارا بار اپنے کاندھوں پر محسوس ہوتا۔ زرمین کے بارے میں سوچتی تو خود کو اس کا بھی مجرم پاتی۔ تنویر کے بارے میں سوچتی تو وہ بھی مجبور و بے بس نظر آتا۔ غلطی اس کی بھی نہ تھی....

اور جس کی تھی.... وہ احساس ندامت کی چوٹ کھائے نہ جی پا رہی تھی نہ مر پا رہی تھی۔

تنویر بارہا اس سے محبت کرنے کا دعوا کرتا۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا.... اس کے دونوں بچے بہت پیارے تھے۔ سارا دن گھر ان کی شرارتوں سے کھنکتا....

اس کے ساس سسر بھی چند ماہ کی ناراضی کے بعد اسے اپنا چکے تھے.... پتا نہیں' انہیں زیب کی بے گناہی کا یقین آیا تھا یا وہ اسے معاف کر چکے تھے۔ جو بھی تھا وہ سب اب زیب کو عزت و احترام کی چھاؤں فراہم کر چکے تھے۔

مگر زیب اپنے ضمیر کا کیا کرتی.... وہ خود سے بھی آنکھیں ملانے سے کتراتی تھی....

کوئی جرم نہ ہوتے ہوئے بھی وہ قصوروار ٹھہری۔

لیکن نہیں.... جرم تو تھا اس کا۔

اس کی بے احتیاطی' اس کی بے وقوفی' اس کی غیر ضروری ہمدردی۔

"میں نے کیا کر لیا اپنے ساتھ؟" وہ راتوں کو سسک کر رو پڑتی۔ تنویر اس کی سسکیوں سے بے چین ہو کر اٹھ جاتا۔

"زیب پلیز! خدا کے لیے بھول جاؤ وہ سب۔" بانہوں میں لیے پیار سے کہتا تو وہ اور بے قابو ہو جاتی.... اور تنویر کا گریبان اس کے آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ وہ بھی بے بس تھا۔ پشیمان تھا.... مگر وقت کو موڑ نہیں سکتا تھا۔

چار سال بعد اس کے زندگی سے عاری وجود میں جیسے جان پڑ گئی۔ شاہ زمان اس کے گھر میں اس کے سامنے کھڑا تھا اور زیب کے وجود پر جما گلیشیر پگھلنے لگا۔

تواتر سے برستے آنسوؤں کی بھیڑ میں اس نے شاہ زمان کو اپنے نزدیک آتے دیکھا.... وہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر دلاسا دینے کے ارادے سے نزدیک ہوا اور زیب بے اختیار اس کے شانے پہ سر رکھے ہچکیاں بھرنے لگی۔ چار سال کا دکھ تھا۔

جدائی کا۔۔۔ بے اعتباری کا۔۔۔ بے بسی کا۔۔۔ ذلت کا۔۔۔ اتنی جلدی کیسے بہہ کر تمام ہو جاتا۔

"مجھے جسم کے کسی سڑے ہوئے حصے کی طرح کاٹ کر پھینک دیا تم لوگوں نے شاہ زمان! پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ مر گئی یا زندہ ہوں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ زبان پہ آٹھہرا۔ شاہ زمان نے اسے بہت مشکل سے سنبھالا۔ پھر اسے لے کر گھر گیا۔ بابا کی طبیعت بہت خراب تھی۔۔۔ وہ اسے بہت یاد کرتے تھے۔

وہ بلک بلک کر روئی۔

معافی مانگنے لگی تو بابا نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ امی نے آنسو اپنے آنچل سے خشک کیے۔ اس کی غلطی ضرور تھی مگر چار برس کی جدائی نے ان لوگوں کے سارے گلے دھو دیے۔

"میں تو آپ کی بیٹی تھی امی! آپ کی زیب تھی۔۔۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں ایسی ہو سکتی ہوں۔ آپ تو میری رگ رگ سے واقف تھیں۔" وہ گلوگیر لہجے میں ماں سے سوال کر رہی تھی۔

"ہر ماں اپنی بیٹی کی فطرت سے آگاہ ہوتی ہے۔ میں بھی تھی مگر میں اپنے یقین پر یقین نہ رکھ سکی۔ میں نے آوازِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھ لیا۔ زرمین کی ماں بھی اپنی بیٹی کے کرتوت سے واقف تھی اور میں بھی اپنی بیٹی کے باکردار ہونے پر۔۔۔ مگر وہ خاموش رہ کر جیت گئی اور میں خاموش رہ کر ہار گئی۔ زرمین ویسی نہیں تھی زیب! جیسی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی فطری آوارگی کے باعث ہمارے محلے میں آنے سے قبل دو دفعہ فرار ہو چکی تھی۔ اس کے بھائی ظالم نہیں تھے محتاط تھے۔ اس کو جبر و پابندی میں رکھ کر انہوں نے اپنی عزت کی حفاظت کی تھی زیب! یہ سب زرمین کی ماں نے اپنے دل کی خلش سے مجبور ہو کر ایک سال پہلے مجھے بتایا جب ہم وہ محلہ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ پھر سامان کی پیکنگ کے دوران مجھے تمہاری وہ سیاہ کور والی ڈائری ملی تھی تو میں اصل بات تک پہنچی کہ میری معصوم بیٹی تو مخلصی کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ پھر میں نے سب کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا مگر۔ مگر تمہارے بابا نے یقین نہ کیا۔ انہوں نے کہا اب لکیر کو پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں اور پھر۔۔۔ پھر زرمین لوگ بھی وہ محلہ چھوڑ گئے۔ ہم ایک بار پھر خالی ہاتھ رہ گئے۔ مگر اس چار سال کی جدائی نے ہمیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں معاف کر دو بیٹا! ہم کچھ نہ کر سکے تمہارے لیے۔"

امی نے محبت سے زیب کی پیشانی چوم لی۔ اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

گویا چار سال بعد اس کے ناکردہ گناہ کی سزا تمام ہو گئی تھی۔۔۔ مگر آج بھی وہ اپنا قصور سوچنے بیٹھتی ہے تو سوائے بے وقوفیوں اور کوتاہیوں کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن ان بے وقوفیوں اور کوتاہیوں نے اس کا بہت کچھ چھین لیا تھا۔۔۔ بہت کچھ!

☼ ☼ ☼

زیب ہفتے بھر سے اپنی امی کی طرف ٹھہری ہوئی تھی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اس نے نظریں موڑ کر دیکھا۔۔۔ اس کے دونوں بچے گہری نیند میں تھے اور بیڈ کے دائیں سرے پر اس کا وجود تلخ یادوں کے گھیرے میں تھا۔ اس نے بے چین ہو کر ڈائری اٹھالی اور سارے صفحات الٹ پلٹ کر ڈالے۔ چند لمحات کے توقف سے فیصلہ کن انداز میں قلم پر گرفت مضبوط کی اور ڈائری پر جھک گئی۔

زیب نے اس روداد میں ڈھیروں ترمیمات کیں جو اس نے چند سال قبل خود ہی رقم کی تھیں، پھر اس نے اس ادھورے نامکمل افسانے کو اختتام دیا۔ بقیہ کہانی تحریر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں کئی بار دھندلائی تھیں۔

رات اپنے آخری پہر میں کھڑی تھی جب اس نے روداد مکمل کر کے قلم بند کیا اور ایک گہری لمبی سانس لے کر ڈائری پر نظر کی۔

زخم زخم صفحات۔۔۔ زخم زخم زندگی۔۔۔

ڈائری ہنوز اس کی گود میں دھری تھی مگر اب افسانے کے تینوں کردار اپنی شکل بدل چکے تھے۔

زیب فطرتاً "مخلص" مگر حد درجہ بے وقوف اور کم عقل لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔

زرمین کی شخصیت سے اس کی خود ساختہ مظلومیت کا چولا اتر چکا تھا اور اندر سے برآمد ہونے والی لڑکی بہت بے حس و بے حمیت تھی۔

تنویر ابراہیم۔۔۔ فطرتاً محبت کرنے والا، مگر درحقیقت ایک عام سا سطحی مرد۔۔۔

بس عام سا سطحی مرد؟

"نہیں۔۔۔ تنویر کے کردار کی وضاحت اتنے کم لفظوں میں ممکن نہیں۔"

زیب نے کرب سے سوچتے ہوئے پلکیں موند لیں۔۔۔ ہوا کی انگلی نے تیزی سے پچھلے صفحات۔۔۔ موڑ دیے۔۔۔ کاغذ کے پھڑپھڑانے پر زیب نے آنکھیں کھول کر ڈائری کی طرف دیکھا۔

"وہ چار سال پیچھے تنویر ابراہیم کے گھر میں اس کے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی تھی۔۔۔

☼ ☼ ☼

"مجھے وقت کی نزاکت مت سمجھایئے۔ بہت ظلم کر رہے ہیں آپ تنویر بھائی۔۔۔ خود پر بھی اور اس پر بھی۔" میں نے ملامت کرتے ہوئے کہا تو وہ تڑپ گئے۔

"زیب۔۔۔ زیب پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ!" عاجزی سے کہتے وہ میرے مقابل گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھ گئے۔

"دیکھو! اسے سمجھانا۔ اسے کہنا مجھے بھول جائے اور جہاں اس کی شادی ہو رہی ہے وہاں دل لگا لے۔" انہوں نے میرے ہاتھ تھام کر بہت بے بسی سے کہا تھا۔

اس وقت مجھے ان کے مضبوط اور گرم ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکالنا یاد ہی نہیں رہا۔۔۔ شاید جذباتیت اتنی ہی زور آور ہوتی ہے کہ سب عقل سمجھ سلب کر لے۔

"تنویر بھائی۔۔۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے۔۔۔ کوئی راہ نکالیے۔ اس کا کیا ہو گا۔۔۔؟" میں کچھ اور کہتے کہتے رو پڑی۔ مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ میں زرمین کے جذبات کی ترجمانی ٹھیک سے نہیں کر سکتی اور آج بھی وہی کیفیت مجھے آنسو بہانے پہ مجبور کر رہی تھی۔

تنویر بھائی جو میرے سامنے بیٹھے تھے، بے قرار سے ہو کر تھوڑا اور نزدیک ہوئے۔ "زیب۔۔۔ زیب پلیز رو نہیں!" انہوں نے میرا چہرہ اپنی ہتھیلیوں کے کٹورے میں بھر لیا۔ میرے آنسو تواتر سے برسنے لگے تو ان کی انگلیاں بے اختیار میرے اشک سمیٹنے لگیں۔

اور شاید یہیں سے تنویر بھائی کے اندر کا روایتی مرد بیدار ہو گیا۔

میں روئے جا رہی تھی۔۔۔ پتا نہیں کس بات کے آنسو تھے، سامنے بیٹھے مرد کی انگلیاں ابھی بھی میرے رخساروں سے آنسوؤں کو سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ مگر اب شاید ان انگلیوں کا مقصد محض اشک سمیٹنا نہیں۔۔۔ بلکہ رخساروں کی نرمی محسوس کرنا تھا۔ ان انگلیوں کی تاثیر بدل گئی۔

صنفِ نازک، مرد کی نظر اور مرد کا لمس شناخت کرنے سے نہیں چوکتی۔

لمحے سے بھی پہلے میری چھٹی حس نے مجھے کلک کیا۔

میں بے اختیار رونا دھونا چھوڑ کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

ان کی شکل یکسر مختلف تھی۔ سامنے بیٹھا تنویر ابراہیم مجھے اندر اترتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ان کے گرم ہاتھوں کا لمس میری گردن سے ٹکرایا۔ میں جھٹکے سے اٹھی۔

وہ بھی سرعت سے میرے مقابل کھڑے ہوئے۔ میری کلائی بہت سخت گرفت میں تھی۔

"مجھے جانا ہے۔" میری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے۔

"چلی جانا۔" بے پروائی سے کہا گیا۔ میں ان کی گرفت میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

"پلیز!" میری لجاجت بھری آواز ان کی بے خودی پر بند باندھنے میں ناکام رہی۔

"بس تھوڑی دیر۔" میری مزاحمت بے کار گئی۔ وہ کچھ سُن ہی نہیں رہے تھے۔

"میں شور مچادوں گی۔" میں نے دھمکایا۔

"کیا کہوگی..... میں تمہارے گھر سے تمہیں یہاں اٹھا کر لایا ہوں؟" وہ ہنسنے لگے..... شیطانی ہنسی۔ میرے پاس جواب نہ تھا۔

"تنویر بھائی۔ میں واقعی شور مچادوں گی۔" میں نے پھر بے کار سی کوشش کی۔

"بات سُنو میری!" انہوں نے سخت لہجے میں کہتے مجھے زور سے جھٹکا دیا۔ میں منجمد ہو کر رہ گئی۔

"میں خود تمہیں گھر پہنچانے میں مدد کروں گا..... مگر تمہیں پہلے میری بات ماننی پڑے گی..... بس تھوڑی دیر بعد..... اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو ہم دونوں پکڑے جائیں گے..... یاد رکھو پھر کیا ہوگا..... تمہاری تو زندگی ہی تباہ ہو جائے گی۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا البتہ تم اور تمہارے گھر والے منہ چھپاتے پھریں گے۔"

وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہے تھے۔ انہیں سب بھول گیا تھا۔ زرمین کی محبت، رشتوں کی زنجیر، پھوپھی مرحومہ کی بیٹی.....

انہیں یاد رہی تو فقط رات کی تنہائی اور نفسانی خواہش.....

"تم تعاون کرو تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی زیب..... ورنہ زبردستی کرنی بھی مشکل نہیں....."

وہ مجھے گناہ کی ترغیب دے رہے تھے اور میں جیسے کسی دلدل میں دھنستی جارہی تھی.....

انہوں نے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا..... شاید وہ میری پسپائی محسوس کر چکے تھے۔ اور میں..... میری روح گویا قفسِ عنصری سے پرواز کرنے لگی تھی۔

تنویر ابراہیم کا قابلِ تعظیم بت میرے قدموں میں پاش پاش ہو گیا تھا..... ان کے چہرے کا گھناؤنا پن مجھے میری دھندلائی آنکھوں سے بھی بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ میں نے کیا کیا؟" کوئی مجھ پر ہنس رہا تھا۔ میں کیوں اس معاملے میں اتنا اُلّو ہوئی؟ میں اس کا گریبان پکڑنے والی کون ہوتی تھی؟

"چلو تمہیں پہنچا دوں۔ میں نے سیڑھی رکھ دی ہے۔"

بہ وقت ضرورت استعمال کی جانے والی لکڑی کی سیڑھی اسٹور سے نکال کر صحن میں رکھنے کے بعد وہ اندر آئے تھے۔

"زیب.....!" انہوں نے میرے ساکت وجود کو جنبش دی مگر میری رگوں میں جان کب باقی تھی۔

"زیب اٹھو۔ جلدی کرو۔" انہوں نے پھر مجھے حواسوں میں لانا چاہا۔

شاید ان کے نفس کا شیطان اپنی خواہش کی تکمیل کے بعد پھر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ جب ہی میرے سامنے ایک محتاط مرد کی طرح وہ وقت کی سنگینی کا خیال کرتے ہوئے ازحد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ میری مسلسل بے خبری و سکتہ کی کیفیت سے جھنجلا کر صوفے پر بیٹھ گئے..... میں مکمل غائب دماغی سے پھٹی پھٹی آنکھیں زمین پہ گاڑے بیٹھی تھی..... اسی پل دروازے پر ہوئی زوردار دستک نے جیسے صورِ اسرافیل کی طرح بدن سے میری روح کھینچ لی اور اس کے بعد.....

جس بدکردار، ظالم، گناہ گار شخص کو میں ابھی جی بھر کر کوس بھی نہ پائی تھی، بھولیاں پھیلا پھیلا کر بددعا بھی نہ دے سکی تھی، کسی کو اس کے مظالم کی داستان بھی نہ سنا سکی تھی، اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ بھی نہ سکی تھی..... وہ ہی میرے لیے مجازی خدا کا درجہ اختیار کر گیا۔

اور میری بددعائیں، میری آہیں، میری سسکیاں..... سب میرے سینے میں ہی دفن ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

اس نے ڈائری بند کر دی۔ بھیگے چہرے کو ہاتھوں سے خشک کر کے اس نے سر بیڈ کراؤن سے ٹکا دیا..... بند پلکوں سے بھی پانی اُمڈے چلا آرہا تھا.....

زیب کی سوچیں پھر بے لگام دوڑنے لگیں۔

بظاہر میں تنویر ابراہیم کے ساتھ مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ مگر ان چار سالوں میں نہ میں کبھی خوشی محسوس کر سکی نہ اس شخص کو کرنے دی..... مجھے پامال کرنے والا میرے لیے قابلِ احترام کیسے ہو سکتا ہے؟

..... وہ مجھ سے بارہا اپنی محبت کا اقرار کرتا..... پور پور پشیمانی ظاہر کرتا..... گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگتا..... مگر اپنی ذات کا غرور کھو کر اس کی محبت میرے کس کام آئی؟

اس کی پور پور پشیمانی میری معصومیت کی بھرپائی کر سکتی تھی؟

ایک میری بے احتیاطی نے مجھے مسلسل عذاب سے دوچار کر رکھا تھا تو اس کے گناہ کبیرہ کی بخشش اتنی آسانی سے کیسے ہو جاتی؟

"زرمین..... اگر بہروپ بھرے ہوئے تھی تو کیوں کسی اور نے اس کے بہروپ سے دھوکا نہ کھایا..... صرف میں ہی کیوں؟

تنویر ابراہیم کی ہوس کا نشانہ میں ہی بنی..... صرف میں ہی کیوں؟

مان لو زیب تنویر ابراہیم..... تمہارے اس انجام میں قصور کسی اور کا نہیں..... تمہارے اپنے غلط اقدام کا ہے۔"

کوئی اسے باور کروا رہا تھا اور اس کے پاس سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

ہزار تاویلیں گھڑ کر خود کو معاف کر دینا بہت مشکل نہیں ہوتا۔ میں نے بھی اپنی خطا، اپنی کوتاہی..... وقت، نصیب اور گردشِ دوراں کے کھاتے میں لکھ دی۔ اور تنویر ابراہیم کو بھی معاف کر دینے کا ارادہ کر لیا۔

دس روز بعد تنویر آیا تھا۔ اس کی گاڑی کا ہارن سُن کر میرے دونوں بچے اڑتے جھکتے باہر کی طرف دوڑے اور میں نے خیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

شاید پہلی بار میں نے ان چار سالوں میں دل سے مسکرانے کی کوشش کی تھی..... مگر جب دل ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو رہا ہو تو مسکراہٹ بھی آہ و فغاں کا ذائقہ دیتی ہے.....

اور اس لمحے میں خود کو اچھی طرح یہ باور کروا چکی کہ اب اسی آنکھ مچولی کے ساتھ میں نے ساری عمر گزارنی ہے۔

غمگین ذائقہ زبان پر محسوس کرتے ہوئے میں مسکراتی ہوئی لاؤنج میں چلی آئی.....

☼

سحرش بانو



بہت غصے سے دروازہ کھول کر آتی روشانے آفریدی کو زرلالہ آفریدی نے خاصی حیرت سے دیکھا اور پھر گہرا سانس لے کر خود کو پھر سے ناول میں گم کرلیا۔ روشانے کے غصے کی وجہ اسے معلوم جو تھی۔

"اتنا ظالم' اتنا سڑیل بندہ اور ایسی انسلٹ؟" دھڑام سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا غصہ نکالا۔

"تو تم نے بھی تو غلط کیا نا۔" ناول سے سر اٹھا کر زرلالہ نے صاف گوئی سے کہا تو اسے آگ ہی لگ گئی۔

"غلط؟ ایک چھوٹی سی شرارت ہی تو کی تھی۔" زرلالہ کے جھکے سر کو دیکھتے اس نے کہا تو وہ ناول بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جی ہاں۔۔۔ اور اسی شرارت کی وجہ سے عمر لالہ اور علینہ بھابھی کی لڑائی ہوئی۔" زرلالہ نے اسے اس کی غلطی یاد دلانے کی کوشش کی۔ وہ چڑ گئی۔

"ایکسکیوزمی زرلالہ ڈیر! تمہیں کیا لگتا ہے' ان دونوں کو لڑنے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت ہے؟ ان دونوں کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو خواب میں بھی ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔" اس کی بات درست تھی۔ زرلالہ چپ ہو گئی۔

"تو تمہیں کیا ضرورت تھی اقبال جرم کرنے کی؟ مکر جانا تھا نا۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔

"اونہہ! مکر جانا تھا۔ سامنے تمہارا لالہ کھڑا تھا۔ "در دل" کا 'دلاور شاہ نہ ہو تو۔۔۔ ہال کمرے میں 'ابی' آغا جان' خان لالہ' امو جان سب کے سامنے کھڑا کر کے اور اس مطالبے کے ساتھ کہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا جائے۔ اب اس دنیا میں ایسا شخص کہاں ہو گا جو سکندر آفریدی کی آنکھوں میں دیکھ کر جھوٹ بول سکے یا مکر سکے۔" وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

"سوسیڈ یار۔" زرلالہ نے حتی الامکان لہجے میں افسوس بھرا۔

"بہرحال اپنے اس ہٹلر لالہ سے کہہ دینا۔ آج کے بعد انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیا نا تو۔۔۔"

"تو۔۔۔؟" زرلالہ نے اس کا تو دہرایا تھا۔

"تو۔۔۔ یا تو میں اپنا سر پھاڑ لوں گی یا۔۔۔"

"یا۔۔۔" تو کی طرح اس نے "یا" بھی دہرایا تھا۔

"یا خود کشی کرلوں گی۔ پتا نہیں اس سڑیل انسان کو دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کا اتنا شوق کیوں ہے؟"

صوفے پر بیٹھی زرلالہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا ہوا یار؟" اس نے پوچھ بھی لیا۔ جانتی تھی' جب تک وہ اپنے اندر کی بھڑاس نہیں نکال لے گی' نہ خود سکون سے بیٹھے گی' نہ اسے بیٹھنے دے گی۔

"کیا ہوا؟ تمہیں پتا ہے نا۔ اس ٹھٹھرا دینے والے سرد موسم میں گھر سے نکلنا کتنا دشوار ترین ہوتا ہے میرے لیے۔" "تو؟"

"تو یہ کہ یہی بات میں امو جان کو بتا کر یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے صبح نہیں جانا' جب تمہارا جلاد لالہ کسی ایٹم بم کی طرح مجھ معصوم کے سر پر پھٹا۔ اب بندہ پوچھے خود چاہے ڈبل بی اے کرو یا ڈبل ایم اے۔ دوسروں کی زندگی کیوں اجیرن کر رہے ہو۔ اونہہ "ستارہ شام" کا شبیہہ العباس نہ ہو تو۔۔۔ بہرحال اپنے لالہ سے کہہ دینا کہ آج کے بعد اگر میرے معاملات میں دخل دیا نا تو۔۔۔ تو یا تو میں اپنا سر پھاڑ لوں گی یا۔۔۔ یا خود کشی کرلوں گی۔"



سرخ رنگ کے لباس پر سیاہ شال اوڑھے اندر آتی روشانے آفریدی کا گلابی چہرہ اس وقت غصے کی وجہ سے اچھا خاصا سرخ ہو رہا تھا۔ کیوں۔۔۔ یہ ابھی زرلالہ آفریدی کو معلوم نہیں تھا اور یہی بات اس نے روشانے آفریدی سے پوچھ لی۔ وہ پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

"پتا نہیں' میرا نصیب بدبختی کی کون سی منزل پر تھا' جو میں اس گھر میں پیدا ہوئی جہاں سکندر آفریدی جیسا ظالم جلاد انسان رہتا ہے۔" اس کے طیش سے کہنے پر زرلالہ نے حیرانی سے اپنی بہت پیاری' مگر جذباتی سی کزن کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟" اس کے لبوں سے برآمد ہوا۔

"اچھا بھلا ثوبیہ کے ساتھ بینا کے گھر جا رہی تھی۔ جب تمہارے کھوسٹ لالہ کو پتا چل گیا۔ اونہہ! "پتھروں کی پلکوں پر" کا شجاع حسن نہ ہو تو۔۔۔ قسم سے یار۔۔۔ مجھے لگتا ہے اس بندے کا کسی خفیہ ایجنسی سے تعلق ہے۔"

اس کی بات پر زرلالہ صوفے سے دو فٹ اچھلی۔

"واٹ۔۔۔؟"

"اور نہیں تو کیا۔" اس نے بے نیازی سے سر جھٹکا۔

"آفریدی ولا میں پتا تک ہلے تو محترم سکندر آفریدی کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہ بھی آفس میں رہتے ہوئے۔۔۔ آخر کس طرح؟" اب اس کا انداز سوچنے والا تھا۔

"اور کسی کے تو نہیں' مگر تمہارے متعلق ہر خبر رکھتے ہیں لالہ۔" زرلالہ کے شرارت سے کہنے پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مگر کیوں؟" برا سا منہ بنا کر اس نے وجہ جاننے کی کوشش کی۔

"اب یہ تو لالہ کو ہی پتا ہو گا۔" زرلالہ نے لاپروائی سے کندھے جھٹکے۔ "ویسے لالہ نے منع کیوں کیا؟"

"بقول تمہارے لالہ کے' ہمارے گھر کی لڑکیاں شام کے وقت گھر سے نہیں نکلتیں۔" صوفے پر ہی نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے وجہ بیان کی۔

"بہرحال۔۔۔ بتا دینا اپنے کھڑوس لالہ کو کہ آج کے بعد اگر انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی نا تو تو۔۔۔"

زرلالہ نے اسے بیچ میں ہی ٹوکا۔

"یا تو تم خود کشی کرلو گی یا اپنا سر پھاڑ لو گی۔۔۔ ہے نا۔"

"ہاں! مگر تم نے تو ترتیب الٹ دی ہے ایڈیٹ۔"



اس کا ردعمل زرلالہ کے اندازوں کے مطابق بہت شدید تھا۔ بہت طیش سے کمرے میں چکراتے وہ اب عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"میں کہہ رہی ہوں زرلالہ! اپنے لالہ سے کہہ دو اپنے ارادے سے باز آجائیں۔ ان جیسے کٹھور شخص سے شادی کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔" غصے سے کہہ کر وہ دوبارہ سے چکر کاٹنے لگی۔

"لیکن روشانے! سکندر لالہ میں کمی ہی کیا ہے؟" بہت دھیمی آواز میں کہتی زرلالہ کو اس نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"واٹ؟" وہ چیخی۔

"ٹھیک ہے لالہ کچھ سخت مزاج ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔"



"کچھ۔۔۔؟" اسے دوبارہ اپنے پھیپھڑوں کو زحمت دینا پڑی تھی۔

"دیکھو روشنی۔۔۔ لالہ نے خود تمہارے لیے کہا ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ تم میں انٹرسٹڈ ہیں۔ ہو سکتا ہے محبت بھی کرتے ہوں۔" زرلالہ کی بات پر اس کے گلابی لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ چمکی۔

"تمہارے لالہ اور محبت؟ اب اتنی دور کی بھی مت چھوڑو۔ بہرحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مجھے تمہارے لالہ سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ اونہہ۔۔۔ مہوش افتخار کا ہیرو علی شہریار ان نہ ہو تو؟"

"وہ مہوش جی کا نہیں ان کے ناول کا ہیرو تھا۔"

"ہاں! پتا ہے مجھے۔" زرلالہ کے تصحیح کرنے پر اس نے لاپروائی سے ہاتھ ہلائے۔

"اب اگر مہوش جی نے پڑھا تو انہیں کتنا برا لگے گا۔" زرلالہ نے احساس دلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بے نیازی سے بولی۔

"چھپے گا تو پڑھیں گی نا۔"

"ہاں! یہ بھی ہے۔" اس نے سمجھ داری سے سر ہلایا تھا۔

"بہرحال۔۔۔ تم اپنے لالہ سے کہہ دینا، مجھے ان سے شادی نہیں کرنی۔ آج کے بعد انہوں نے اس طرح کی کوئی بات کی تو۔۔۔ یا۔۔۔ تو۔۔۔ میں اپنا سر پھاڑ لوں گی یا خودکشی کرلوں گی۔"

وہ کافی دیر سے ایک ہی حالت میں منہ لٹکائے اداس سی بیٹھی تھی۔ زرلالہ ٹرے میں کافی کے دو مگ رکھے اس کے قریب بیٹھی۔

زرلالہ! آج کے بعد تمہارا سڑو لالہ میرے سامنے آیا نا تو۔۔۔" غصے سے کہتے وہ ایک پل کے لیے خاموش ہوئی۔

"ہاں یار! کی تو انہوں نے زیادتی ہے۔ مگر۔۔۔" زرلالہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

"میں تو سمجھی تھی کہ شاید انہیں تم میں انٹرسٹ ہے۔ جب ہی وہ تم سے شادی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ مگر ان کے فیصلے کے پیچھے ایسی وجہ ہوگی۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔" زرلالہ کی بات پر اس نے جھٹکے سے اپنا جھکا سر اٹھایا۔

"مگر مجھے اندازہ تھا۔ کیونکہ تمہارے اس سنگدل لالہ کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ پھر بھی تمہاری باتوں میں آکر اس جلاد سے پوچھنے چلی گئی کہ وہ خدیجہ آپی، گل بانو آپی، خستہ گل اور شیربانو کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتا ہے اور تمہارا لالہ ایک نمبر کا ظالم انسان۔۔۔ جھٹ میرے منہ پر کہہ دیا کہ آفریدی ولا کی باقی ساری لڑکیاں بہت خوش اخلاق، نیک، شریف، مہذب اور باتمیز ہیں۔ سوائے روشانے آفریدی کے۔ سو وہ سب خاندان میں کہیں بھی چلی گئیں تو نہ صرف وہاں سیٹ ہو جائیں گی، بلکہ اپنے اخلاق و کردار سے سب کے دلوں میں گھر بھی کرلیں گی۔ مگر روشانے آفریدی کی شادی اگر کہیں اور کردی گئی تو کل کو بی بی جان، امو اور ابی کی تربیت پر بات آئے گی۔ سو وہ یہ کڑوا گھونٹ پینے کو تیار ہیں۔ میرے اس خوب صورت چہرے پر اپنی سیاہ آنکھیں جمائے اس نے اتنی آسانی اور سنگ دلی سے یہ سب کہا کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی میرے ہاتھ میں ٹریل ٹو ہو اور میں تمہارے لالہ کے چوڑے سینے میں یہ بڑا سا شگاف ڈال دوں۔ اونہہ! سکندر بخت نہ ہو تو۔"

"یہ کون ہے؟" زرلالہ چونکی۔

"میرے اگلے ناول کا ہیرو۔"

"پہلے پچھلے تو لکھ لو۔"

"بہرحال اپنے لالہ کو کہہ دینا، میرے حوالے سے کوئی بھی فکر پالنے کی ضرورت نہیں اور آج کے بعد اگر انہوں نے مجھ سے یوں بات کی نا تو۔۔۔"

"تو؟" زرلالہ کے "تو" میں حد درجہ بے زاری تھی۔ وجہ اس کا وہی پھٹا پرانا گھٹیا ڈائیلاگ تھا۔

"یا تو میں اپنا سر پھاڑ لوں گی یا خودکشی کرلوں گی۔"

☼ ☼ ☼

"بس زرلالہ۔۔۔ آگے کچھ مت کہنا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔

"میرا دل پہلے ہی، بہت زخمی ہے زرلالہ۔۔۔ دیکھو! تم سب نے زور زبردستی میری منگنی اس سڑیل شخص سے کردی۔ میں چپ رہی۔" اس کے چپ رہنے والی بات پر زرلالہ نے گھورا تو وہ ذرا سا کھسیائی۔ مگر اپنا بیان جاری رکھا۔

"انگیجمنٹ والے روز میں ٹی پنک لباس میں کتنی حسین لگ رہی تھی۔ سب نے ہی تعریف کی۔ مگر تمہارا یہ دل جلا لالہ۔۔۔ ایک نظر تک نہیں ڈالی۔ ایسا پتھر نما انسان ہے۔ چھوٹی عید، بڑی عید، سب ہی گزر گئے۔ مگر اس ظالم انسان کو یاد بھی نہ آیا کہ اسی گھر میں اس کی ایک عدد نئی نکور منگیتر بھی رہتی ہے۔ جس کے نئے نکور جذبات کا احساس کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ اونہہ! روبحا گل کا از میریٹ نہ ہو تو۔۔۔ مگر میں بتا رہی ہوں زرلالہ! میں روبحا گل نہیں ہوں، جو اس سڑیل ہیرو کے رومانٹک ہونے کے خواب دیکھتے، دادو سے جھڑکیاں کھاتے ہوئے زندگی گزار دوں۔۔۔ میں روشانے آفریدی ہوں۔ اگر تمہارے کھڑوس لالہ نے تین دن بعد آنے والی میری سالگرہ پر مجھے کسی اسپیشل طریقے سے وش نہ کیا تو۔۔۔" وہ حسب معمول ایک پل رکی۔

"یا تو میں اپنا سر پھاڑ لوں گی یا خودکشی کرلوں گی۔"

"کیا واقعی؟" اپنے پیچھے بھاری مردانہ آواز سن کر وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ زرلالہ کہیں نہیں تھی۔ سکندر آفریدی سامنے کھڑا تھا۔

"ٹھیک کہتی تھی روبحا گل۔ زندگی کا گند ہی ہوتی ہے۔" بہت سرعت سے اس نے زرلالہ کو کوسا۔ مگر دل میں۔ جبکہ سامنے کھڑا شخص ابھی تک جواب کا منتظر تھا۔

"ہاں! تو میں نے جی کے کرنا بھی کیا ہے۔ ابی، امو جان، عمر لالہ، سب مجھے ڈانٹتے ہیں اور آپ۔۔۔ آپ کو تو مجھ میں سوائے خامیوں کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔" اس نے بھی آج آر یا پار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"نہیں خیر! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"آہ۔۔۔ کاش! اس کے ہاتھ میں کیمرا ہوتا تو وہ یہ یادگاری لمحہ محفوظ کرلیتی۔ سکندر آفریدی، روشانے آفریدی کی بات پر مسکرایا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اس کے سوال پر روشانے نے خود اپنی بات بلکہ سوچ اس کے سامنے رکھ دی اور اگلے ہی پل وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ "یا حیرت۔" غالباً وہ اسے حیرت کے جھٹکے دے کر مارنا چاہتا تھا۔

"بہرحال! تم آج کے بعد مرنے کی بات مت کرنا۔"

اس نے ٹھیک سوچا تھا۔ سکندر آفریدی آج اسے حیرانی کی موت دینا چاہتا تھا۔

"کیونکہ۔۔۔" وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔

"اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو پھر ہم سب کس کی بے وقوفیوں پر اسے ڈانٹا کریں گے۔ اب تو عادت ہو گئی ہے نا یار! سمجھا کرو۔"

لو جی شکر ہے، وہ حیرانی سے مر نہیں گئی۔ سکندر آفریدی تو ویسا ہی تھا۔ سڑیل، بے لحاظ، پر آج نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی اور اگلے ہی پل وہ فاصلہ طے کرتا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ پلکیں جھپکا کر آنسو چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

"مذاق کر رہا تھا روشانے! اور تم سیریس لے گئیں۔" اس کے گال پر آنے والا آنسو سکندر نے اپنی پور پر چنا۔

"اگر تم کہیں اور چلی گئیں تو پیچھے میں کیا کروں گا، کیونکہ تمہارے بغیر میرا دل۔۔۔ میرا گھر، سب خالی ہو جائے گا۔ زندگی، خوشی، محبت سب تمہاری وجہ سے ہی تو ہے۔ آئی لو یو روشانے۔" وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"اگر آج کے بعد آپ نے یوں میرا ہاتھ تھام کے اپنی محبت کا اظہار کیا تو میں بھی آپ سے کہہ دوں گی۔۔۔

"آئی لو یو ٹو سکندر۔"

☼

نگہت سیما

زمین کے آنسو

ایک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نیلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس۔
اسے فرضی نام "حورعین" دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"الریان" کے سربراہ عبدالرحمٰن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو)
زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

"مراد پیلس" کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمٰن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ا
کے بیٹے فلک شاہ (موی) "الریان" آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیا
گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے
ہیں۔ فلک شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ زریں جائیداد کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں ان کا شوہر فیر
فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مر
شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول



عبدالرحمٰن شاہ کی بہن مروہ کی سسرالی رشتے دار مائرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کر دیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ "الریان" والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر کے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے، ایبک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مائرہ اور بیٹی رابیل کے علاوہ سب ایبک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں۔ بلکہ عمر احسان، ایبک کا فین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی، اریب فاطمہ جو کہ مروہ پھپھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے، ایبک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت تڑپتے ہیں۔ عمارہ کو انجائنا اٹیک ہوتا ہے تو عبدالرحمٰن شاہ بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا، حسن رضا اور زبیدہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہینڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی، کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملواتا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔

عمارہ کی طبیعت بہتر ہوتے ہی ایبک انہیں بابا جان عبدالرحمٰن شاہ کی بیماری کا بتاتا ہے۔ عمارہ یہ سنتے ہی بابا جان سے ملنے کے لیے بے چین ہو جاتی ہیں۔

احسان شاہ، فلک شاہ کو مائرہ سے اپنی محبت کا احوال سناتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مائرہ نے اس سے کھل کر اظہار محبت کر دیا ہے، جو کہ اس کا رشتہ عمارہ سے طے ہو چکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتا ہے۔

احمد رضا کو پولیس گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ اس پر الزام ہے کہ ایک شخص اسماعیل جو خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے، لوگوں کو بہکا رہا ہے۔ احمد رضا، اسماعیل سے ملتا ہے۔ احمد رضا کو اس کے والد گھر لے آتے ہیں۔

الوینا جو اسماعیل کے ہاں احمد رضا کو ملی تھی۔ وہ اسے فون کر کے بلاتی ہے۔ وہ وہاں جاتا ہے تو اس کی ملاقات اسماعیل سے ہوتی ہے۔ اسماعیل، احمد رضا سے کہتا ہے کہ احمد رضا کو دولت، عزت اور شہرت ملنے والی ہے۔ احمد رضا مسحور ہو جاتا ہے۔ ہمدان کو عمارہ پھوپھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی، لیکن گھر والوں کے شدید رد عمل نے اسے مایوس کر دیا۔ نئی نسل میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پھوپھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

اریب فاطمہ مروہ پھوپھو کی سسرالی رشتہ دار ہے، جسے مروہ پھوپھو پڑھنے کے لیے الریان لے آئی ہیں، یہ بات مائرہ بھابھی کو پسند نہیں ہے۔ ایبک، عمارہ کو لے کر بابا جان کے پاس آیا تو اتنے عرصہ بعد انہیں دیکھ کر بابا جان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔

بابا جان کی طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اسپتال میں، عمارہ کو دیکھ کر سب بہت خوش ہوتے ہیں، مگر مائرہ اور رابیل انہیں تنفر اور سخت تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ مائرہ عمارہ سے کافی بد تہذیبی سے پیش آتی ہے جبکہ احسان شاہ غصے سے منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

فلک شاہ، مروہ پھپھو سے مائرہ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ فلک اور عمارہ کے فوری نکاح کا مشورہ دیتی ہیں۔ یوں مصطفیٰ اور عثمان کے ولیمہ میں ان دونوں کا نکاح ہو جاتا ہے۔ مائرہ رحیم یار خان سے مصطفیٰ کو فون کر کے اپنا نام پوشیدہ رکھ کر فلک شاہ کے خلاف بھڑکاتی ہے مگر مصطفیٰ مروہ پھپھو سے بات کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں تاہم ان کو یہ فون کال آج بھی یاد ہے۔

فلک شاہ نے حق نواز کی پارٹی باقاعدہ طور پر اختیار کر لی۔ مائرہ اور احسان کی شادی کے بعد ایک جھگڑے میں فلک شاہ کبھی بھی "الریان" میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں بصورت دیگر ان کی طرف سے عمارہ کو طلاق ہو گی جبکہ احسان شاہ کہتے ہیں کہ "الریان" سے اگر کوئی "مراد پیلس" گیا تو وہ خود کو گولی مار لیں گے۔

سمیرا کو شک ہو جاتا ہے کہ احمد رضا، اسماعیل خان کے پاس اب بھی جاتا ہے تاہم احمد رضا اسے بہلا لیتا ہے اور یوں ہی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسماعیل خان اسے ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یونٹی کا اہم کارکن بنا کر اس سے الٹے سیدھے بیان دلوا دیتا ہے۔ حسن رضا یہ خبر پڑھ کر احمد رضا کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔

عبدالرحمٰن شاہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو ایبک انہیں کرنل شیردل کی انیکسی میں لے آتا ہے۔ وہاں سے وہ فلک شاہ سے ملنے بہاول پور جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ احسان شاہ، مائرہ اور رابیل کے ساتھ رحیم یار خان چلے جاتے ہیں اور عمارہ سے نہیں ملتے۔ ایبک کی پیدائش کے بعد مائرہ نے احسان شاہ کے ساتھ منگنی کرتے ہوئے فلک شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی بے عزتی نہیں بھولی ہے اور وہ اس بات کا بدلہ ضرور لے گی۔

ایبک، اریب فاطمہ سے اظہار محبت کرتا ہے۔

حسن رضا، احمد کو گھر سے نکال کر دکھی ہو جاتے ہیں۔ تاہم انہیں احمد کی حرکت پر ملال بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے معافی مانگتے ہیں اور اس کے دوست ابراہیم کے ساتھ اسے ڈھونڈتے ہوئے طیب خان کی کوٹھی جا پہنچتے ہیں، مگر وہ لاعلمی کا اظہار کر دیتا ہے۔ احمد رضا، الوینا کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ وہ اکثر گھر جانے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر الوینا مختلف حیلے بہانوں سے اسے روک لیتی ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں طیب خان اور رباب حیدر مدہوشی کی کیفیت میں احمد رضا سے اسماعیل خان کی نبوت کا بیان دلوا دیتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس بیان کی تردید کرتا ہے، مگر رجی اسے سختی سے جھٹلا دیتا ہے۔

عمارہ اور ایبک کے ساتھ عبدالرحمٰن شاہ کے مراد پیلس آنے کی خوشی میں فلک شاہ خوب تیاری کرتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی میں کھو جاتے ہیں۔ فلک شاہ، مائرہ اس کا ذکر شیردل سے کرتے ہیں۔ شیردل انہیں تسلی دیتے ہیں کہ وقتی جذباتیت ہے۔ ختم ہو جائے گی۔ ان کی پارٹی نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ حق نواز کی صحافی دوست کو چند اہم شخصیات نے اغوا کر کے قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے حق نواز نے پارٹی چھوڑ دی۔

ایبک کی پیدائش پر عمارہ بہاول پور چلی گئیں۔ ایبک ایک ماہ کا ہوا تو دادی کا انتقال ہو گیا۔ حق نواز نے دوسری پارٹی اختیار کر لی۔ فلک شاہ ان کے ساتھ تھے۔ فلک شاہ الریان کے برابر والے مکان میں رہتے تھے اور اکثر ہی الریان جاتے رہتے تھے۔ دادا جان کا بھی انتقال ہو گیا۔ عبدالرحمٰن شاہ نے احسان کی شادی کا فیصلہ کیا۔ مائرہ نے عین وقت پر شادی سے انکار کر دیا۔ یہ بات مروہ پھپھو اور فلک شاہ جانتے تھے۔ رحیم یار خان میں مائرہ اچانک فلک شاہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور پرانی باتیں دہراتی ہے تاہم آخر میں احسان سے شادی پر راضی ہو جاتی ہے۔ ان دنوں ملک دشمن عناصر کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ حق نواز بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ دوسری طرف مائرہ، عمارہ سے بدتمیزی سے پیش آتی تھی۔ حق نواز کہیں لاپتا ہو گیا۔ کافی دنوں بعد شیردل فون پر بتاتے ہیں کہ حق نواز زخمی حالت میں اسپتال میں ہے اور فلک سے ملنا چاہتا ہے۔ فلک پریشانی کے عالم میں تیز بخار میں پھنکتے ایبک کو الریان چھوڑنے جاتے ہیں تو ملازمہ کی اطلاع پر وہ احسان کے کمرے میں جاتے ہیں۔ مگر کمرے میں قدم رکھتے ہی مائرہ ان پر غلط الزامات کی بوچھاڑ کر دیتی ہے۔ احسان شاہ، مائرہ کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ فلک شاہ کو صفائی دینے کا موقع نہیں ملتا۔ انہیں حق نواز کے پاس جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ وہ نیچے آتے ہیں تو بابا انہیں ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں علم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہیں۔ غصے کی کیفیت میں فلک شاہ کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ آئندہ اگر وہ الریان آئے تو عمارہ کو تین طلاق۔ حق نواز ان سے ملے بغیر مر جاتا ہے۔ جنازے میں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ کئی مفتیوں اور علماء سے فتویٰ لیتے ہیں۔ ان سب کے مطابق الریان جانے کی صورت میں عمارہ ان پر حرام ہو جائیں گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے مراد پیلس چلے جاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن شاہ تڑپ کر فلک شاہ سے ملتے ہیں اور انہیں وہیل چیئر پر دیکھ کر بہت دکھی ہو جاتے ہیں۔ حق نواز کے بعد فلک شاہ بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ شیردل کی کوششوں سے مخالفین انہیں زخمی حالت میں شیردل کی کوٹھی کے باہر پھینک گئے۔ اس تشدد میں ان کی ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اس ملاقات میں فلک شاہ، عبدالرحمٰن شاہ کو مائرہ کے بارے میں بھی سب بتا دیتے ہیں۔ عمارہ کو بھی اس بات کا پہلی دفعہ علم ہوتا ہے۔ وہ حیران اور خفا ہو جاتی ہیں۔

حسن رضا، طیب خان کے چوکیدار کی مدد سے اس جگہ پہنچتے ہیں۔ جہاں احمد رضا چھپا ہوتا ہے۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے جب احمد رضا باہر نکلتا ہے تو حسن رضا اس پر پستول تان لیتے ہیں مگر ٹریگر دبا نہیں پاتے اور حسن رضا انہیں دیکھے بغیر چلا جاتا ہے۔

احمد رضا کے شدید اصرار پر الوینا اسے بالآخر گھر لے جاتی ہے۔ دروازہ بجانے پر ایک اجنبی نکلتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ حسن رضا یہ گھر فروخت کر کے یہاں سے جا چکے ہیں۔ وہ حیرانی کے عالم میں دلبرداشتہ ہو کر پلٹتا ہے کہ گلی کے دوسرے کونے سے حسن رضا دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اسے آواز دے کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔

7

ساتویں قسط

"یہ مریم کی کہانی ہے۔

مریم جو حورعین کی ماں تھی۔ حورعین نے اس سے صبر سیکھا تھا اور آنسو اس نے اس سے ورثے میں پائے تھے۔ اور یہ زمین کی کہانی ہے۔

مریم، حورعین اور زمین ایک ہی تو ہیں۔ تینوں میں دکھ کی سانجھ ہے۔"

پاؤلن لیکولی دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں تھوڑی ٹکے، کہنیاں گود میں رکھے کشن پر ٹکائے بہت دلچسپی سے سامنے بیٹھے ایبک فلک شاہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔

"تو تمہارا یہ خیال ہے ایبک فلک شاہ کہ تمہاری یہ کہانی تمہاری شاہکار کہانی ہو سکتی ہے۔" ایبک مسکرا دیا۔

"اور اگر یہ شاہکار نہ بھی ہوئی تب بھی تم مجھے اسے پڑھنے کے لیے ضرور دینا۔ میں اسے شاہکار سمجھ کر ہی پڑھوں گی۔"

وہ پھر مسکرا دیا۔

وہ کل صبح ہی بہاول پور سے آیا تھا اور آج شام پاؤلن لیکولی کے سامنے بیٹھا تھا۔ بابا جان ابھی لاہور میں ہی تھے اور اسے یہاں ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کرنا تھی۔ وہ بابا جان سے معذرت کر کے کل ہی یہاں پہنچا تھا اور جب وہ الحمرا آرٹس کونسل میں ہونے والی اس تقریب میں شرکت کر کے باہر نکلا تھا تو کچھ فاصلے پر فرنچ انسٹیٹیوٹ کا بورڈ دیکھ کر اس کے دل میں ایک دم پاؤلن لیکولی کا خیال آیا تھا اور اس نے اپنی گاڑی انسٹیٹیوٹ کی طرف موڑ دی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ آج اتنے سالوں بعد بھی وہاں ہی ہوں گی۔ لیکن غیر متوقع طور پر وہ اسے انسٹیٹیوٹ کے گارڈن میں ہی مل گئی تھیں۔ وہ شاید کلاس لے کر نکلی تھیں۔

"گڈ ایوننگ میم۔۔۔"

"گڈ ایوننگ۔۔۔"

پاؤلن نے اپنی عینک کو اچھی طرح ناک پر جماتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ذہین اور خوبصورت اسٹوڈنٹ کو پہچاننے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔

"تم ایبک فلک شاہ ہو نا؟"

اور ایبک فلک شاہ مسکرا دیا تھا۔ "مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ مجھے پہچان لیں گی۔ آپ کی یادداشت حیرت انگیز ہے میم!" اب وہ انہیں اپنی کہانی کے متعلق بتا رہا تھا اور پاؤلن دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

"تو یہ مریم اور حورعین کی کہانی ہے۔" پاؤلن نے ایبک کی طرف دیکھا۔

"یہ دکھ کی سانجھ کی کہانی ہے۔۔۔"

"لیکن ایبک فلک شاہ! انہیں کیا دکھ تھا؟"

"ان کے دکھ بے حساب تھے میم۔۔۔ پتا نہیں میں سارے دکھوں کو لکھ بھی پاؤں گا یا نہیں۔"

"اور جب تم مریم کے دکھ لکھو تو اس پردیسی پاؤلن لیکولی کے دکھ بھی اس میں شامل کر لینا۔" ان کی بھوری آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی تھی "یہ ساری دنیا کی عورتوں کے دکھ سانجھے کیوں ہوتے ہیں ایبک فلک شاہ! چاہے وہ فرانس کی پاؤلن لیکولی ہو یا تمہارے پاکستان کی مریم۔"

"میم!" ایبک نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک لڑکی نے اسٹاف روم کے دروازے سے جھانکا۔

"میڈم! آپ کلاس لیں گی یا ہم چلے جائیں۔"

"میں آتی ہوں ابھی۔"

"او کے میم! میں اب چلتا ہوں۔ آپ کا وقت لیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے بہت اچھا لگا اور تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ہاں! تمہارے کام نہ آسکنے کا افسوس ہے۔ اگر تم کہو تو پیرس میں میری ایک دوست ہے اس سے کہوں۔"

"نہیں میڈم! کچھ ایسی ضروری بھی نہیں ہے۔ یوں ہی جب میں اپنی کہانی کا عنوان لکھ رہا تھا تو مجھے ژل لافورگ کا خیال آگیا تھا۔"

"تمہاری کتاب چھپے تو مجھے ضرور بھیجنا۔"

"شیور!" ایبک نہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا تھا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ژل کی نظموں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نظمیں جو لے سنگ لاتے ویرا تر میں چھپی تھیں۔ بہت یاد کرنے پر بھی اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا حالانکہ جب وہ فرنچ زبان سیکھ رہا تھا تو اس نے اس کی کئی نظموں کا انگریزی ترجمہ پڑھا تھا۔

March For the death of earth

Funeral (زمین کا جنازہ)۔

"کتنی انوکھی اور حیرت انگیز نظم تھی۔"

اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ اور اس نے غیر ارادی طور پر دائیں طرف باہر دیکھا اور چونکا۔ "لگا جیسے اسٹاپ پر وہ کھڑی تھی۔

"اریب فاطمہ!" اس نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن یہاں اس وقت جب شام ہو رہی ہے۔" اس نے گاڑی ریورس کی اور پھر بغور باہر دیکھا۔

وہ اریب فاطمہ ہی تھی۔ سیاہ چادر کو اچھی طرح لپیٹے کچھ گھبرائی ہوئی سی اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی۔ شاید وہ اپنے روٹ کی بس یا وین کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ یکدم ہی گاڑی روک کر نیچے اترا تھا۔ اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"آپ یہاں؟"

اریب نے چونک کر سر اٹھایا۔

"آپ غالباً" وین کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"جی۔ جی!" اس نے پریشانی سے سڑک کی طرف دیکھا۔

"آیئے! میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"نہیں! تھینک یو۔ میں چلی جاؤں گی۔"

اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے لڑکوں کی طرف دیکھا۔ جب سے وہ اسٹاپ پر آئی تھی۔ وہ دونوں لڑکے وہاں کھڑے اسے گھورے جا رہے تھے۔

آیئے اریب!" ایبک کا لہجہ حتمی تھا۔ "یہاں وین کے انتظار میں کھڑا ہونا مناسب نہیں ہے۔"

وہ ایک لمحہ کے لیے جھجکی۔ لڑکے اب بھی اس پر نگاہیں جمائے کھڑے تھے۔

"آیئے پلیز۔ اعتبار کریں مجھ پر۔"

اور اریب بنا کچھ کہے اس کے ساتھ چل پڑی۔ ایبک نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ اس کے لیے کھولا۔ اور خود چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ ایبک نے ایک گہرا سانس لے کر گاڑی آگے بڑھادی۔

"آپ یہاں کس کام سے آئی تھیں؟"

ایبک نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے ذرا سا رخ موڑ کر اریب کی طرف دیکھا جو شولڈر بیگ گود میں رکھے مضطرب سی اس کے اسٹرپ کو انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔

"وہ میری ایک فرینڈ رہتی ہے ادھر۔ میرے نوٹس اور بکس اس کے پاس تھیں۔ وہ ہر روز کالج لانا بھول جاتی تھی تو۔"

وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بولتے ہوئے ایک دم چپ ہو گئی تھی۔ ایبک جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے خاموش ہونے پر وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کو عمر یا ہمدان کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔ یوں اکیلے۔ آپ کو تو یہاں کے راستوں کا بھی صحیح طرح سے علم نہیں ہے۔"

"وہ میں اپنی فرینڈ کے ساتھ آئی تھی ادھر اکیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے کہا تھا' وہ واپس مجھے گھر چھوڑ جائے گی۔ لیکن اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے ابو اور امی کہیں گئے ہوئے تھے۔ گاڑی نہیں تھی گھر پر۔"

وہ پھر تیز تیز بول رہی تھی' گھبرائی گھبرائی سی۔

"تو عمر کو ہی بلوالیتیں۔"

"وہ عروج' میری دوست کہہ رہی تھی کہ ابھی پاپا آجائیں گے تو وہ مجھے ان کے ساتھ جاکر چھوڑ آئے گی۔ اب شام ہونے لگی تھی تو میں خود ہی نکل آئی۔ عروج نے بتایا مجھے کہ کون سے نمبر کی بس یا وین جائے گی ماڈل ٹاؤن کی طرف۔"

"بہرحال آپ کو محتاط رہنا چاہیے اریب فاطمہ! آپ اس طرح کسی اجنبی پر بھروسا نہیں کرسکتیں۔" ایبک سنجیدہ تھا۔

"وہ اجنبی نہیں' میری دوست ہے۔"

"جو لڑکی آپ کے نوٹس لے کر آپ کو واپس دینا بھول جاتی ہے' وہ آپ کی دوست کیسے ہوسکتی ہے اریب فاطمہ! آئندہ اسے اپنے نوٹس مت دیجیے گا۔"

ایبک نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور وہ بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ کچل رہی تھی۔

"پلیز! اپنی آنکھوں اور ہونٹوں پر ظلم نہ کریں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ صرف سمجھایا ہے آپ کو۔ پھر بھی برا لگا ہو تو سوری۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" اس نے جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔ "مجھے برا نہیں لگا۔ بالکل بھی برا نہیں لگا۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ مجھے اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا اس کے ساتھ۔ میں بہت بے وقوف ہوں۔"

"دریں چہ شک است!" ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"میں کبھی کبھی یونہی بلا سوچے سمجھے۔۔۔"

اس کی آنکھوں کی سطح پھر گیلی ہونے لگی تو اس نے جلدی سے چادر کے پلو سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ایبک کے لبوں پر ٹھہری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"بابا جان کیسے ہیں اور آپ کب آئے؟" اسے ایک دم خیال آیا تھا۔

"بابا جان ٹھیک ہیں اور میں کل ہی آیا تھا۔"

اس نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اریب نے فوراً نظریں جھکالیں۔ اس کا دل ایک دم زور سے دھڑکا۔ اتنی دیر میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ ایبک کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہے۔ اور اگر مائرہ آنٹی ایسے میں مجھے دیکھ لیں تو۔۔۔

اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ اور اس نے دایاں ہاتھ بے اختیار اپنے دھڑکتے دل پر رکھا۔

"نہیں!" وہ آہستہ سے بولی "آپ مجھے اسٹاپ پر ہی اتار دیجیے گا۔"

"کیوں؟" ایبک پوچھنا چاہتا تھا لیکن پھر یکدم رک گیا۔

"اوکے۔۔۔ لیکن آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں اریب فاطمہ؟"

اریب فاطمہ نے ایک شاکی نظر اس پر ڈالی۔

"کیا وہ نہیں جانتا کہ مائرہ آنٹی ۔۔۔۔ شاید اس روز میں نے اسے انکل شیر دل کے گھر میں بتایا تو تھا۔" ایبک نے اس کی نظروں کی شکایت پڑھی۔ اور نرمی سے کہا۔

"زندگی یوں ڈر ڈر کر نہیں گزر سکتی اریب فاطمہ! ڈرنے والوں کو لوگ زیادہ ڈراتے ہیں۔"

"اور اماں اس کے بالکل برعکس بات کرتی ہیں۔ اماں اور ایبک شاید دونوں کے اپنے اپنے تجربے ہیں۔"

اس نے سوچا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سیاہ چادر میں خود کو چھپائے ہاتھ گود میں رکھے شولڈر بیگ پر دھرے وہ ذرا سا رخ موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایبک نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود دل میں اتری جارہی تھی۔۔۔

"اریب فاطمہ! آپ اتنی نایاب اور انمول ہیں کہ کسی بھی دل کی خواہش ہوسکتی ہیں اور کاش میں آپ کو یہ بتا سکتا۔"

ایبک نے سوچا اور گاڑی روک دی۔

"لیجیے آپ کا اسٹاپ آگیا۔"

"شکریہ۔" اس نے ۔۔ بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ اور چادر سنبھالتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

"اریب فاطمہ!" ایبک نے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ "پتا نہیں کیوں حور عین کا سراپا لکھتے ہوئے تمہارا سراپا میرے سامنے آجاتا ہے۔"

وہ اسٹیرنگ پر بازو رکھے۔ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ سیدھا ہوا۔

اس کا "الریان" جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ صرف بابا جان کے لیے الریان جاتا تھا اور اب بابا جان الریان میں نہیں تھے تو۔۔۔

اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔ لیکن یوٹرن لے کر وہ پھر واپس آرہا تھا بالکل غیر ارادی طور پر اس نے گاڑی موڑی تھی۔

اندر کہیں اسے مزید دیکھنے کی طلب جاگی تھی یا جانے کیا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ الریان کے گیٹ کے سامنے موجود تھا۔ لیکن نہ تو اس نے ہارن دیا تھا' نہ ہی وہ گاڑی سے اترا تھا۔۔۔

"شاید احسان ماموں گھر پر ہوں اور انہیں میرا آنا اچھا نہ لگے۔ ہمدان نے بتایا تھا کہ احسان ماموں بابا جان کے بہاول پور جانے پر بہت ناراض ہوئے تھے۔" یکدم اسے خیال آیا تھا۔

"تو میرا خیال ہے۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔" اس نے سوچا۔ تب ہی گیٹ کھلا اور اندر سے عمر احسان باہر آیا۔ اور اس کی گاڑی دیکھ کر تیزی سے گاڑی تک آیا۔

"آپ کب آئے ایبک بھائی! اور بابا جان کیسے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے۔ کب آئیں گے وہ۔۔۔؟ اور آپ یہاں کیوں رک گئے۔ گاڑی اندر لے آیئے نا۔ میں گیٹ کھولتا ہوں۔" خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ارے نہیں عمر! بس میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا۔ آپ لوگوں کی خیریت پوچھتا چلوں۔۔۔ اب تم سے باہر ہی ملاقات ہوگئی ہے تو اندر نہیں آؤں گا۔۔۔ سب ٹھیک ہیں نا۔ عاشی بابا جان کو بہت یاد کرتی ہوگی۔ اسے بتا دینا۔ بابا جان دو تین روز تک آجائیں گے۔"

اس کی اتنی لمبی چوڑی بات عمر احسان نے بڑے دھیان سے سنی تھی اور کوئی جواب دیے بغیر گیٹ کھول دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ عمر احسان اسے یوں "الریان" کے روڈ سے واپس آنے دیتا اور عمر احسان کے اصرار پر وہ گاڑی باہر ہی لاک کر کے اس کے

ساتھ اندر آگیا تھا۔

اور پھر سب ہی لونگ روم میں جمع ہوگئے تھے۔ منیبہ، حفصہ، ہمدان، زبیر عاشی سب ہی بابا جان کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

"یار! میں تو ایک دو روز میں بہاول پور آنے والا تھا۔" ہمدان نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بابا بھی کہہ رہے تھے شاید وہ بھی چلیں۔"

"ریلی!" ایبک کو بے حد خوشی ہوئی "بابا بہت خوش ہوں گے ہومی! تمہیں پتا ہے نا وہ مصطفیٰ انکل کو کتنا یاد کرتے ہیں۔"

عاشی نے جو تقریباً" منیبہ کے پیچھے چھپی ہوئی تھی سر تھوڑا سا آگے کرکے ایبک کو دیکھا۔

"ایبک بھائی! آپ ہمارے بابا جان کو اپنے ساتھ کیوں لے گئے ہیں؟"

"ارے عاشی گڑیا! آپ اداس نہ ہوں۔ بابا جان دو چار روز میں آجائیں گے۔"

"لیکن مائرہ مامی تو کہتی ہیں وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ ادھر ہی رہیں گے بہاول پور۔"

"کاش ایسا ہو کہ وہ وہیں رہ جائیں ماما اور بابا کے پاس۔"

ایبک نے دل گرفتی سے سوچا اور عاشی کی طرف دیکھا۔

"نہیں گڑیا رانی۔! وہ آجائیں گے۔"

ایبک نے لونگ روم میں موجود سب چہروں پر نظر ڈالی وہ ان میں نہیں تھی۔۔۔ وہ بھی کھڑا ہوگیا۔

"او کے۔ میں چلتا ہوں۔"

"ارے کہاں چلے!" ہمدان نے جو اپنے دھیان میں ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ حالانکہ آواز بند تھی اور صرف تصویریں نظر آرہی تھیں، چونک کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"گھر۔۔۔ انکل شیر دل انتظار کرتے ہوں گے۔ میں نے انہیں۔۔۔"

"تو فون کردو انہیں۔۔۔" ہمدان نے اس کی بات کاٹی "اتنے دنوں بعد تو ملاقات ہوئی ہے اور ہم نے ابھی کوئی بات بھی نہیں کی۔"

"اور اتنی دیر سے آپ ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایبک بھائی کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہے۔" عمر احسان کو ہمدان کا ایبک کی موجودگی میں ٹی وی کی طرف اتنی توجہ سے دیکھنا بہت برا لگا تھا۔

ایبک نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اسے اپنا یہ جذباتی سا ماموں زاد بھائی بہت عزیز تھا۔

"بیٹھ جاؤ یار!" ہمدان نے پھر اصرار کیا تو وہ بیٹھ گیا۔ حفصہ چائے کا کہنے باہر چلی گئی۔

"ایبک بھائی! بابا جان کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ آپ کو پتا ہے نا۔ عثمان چچا اور چچی جان کے جانے میں تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں اور ان کا پروگرام عادل بھائی اور حفصہ کی منگنی کا بھی تھا۔"

سب کی فکر اور خیال رکھنے والی منیبہ کی ہر بات پر نظر ہوتی تھی۔

"بابا جان کو علم ہوگا۔ ان کی بات ہوتی رہتی ہے۔ مصطفیٰ انکل اور عثمان انکل سے۔" ایبک بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔

اور تب ہی ایبک کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ دائیں ہاتھ سے پیشانی پر آئے بال پیچھے ہٹاتی ہوئی وہ اندر آرہی تھی۔ لیکن پھر وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے گلے میں لٹکتے دوپٹے کو سر پر لیا اور واپس جانے لگی۔ اور عین اسی لمحے منیبہ کی نظر بھی اس پر پڑی تھی۔

"ارے اریب! کہاں جارہی ہو۔ یہ ایبک بھائی آئے ہیں ان سے نہیں ملوگی۔"

ایبک اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اریب فاطمہ نے نظریں اٹھائیں اور پھر فوراً" ہی جھکالیں۔ لانبی پلکوں کا سایہ رخساروں پر لرزنے لگا۔

"کیسی ہیں آپ؟" اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے ایبک نے شرارت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"ربا آپی! آپ کب آئیں۔ میں آپ کا انتظار کررہی تھی۔" ایبک کے پاس بیٹھے بیٹھے عاشی نے پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے ہی آئی ہوں۔" وہ جانے کے لیے پلٹی۔

"کہاں جارہی ہو اریب! کتنے دنوں بعد یہاں سب اکٹھے ہوئے ہیں۔ ورنہ جب سے بابا جان گئے ہیں جیسے "الریان" میں ویرانی ہی چھاگئی ہے۔"

اریب جھجکتی ہوئی سی آکر منیبہ کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ ایبک کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ وہ ہمیشہ منیبہ کے پیچھے چھپ کر بیٹھتی تھی۔

"ایبک بھائی! آپ کھانا کھا کر جایئے گا۔" حفصہ صافی سے ہاتھ پونچھتی ہوئی لاؤنج کے دروازے تک آئی تھی۔

"ارے نہیں! کھانے تک نہیں رکوں گا۔ بس چائے پلوادیں۔۔۔"

"چائے تو خیر آرہی ہے لیکن آپ کھانا بھی کھا کر جایئے گا۔"

شکر ہے "آج "الریان" کے کسی ایک فرد کو تو ایبک بھائی کو کھانے تک روکنا یاد رہا۔" عمر احسان نے با آواز بلند سوچا۔

"ارے عمر! میں نے تم سے کچھ منگوایا تھا۔ ابھی تک گئے نہیں۔۔۔" حفصہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"جارہا ہوں۔"

"باقی سب لوگ کہاں ہیں؟" ایبک نے پاس بیٹھے ہمدان مصطفیٰ سے پوچھا تھا لیکن جواب عمر کی طرف سے آیا تھا کہ "الریان" کے متعلق ساری خبریں اکثر وہی دیا کرتا تھا۔

"پاپا تو اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ مصطفیٰ انکل ابھی آفس سے ہی نہیں آئے جبکہ عثمان انکل، چچی جان بشنا آنٹی شاپنگ کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ عادل بھائی کے ساتھ۔۔۔ مرینہ بی بی سورہی ہیں غالباً" کیونکہ کچھ دیر پہلے ان کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ان کے خراٹوں کی آواز سنی تھی۔۔۔

جبکہ پرنسز رابیل احسان شاہ اور کوئین مائرہ احسان شاہ اپنے اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

"یہ عمر بھی نا!..."

منیبہ نے مسکرا کر پاس بیٹھی اریب فاطمہ کو دیکھا تھا جو دوپٹے کے ایک کونے کو اپنی انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔

"فاطمہ!" منیبہ کبھی کبھی اسے فاطمہ کہہ کر بلاتی تھی اور اریب کو بہت اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ اماں بھی کبھی کبھی اسے فاطمہ کہہ کر بلاتی تھیں۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ ایبک عاشی کے گرد ایک بازو حمائل کیے چپکے چپکے اس سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔

عاشی ایبک کے آنے سے کتنا خوش ہو گئی ہے۔ ورنہ بابا جان کے جانے کے بعد کتنا کملا گئی تھی۔ حالانکہ سب ہی اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ عثمان انکل اور مصطفیٰ انکل گھر آتے ہی پہلے اس کا پوچھتے تھے۔ اور کیا ہی اچھا ہو اگر ایبک ہر روز الریان آ رہا ہے جب تک وہ یہاں ہے۔ عاشی بھی خوش رہے گی۔" اس نے سوچا۔

"کیا صرف عاشی یا تم بھی اریب فاطمہ؟" دل نے سرگوشی کی تو وہ یکدم گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے رکو تو۔ کہاں جا رہی ہو۔ حفصہ چائے لا رہی ہے۔" منیبہ کو بھول گیا کہ وہ اس سے کیا بات کرنے والی تھی۔

"وہ میں مرینہ کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ اسے فلو ہو رہا تھا نا۔ کیا پتا جاگ رہی ہو۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

عاشی سے باتیں کرتے کرتے ایبک نے سر اٹھا کر اسے جاتے دیکھا۔ وہ یہاں موجود تھی تو جیسے دل کے اندر خود بخود ہی جلترنگ بج رہے تھے اور وہ چلی گئی تھی تو اندر ایک دم خاموشی ہو گئی تھی۔

"مان لو ایبک فلک شاہ! کہ تم اس لڑکی اریب فاطمہ کے لیے دل میں کچھ خاص جذبات رکھتے ہو۔ بھلے اوپر سے کتنا بھی انکار کرو۔"

اس نے خاموش بیٹھے ہمدان کی طرف دیکھا جو پُرسوچ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور سوچا کہ یہ ہمدان آج اتنا چپ چپ سا کیوں ہے۔

"کیا بات ہے ہومی! تم کچھ خاموش سے ہو۔ سب ٹھیک ہے نا؟" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں!" ہمدان چونکا۔ "بس یونہی سستی سی ہو رہی ہے۔ تم کچھ دن رکو گے یا..."

"رکوں گا... دو دن یا شاید زیادہ۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کل آؤں گا تمہاری طرف..."

ایبک نے بغور اسے دیکھا۔ کوئی بات تھی ضرور جو ہمدان مصطفیٰ کو پریشان کر رہی تھی۔

تب ہی حفصہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی اندر آئی تھی۔

"چائے آ گئی۔" ہمدان مصطفیٰ کے کندھے سے سر ٹکائے اونگھتا ہوا زبیر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

ایبک فلک شاہ کا دل یکایک اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ چائے پی کر رکا نہیں تھا۔ حالانکہ سب نے ہی بے حد اصرار کیا تھا۔

اور سب کو خدا حافظ کہہ کر وہ تیز تیز چلتا ہوا جا رہا تھا' جب اپنے کمرے کی کھڑکی سے رابیل احسان نے اسے جاتے دیکھا۔

یہ تو ایبک تھا...

وہ تھوڑا سا آگے کو جھکی۔ اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا اور اس کی کھڑکی سے پورچ لان اور گیٹ نظر آتا تھا۔

"ایبک اور عمارہ پھپھو اتنے برے ہرگز نہیں ہیں جتنا مما انہیں سمجھتی ہیں۔"

اس نے عمر اور ہمدان کو اس کے پیچھے گیٹ تک جاتے دیکھا اور مڑ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"اور مما تو یونہی ہر ایک سے فوراً" بدگمان ہو جاتی ہیں۔ جیسے اریب فاطمہ سے ہوئیں حالانکہ وہ بے چاری تو وہاں اپنے گاؤں کی لڑکی سے ملنے گئی تھی اور مما نے پوری کہانی بنا لی۔ شکر ہے ان کی غلط فہمی دور ہوئی۔"

اس نے تکیے کے پاس پڑی کتاب اٹھالی۔ تب ہی مائرہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔

"ایبک آیا ہوا ہے نیچے۔" مائرہ نے اسے مخاطب کیے بغیر کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا اب کیوں آیا ہے یہاں۔ پہلے تو بابا جان سے ملنے کا بہانہ تھا اور اب۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"مجھے منیبہ سے کام تھا کوئی اور اب نہ جانے کب تک بیٹھے گا وہ۔"

"وہ چلا گیا ہے مما!" رابیل نے سر اٹھا کر مائرہ کو دیکھا۔

"کیا تم اس سے ملنے نیچے گئی تھیں۔"

"نہیں۔"

"تو تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ چلا گیا ہے۔"

"کھڑکی سے دیکھا تھا اسے جاتے ہوئے کچھ دیر پہلے۔" وہ بیزار ہوئی اور نظریں کتاب پر جمادیں۔

"تم جانتی ہو نا رابی! تمہارے پپا عمارہ، ایبک اور اس کے باپ کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ نفرت کرتے ہیں ان سے۔"

"حالانکہ الریان کا ہر فرد ان سب سے محبت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ عمر اور زبیر بھی۔" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ مائرہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے اس طرح مت دیکھیں مما!" وہ مزید بیزار ہوئی "مجھے ایبک یا اس کے خاندان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اوکے!" مائرہ نے پُرسکون ہوتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور کھڑی ہو گئیں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟"

"یونہی موئی سے ایک ناول لیا تھا پڑھنے کے لیے۔"

اور موئی کے نام پر اسے یاد آیا کہ وہ تو منیبہ کی طرف جا رہی تھیں۔ پھر ایبک کا سن کر رک گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے تم پڑھو۔ میں ذرا نیچے جا رہی ہوں۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئیں تو رابیل نے کتاب کھول لی لیکن وہ غیر ارادی طور پر ایبک اور عمارہ پھپھو کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ "پتا نہیں مما اور پپا ان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ شاید عمارہ پھپھو اور انکل موی نے انہیں کبھی کوئی دکھ پہنچایا ہو... کوئی گہرا دکھ۔"

اور سیڑھیاں اترتے ہوئے مائرہ سوچ رہی تھیں کہ "مجھے جلد از جلد احسان اور مصطفیٰ بھائی سے ہمدان کے لیے بات کر لینا چاہیے... تاکہ رابیل کا دھیان ادھر ادھر نہ ہو۔ لیکن پہلے مجھے موئی سے بات کرنا چاہیے کہ ہمدان کا کیا خیال ہے رابی کے متعلق۔"

وہ اپنے دھیان میں سیڑھیاں اتر رہی تھیں کہ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ان کی نظر اریب فاطمہ پر پڑی۔ جو لاؤنج میں کونے والے صوفے پر تنہا بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور اس کی گود میں کتاب کھلی پڑی تھی۔

وہ وہیں سیڑھی پر ٹھٹک کر رک گئیں۔

یہ لڑکی تو جیسے یہاں آ کر روز بروز نکھرتی جا رہی ہے۔

تب ہی ہمدان لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آیا تھا... اور ادھر ادھر دیکھے بغیر لونگ روم میں چلا گیا تھا۔ اریب فاطمہ نے چونک کر ہمدان کو جاتے دیکھا اور پھر اس کی نظر سیڑھیوں پر کھڑی مائرہ پر پڑی تو وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔ کتاب اس کی گود سے نیچے گر پڑی۔

"تم یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" اس کے قریب آ کر مائرہ نے سخت لہجے میں پوچھا۔ اریب فاطمہ گھبرا گئی۔

"وہ بس یوں ہی، میں یہاں بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔"

"سنو لڑکی! میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا۔"

مائرہ نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا تو اریب فاطمہ کو حیرت ہوئی اس نے تو اس روز کے بعد سے ہمدان سے کبھی بات تک نہ کی تھی اور اگر اسے علم ہوتا کہ ہمدان سب کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے تو وہ منیبہ اور حفصہ کے اصرار کے باوجود وہاں نہ جاتی تھی۔

"یہ لڑکوں والا گھر ہے اریب فاطمہ! تمہیں محتاط ہو کر رہنا چاہیے۔ ایسی جگہوں پر مت بیٹھا کرو کہ

ادھوری رہ گئی۔ ایک بار مروہ آنٹی نے اسے بتایا تھا۔ آنکھوں میں اٹکے آنسو رخساروں پر پھسل گئے تھے اور عین اسی لمحے ایبک فلک شاہ اور عمر احسان نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔

"ایبک بھائی! آپ یہاں رکیں۔ میں چابی لے کر آتا ہوں۔" عمر نے ایبک سے کہا اور لونگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی نظر کونے میں کھڑی اریب فاطمہ پر نہیں پڑی تھی لیکن ایبک نے اچانک ہی دائیں طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی نظر اریب فاطمہ پر پڑی۔ اریب فاطمہ کے رخسار آنسوؤں سے بھیگتے جا رہے تھے اور وہ ساکت کھڑی تھی۔ اریب فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اریب فاطمہ رو رہی تھی۔

وہ مضطرب سا ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا اریب فاطمہ!" اضطراب اس کے لہجے سے چھلکتا تھا۔

ساکت کھڑی اریب فاطمہ کے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ایبک کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ لرزے۔

"اریب فاطمہ! تمہارے آنسو مجھ سے سہے نہیں جاتے۔ مت رویا کرو۔"

اس کے کانوں میں جیسے کسی نے سرگوشی کی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ اونچا کیا۔ رخساروں پر بہتے آنسو پونچھنے کے لیے اور پھر یکدم کچھ کہے بنا وہ جھکی اور زمین پر پڑی کتاب اٹھا کر تیزی سے سامنے منیبہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ایبک نے پریشانی سے اسے جاتے دیکھا۔ ایک لمحہ کو اس کا جی چاہا' وہ اس کے پیچھے جائے اور اس سے رونے کا سبب پوچھے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ وہیں رک گیا اور ونگ روم سے آتے عمر کو دیکھنے لگا جس کے ہاتھ میں اس کی گاڑی کی چابی تھی۔

"یہ لیجیے ایبک بھائی! وہیں صوفے پر پڑی تھی جہاں آپ بیٹھے تھے۔"

ایبک نے چابی لے لی۔

وہ عمر اور ہمدان کے ساتھ "کریان" سے باہر نکلا

ائے جاتے کی نظریں تم پر پڑیں اور خوامخواہ میں کوئی بات بنے۔ اور تم بھی اپنی ماں کی طرح۔ اپنی ماں کا قصہ تو تمہیں پتا ہی ہوگا نا۔"

"ماں کا قصہ۔۔۔ کیا قصہ؟" اس نے بے حد حیران ہو کر سوچا۔

"پتا نہیں یہ مروہ مامی نے بھی تمہیں یہاں کیوں بھیج دیا۔ وہاں رحیم یار خان میں ہی تمہیں ہاسٹل بھجوا دیتیں۔ پھر اتنا پڑھ لکھ کر تم نے کرنا بھی کیا ہے۔ شادی تو وہیں ہی ہونا ہے نا تمہاری ددھیال میں۔ سنا تھا تمہاری دونوں پھپھیاں تمہیں بہو بنانا چاہتی ہیں اور ان کے لڑکے ان پڑھ۔ چار جماعتیں بھی پاس نہیں کیں انہوں نے۔"

مائرہ نے اتنی لمبی چوڑی بات کر کے ساکت کھڑی اریب کی طرف دیکھا۔ جو اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مائرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سوالیہ نظریں بار بار مائرہ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی "کیا قصہ۔ اماں کا بھلا کیا قصہ ہے؟" لیکن یکدم امڈ آنے والے آنسوؤں نے اس کا حلق بند کر دیا تھا۔ اس نے جیسے مائرہ کی مزید کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ تو ان ہی دو لفظوں میں الجھی ہوئی تھی۔ مائرہ بات مکمل کر کے وہاں رکی نہیں تھیں اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی لاؤنج سے چلی گئی تھیں۔ لیکن وہ وہاں ہی کھڑی تھی' ساکت آنسو اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھلملا رہے تھے اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔

"یہ مائرہ آنٹی نے کیا کہا اور کیوں؟" اسے کبھی کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر کبھی کوئی بات ہوئی ہوتی تو کیا ابا اور ان کی بہنیں بار بار نہ دہراتیں جبکہ وہ اماں کی معمولی سی بات کو مہینوں دہراتی تھیں۔

اماں نے کنیرڈ سے ایف۔ ایس۔ سی کیا تھا پھر فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ لیکن پھر اپنے والد کی وفات کی وجہ سے انہیں رحیم یار خان آنا پڑا اور ان کی شادی اچانک ابا سے ہو گئی اور ان کی تعلیم

ہی تھا کہ اسے ملک صاحب اپنے گیٹ سے باہر آتے ہوئے نظر آگئے تو وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ ملک صاحب اسے بتا رہے تھے کہ وہ گھر فروخت کرکے اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا جا رہے ہیں۔۔۔ جیسے ہی گھر بکا' وہ چلے جائیں گے۔ ہمدان انہیں بات کرتا چھوڑ کر واپس اندر چلا گیا تھا جبکہ عمر وہیں کھڑا رہا تھا۔ اور جب ملک صاحب سے اجازت لے کر وہ گاڑی تک آیا اور اس نے چابی کی تلاش میں پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو اسے یاد آیا کہ چابی تو شاید وہ اندر ہی صوفے پر چھوڑ آیا ہے۔

اس نے عمر کا بازو تھپتھپایا اور لاؤنج کا دروازہ کھولتا تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"اریب فاطمہ رو رہی تھی۔

وہ کیوں رو رہی تھی۔

وہ مروہ پھپھو کے پاس کیوں رہتی تھی۔ اور پھر یہاں۔۔۔"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔

وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ منیبہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ مروہ پھپھو کے پاس رہتی تھی۔ مروہ پھپھو نے اسے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا۔ اور اس کے والدین گاؤں میں رہتے ہیں۔

یکایک بہت شدت سے اس کے دل میں اس کے متعلق جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کا رونا اور اس کے آنسو اسے بہت تکلیف دیتے تھے۔

"کاش وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ سکتا۔"

بے اختیار اس کے دل نے خواہش کی اور وہ چونک اٹھا۔ پھر اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اریب فاطمہ! میں سچ مچ تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور کون جانے تم کب یہ جان پاؤ گی۔" اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوئی۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کرکے جب وہ اپنی انیکسی کی طرف جا رہا تھا تو اسے کرنل شیر دل لان میں مل گئے تھے۔

"بہت دیر کردی۔ کیا بہت بڑا فنکشن تھا۔ زیادہ گیدرنگ تھی؟"

اس کے ساتھ ساتھ چلتے کرنل شیر دل نے پوچھا۔

"نہیں! زیادہ لوگ نہیں تھے اور کتاب پر تبصرہ بھی صرف چند لوگوں نے کیا تھا۔۔۔ میں دراصل "الریان" چلا گیا تھا۔"

"تمہیں بھی اپنے بابا کی طرح "الریان" سے عشق ہوتا جا رہا ہے۔"

کرنل شیر دل مسکرائے تو وہ بھی مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرایا۔

"ہاں! اب بتاؤ۔ میرے یار! کیا حال ہے۔"

انیکسی کے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کرنل شیر دل نے بغور اسے دیکھا۔

"بابا خوش ہیں بہت اور مضطرب بھی۔ کبھی کبھی ایک دم رو پڑتے ہیں۔۔۔"

"ہاں! میں سمجھ سکتا ہوں' وہ کن کیفیات سے گزر رہا ہوگا۔ گزرا ہوا وقت پلٹ تو نہیں سکتا لیکن کاش ٹوٹے سارے رشتے پھر سے جڑ جائیں۔ احسان شاہ کے شک اور بے اعتباری نے میرے دوست کو مار ڈالا۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر میز پر پڑا اخبار اٹھا لیا۔

"چور' چوری سے چلا جائے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا ابیک!" کرنل شیر دل نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ جو کافی بنانے کچن کی طرف جا رہا تھا' پلٹ پڑا۔

"مطلب یہ میری جان! کہ تم نے سیاست میں حصہ نہ لینے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے' اپنے باپ سے۔"

"تو۔۔۔؟" ابیک نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یہ اپنا کالم دیکھا ہے۔ یار! اپنے قلم کی دھار ذرا کم کرلو۔ تمہارے اکثر کالم پڑھ کر میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔"

"انکل شیر دل!" ابیک سنجیدہ ہوا۔ "کیا ہم اپنی قوم کے لیے آنسو بھی نہیں بہا سکتے۔ یہ سب کچھ جو ہمارے وطن میں ہو رہا ہے اور ہمارے عوام جس دکھ سے گزر رہے ہیں' کیا اس پر کچھ لکھنا بھی جرم ہے۔"

"نہیں! لیکن مجھے تمہارے قلم کی کاٹ سے ڈر لگتا ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ بس بوڑھے لوگوں کے دل کمزور ہوتے ہیں۔ مجھے وہ رات بھی نہیں بھولتی جب تمہاری مخالف پارٹی کے لوگوں نے تمہیں مار مار کر زخمی کر دیا تھا۔ تب پہلی بار مجھے اور تمہارے بابا کو پتا چلا تھا کہ تم نے کوئی سیاسی پارٹی جوائن کرلی ہے۔"

"ہاں۔۔۔!" ابیک کو بھی بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ اپنی اس اسٹوڈنٹ لائف میں وہ بہت پرجوش ہوا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ نوجوانوں کو سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔ لیکن پھر اس حادثے کے بعد اسے بابا سے وعدہ کرنا پڑا تھا کہ وہ کبھی سیاست میں حصہ نہیں لے گا۔ لیکن شاید انکل شیر دل سچ ہی کہہ رہے تھے۔ چور چوری سے چلا جائے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ ملکی سیاست پر اس کی گہری نظر تھی اور اس کے کالم کافی مقبول تھے۔

وہ عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ وعدے کی زنجیر سے بندھا تھا۔ سو اس نے قلم تھام لیا تھا اور ایک مشہور اخبار میں پچھلے تین سال سے وہ اے شاہ کے نام سے کالم لکھ رہا تھا۔

اور کرنل شیر دل کے علاوہ اس کے جاننے والوں میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اے شاہ۔ ابیک فلک شاہ ہی ہے۔

اخبار ہاتھ میں لیے لیے کرنل شیر دل کھڑے ہوگئے۔

"ارے! آپ کہاں چلے۔ میں آپ کے لیے کافی بنانے جا رہا تھا۔"

"نہیں یار! اس وقت کافی پی لی تو رات بھر نیند نہیں آئے گی اور سنو' تمہاری آنٹی نے کھانے پر کچھ خاص اہتمام کر رکھا ہے تمہارے لیے۔ تم ادھر ہی آجاؤ' چینج کرکے۔"

"لیکن مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔"

"تمہاری آنٹی کو تمہارے نہ آنے سے مایوسی ہوگی۔ تھوڑا سا کھا لینا۔"

کرنل شیر دل اسے تاکید کرکے چلے گئے۔ تو وہ پھر بیٹھ گیا۔

"کاش بابا نے مجھ سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں اپنی ایک سیاسی پارٹی بناتا۔ جس میں صرف محب وطن' مخلص اور دیانت دار لوگ شامل ہوتے۔ قائداعظم جیسے لوگ۔"

اس کے دل میں کہیں کسی پچھتاوے کا احساس جاگا تھا۔ "تمہارے یہ خالی خولی لفظ تو ایک چیونٹی تک نہیں مار سکتے اور دشمن ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں۔" اور اسے یاد آیا' بابا نے ایک بار کہا تھا۔

"حق نواز بھی تمہاری طرح کی باتیں کرتا تھا اور اس نے بھی ایک یوٹوپیا بنا رکھا تھا۔ یہ سب باتیں ہیں محض۔ اس ملک میں تم صرف ایسے خواب دیکھ سکتے ہو۔ لالچ ان کی ہڈیوں میں گھس گیا ہے اور گودے میں شامل ہو گیا ہے۔"

ایک گہری سانس لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنی فائل نکالی اور چند لکھے ہوئے صفحات پر سرسری سی نظر ڈال کر اس نے کاغذ کلپ بورڈ پر لگائے اور لکھا۔

"اور جب حورعین پیدا ہوئی تو چوہدری غلام فرید کی حویلی میں ماتم بپا ہو گیا اور چوہدری غلام فرید کی دونوں بہنوں نے بین کیے اور بھائی کے نصیب پر دھاڑیں مار مار کر رونے کا ڈراما کیا اور خود چوہدری غلام فرید سات دن تک گھر نہیں آیا اور ساتویں دن جب اس نے گھر میں قدم رکھا تو اس نے حورعین کی طرف دیکھا تک نہیں جو مریم کی گود میں لیٹی تھی اور مریم اسے تھپک

رہی تھی۔ نہ مریم نے پوچھا کہ وہ کہاں تھا اور نہ اس نے بتایا۔

مریم کو سوال کرنے کی عادت نہ تھی اور چوہدری فرید نے یہ بتانا ضروری نہ سمجھا تھا کہ وہ پانچویں بیٹی کا غم بھلانے کس چوبارے پر گیا ہوا تھا۔

"چوہدری غلام فرید اتنا ظالم بھی نہیں تھا حورعین! جتنا تم ثابت کرنا چاہتی ہو۔" میرے لبوں سے بے اختیار نکل گیا تھا۔ "نہ اس نے دوسری شادی کی' نہ مریم کو طلاق دی۔"

"ہاں...!" اس نے ایک ناراض سی نظر مجھ پر ڈالی۔ "ہاں کیونکہ مریم اپنے ساتھ چار مربع زمین لائی تھی اور اس کے تینوں بھائی بہت طاقت ور تھے۔ وہ چوہدری فرید کو ہرگز ایسا نہ کرنے دیتے اور خود غلام فرید کو بھی چار مربعوں کا لالچ تھا۔

چوہدری فرید بقول تمہارے ظالم نہیں تھا۔ لیکن مریم کو لگتا تھا۔" اس نے پھر ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی۔ "وہ اونچی دیواروں والے صحن میں کھڑی ہوتی تو گلی سے گزرنے والے داور سائیں کی آواز سن کر تڑپ کر دروازے تک آتی تھی اور داور سائیں اپنے میں مگن گاتا چلا جاتا۔

"میں نیل کرائیاں نیلکاں
میرا تن من نیلوں نیل
نی میں نیل کرائیاں"

اور مریم اپنے بازوؤں' اپنے چہرے اور اپنے جسم کے ہر نظر آنے والے حصے پر ہاتھ پھیرتی اور نہ نظر آنے والے نیل اسے اذیت دیتے تھے۔ زخم صرف وہی تو نہیں ہوتے جو نظر آتے ہیں۔

اس کے نیل بھی نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن اسے لگتا تھا جیسے اس کا پورا جسم نیلوں نیل ہے۔ چوہدری غلام فرید کی باتیں زخم لگاتی تھیں تو اس کی بہنوں کے طنز نیلوں نیل کر دیتے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتی جاتی اور دروازے سے لگی کھڑی سائیں کی درد میں بھیگی آواز کو سنتی رہتی۔

بالکل زمین کی طرح۔ چپ ساکت۔ لبوں پر مہر لگائے درد سہتی رہتی۔

اس کی گفتگو میں پھر زمین کا ذکر آ گیا تھا۔

زمین نے بہت دکھ سہے ہیں۔

اور ازل سے دکھ سہہ رہی ہے۔"

میں نے بے زاری سے اسے دیکھا۔ لیکن خاموش رہا۔ مجھے پتا تھا' میں کچھ کہتا تو وہ ناراض ہو کر چلی جاتی اور میں... میرا جی چاہتا تھا' وہ بولتی رہے۔

اور میں اسے سنتا رہوں۔

اور جب اس کی پلکیں بھیگنے لگیں اور موتیوں کے قطرے اس کے رخساروں پر ڈھلک آئیں تو میں ان موتیوں کو انگلیوں کی پوروں سے چن لوں۔

زمین نے بہت دکھ سہے ہیں۔

اس کے آنسو کبھی خشک نہیں ہوئے۔

"کیا زمین کو کبھی کوئی خوشی نہیں ملی' کیا وہ ہمیشہ روتی ہی رہی ہے۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"نہیں..." اس نے بے حد شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور سر سے ڈھلک جانے والی اوڑھنی کو اپنے سر پر ڈالا۔

"بہت بار وہ ہنسی بھی اور کھلکھلائی بھی۔ لیکن اس کے آنسو اس کی ہنسی سے بہت زیادہ ہیں اور اس کی خوشی اس کے دکھوں سے بہت کم۔"

"لیکن تم صرف اس کے آنسوؤں کا ذکر کرتی ہو۔"

"اس لیے کہ حورعین نے زندگی میں صرف آنسو ہی دیکھے ہیں۔ اپنی پیدائش سے لے کر اب تک۔ اس لیے اسے صرف آنسو ہی نظر آتے ہیں۔ تم شاعر ہو نا تو یہ بات تم بھی جانتے ہو گے نا کہ جس نے گلابوں کو چھوا ہی نہ ہو کبھی' وہ گلابوں کی نرماہٹ کو کیسے جان سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ تو صرف کانٹوں کی چبھن سے ہی آشنا ہوں گے نا پھر......

زمین اس وقت بے اختیار ہنسی تھی۔ جب حضرت آمنہؓ کی گود میں عرب کا چاند چمکا تھا۔

جب میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر پہلی بار اپنے پاؤں رکھے تھے تو زمین ان ننھے قدموں کو چومتی اور نثار ہوتی تھی اور خوشی سے جھوم جھوم جاتی تھی اور اس روز بھی جب۔

جب سراقہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کرتا ہوا ان تک پہنچا تھا اور آواز آئی تھی "یا ارض خذیہ"

(اے زمین اسے پکڑ لے۔)

اور سراقہ کے قدموں کو زمین نے جکڑا تھا۔

تو زمین خوشی سے رقص کرتی اور ناچتی تھی' تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"تم کیسے آدمی ہو۔ کیا تم نے کبھی تاریخ کے ایوانوں میں جھانک کر نہیں دیکھا؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے تاریخ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میری شرمندگی نے اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت بھر دی۔ پھر وہ سر جھکا کر اپنی انگلیوں سے زمین پر لکیریں ڈالنے لگی۔ الٹی سیدھی ٹیڑھی میڑھی۔ اس کی لانبی پلکوں کا سایہ اس کے صبیح رخساروں پر لرزتا تو دل چاہتا' اس منظر کو دل میں کہیں قید کر لوں۔

کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"اور اس رات جب مسلم بن عقیل اور ان کے بیٹوں ابراہیم اور محمد پر کوفہ کی زمین تنگ پڑ گئی تھی اور ان کا اور ان کے بچوں کا سرخ خون زمین میں جذب ہوتا تھا۔ تو زمین تڑپتی تھی۔"

اور اپنی تنگی پر شرمندہ ہوتی تھی۔

اور جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے خیمے کا چراغ بجھا دیا تھا اور جب وہ اپنے ہاتھوں سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے لخت جگر قاسم کو میدان جنگ میں روانہ کر رہے تھے اور جب علی اکبر کا خون کربلا کی ریت پر گرتا تھا اور جب علی اصغر کے حلقوم میں تیر پیوست ہوتے تھے اور جب حضرت عباسؓ کے بازو کٹے تھے اور وہ دانتوں میں مشک پکڑتے تھے اور جب شمر ذی الجوشن للکارتا تھا اور نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر مبارک کو ان کے تن سے جدا کیا جا رہا تھا تو جب زمین دھاڑیں مار مار کر روتی تھی اور اس کے آنسو سمندر بھرتے تھے۔

اور جب حضرت زینبؓ لٹے پٹے قافلے کو لے کر کربلا کے میدان سے نکلی تھیں۔ تو زمین کے آنسو سیلاب لاتے اور اس کی چیخیں عرش ہلاتی تھیں۔ آنسو جو نظر نہیں آتے تھے اور چیخیں جو سنائی نہیں دیتی تھیں۔"

اس نے سر جھکا کر اپنے گیلے چہرے کو اپنی اوڑھنی کے پلو سے پونچھا۔

"اور مریم بھی اسی طرح روتی تھی۔ اس کے اندر سے بھی چیخیں اٹھتی تھیں۔ لیکن نہ اس کے آنسو کسی کو دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

لیکن حورعین کو۔

جب اس نے بولنا شروع کیا تھا تو مریم کی گود میں لیٹے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کے رخساروں پر پھیرتی اور کہتی۔

"اماں! آپ تیوں (کیوں) لوتی (روتی) ہو؟"

اور مریم کی خشک آنکھوں میں حیرت اتر آتی۔ وہ اس کے ننھے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر بے تحاشا چومتی چلی جاتی اور اس کی خشک آنکھوں میں نمی سی پھیل جاتی۔

"میں تو نہیں روتی میری جان!" حورعین نے اسی عمر میں مریم کے نظر نہ آنے والے آنسوؤں کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔"

وہ بغیر رکے لکھتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی شاید فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ جب اس نے قلم رکھا تھا اور اپنے اکڑے ہوئے ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے دباتے ہوئے کرسی کی پشت پر سر ٹکتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرا رہا تھا۔

"اریب فاطمہ آئی لو یو۔"

اس نے زیر لب دہرایا اور ٹانگیں پھیلائیں۔ پھر

جانے کب وہ یوں ہی کرسی کی پشت پر سر رکھے رکھے ہی سو گیا۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو ہمدان اس کا کندھا جھنجھوڑ رہا تھا اور کھڑکی سے آنے والی سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رات وہ انیکسی کا دروازہ بند کیے بغیر ہی سو گیا تھا۔

"ہومی تم!" وہ گھبرا کر سیدھا ہوا تھا۔

"تم اس وقت۔ سب خیریت ہے نا۔"

"ہاں سب خیریت ہے۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ تم شاید رات بہت دیر سے سوئے تھے۔"

"ہاں!" اس نے پیچھے مڑ کر دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔

"کل تم سے باتیں نہیں ہو سکی تھیں۔ تم جلدی چلے آئے تھے اور مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔"

ہمدان مصطفیٰ کی آنکھیں چمکیں اور وہ ہولے سے مسکرایا۔ "تم جاؤ فریش ہو کر آجاؤ تو پھر سکون سے بات کرتے ہیں۔"

"اوکے۔" ایبک اٹھا اور اس نے ہمدان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ کو اور اس کی چمکتی آنکھوں کو۔

"مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے یار!"

ہمدان کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"کسی لڑکی کا چکر تو نہیں ہے۔ یہ مسکراہٹ، یہ چمک۔"

"ہاں ایبک فلک شاہ! مجھے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

ایبک جاتے جاتے پلٹ پڑا۔

"اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔ مجھے جسے تم اپنا سب سے بہترین دوست کہتے ہو۔"

"تم بہاول پور میں تھے نا جب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اس روز جب ماما نے مجھ سے رانی کے متعلق پوچھا تو مجھے لگا۔ نہیں رابیل نہیں، ہرگز نہیں، وہ تو کوئی اور ہے اور وہ میری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

اس کی آنکھوں کا حزن۔

اداسی کے غبار میں لپٹا اس کا وجود۔

اور اس کی غزالی آنکھوں میں ٹھہرا سہم۔ یوں جیسے اس نے کسی درد کو اوڑھ رکھا ہو اور کوئی گہرا دکھ اس کے دل کو چھیل رہا ہو۔"

ہمدان مصطفیٰ بتا رہا تھا اور ایبک فلک شاہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے دل کو کسی تیز دھار آلے سے کاٹے جا رہا ہو۔

"تو کیا وہ اریب فاطمہ سے اتنی شدید محبت کرتا ہے۔"

اس نے کرسی کی پشت پر مضبوطی سے اپنے ہاتھ جماتے ہوئے ہمدان مصطفیٰ کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی اور وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا تھا۔ یوں جیسے وہ اسے اپنے سامنے مجسم دیکھ رہا ہو۔

ایبک فلک شاہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا اور وہ ڈوبتے دل کو سنبھالے ہمدان کی طرف دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"مصطفیٰ! کیا وہ مجھ سے بہت خفا، بہت ناراض ہے کہ مجھ سے ملنے تک نہیں آیا۔ میں کتنے دنوں بعد بہاول پور سے آیا ہوں اور احسان آکر ملا تک نہیں۔ اس نے آکر پوچھا تک نہیں کہ بابا جان آپ کیسے ہیں۔" ان کی آواز بھر آگئی تو وہ خاموش ہو گئے۔

"بابا جان!" مصطفیٰ نے جو ان کے بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آجائے گا۔ وہ بھلا آپ سے دور رہ سکتا ہے۔ ابھی اس کو کچھ علم نہیں ہے۔ حقیقت کیا ہے۔"

"تو تم اسے حقیقت بتا کیوں نہیں دیتے کہ موی نے کچھ نہیں کیا۔ وہ خواہ مخواہ اس سے بغض لیے بیٹھا ہے۔"

"بابا جان! وہ کل سے مجھ سے بھی کہاں ملا ہے۔ ناراض ہے مجھ سے، اسے دکھ ہے کہ ہم نے اس کی پروا نہیں کی اور بہاول پور چلے گئے۔"

"اتنے سارے سال ہم نے صرف اس کی ہی تو سنی ہے۔ اسی کی تو مانی ہے۔" بابا جان کے لہجے سے ناراضی جھلکتی تھی۔ "ہم اگر اس کی نہ مانتے تو یہ اتنی لمبی جدائیاں ہمارا مقدر نہ بنتیں۔ تم اسے سمجھاؤ۔"

"جی بابا جان! میں سمجھاؤں گا۔"

مصطفیٰ نے آہستگی سے کہا۔ لیکن وہ جانتے تھے، یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ احسان شاہ ان کی کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ کل بہاول پور سے آئے تھے اور رات میں جب وہ احسان سے ملنے گئے تو مائرہ نے بتایا کہ وہ سو رہے ہیں۔ صبح آفس میں جب انہوں نے احسان شاہ سے بات کرنا چاہی تو وہ ضروری کام کا بہانہ کرکے آفس سے نکل گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ جان بوجھ کر انہیں اگنور کر رہے ہیں۔

"اگر وہ گھر پر ہے تو اسے بلاؤ۔ مجھے خود اس سے بات کرنا ہے۔ غضب خدا کا! اس نے ایک عورت کی باتوں میں آکر ہماری زندگیوں میں سے چھبیس سال نکال لیے۔ چھبیس سال ہم اپنی عمو اور موی سے دور رہے۔ اس نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ ہماری عمو بھی ہمیں اتنی ہی پیاری ہے جتنی کہ اسے اپنی بیٹی رابیل۔"

"بابا جان پلیز، مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا سب ٹھیک ہو جائے گا مصطفیٰ!" انہوں نے دل گرفتی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے نیچے سے نکالا۔ "وہ وقت واپس آجائے گا جو گزر گیا۔ تمہاری اماں لوٹ آئیں گی اور......"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر سر بیڈ کراؤن سے ٹکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"میں بات کروں گا شانی سے، سب بتاؤں گا اسے۔" انہوں نے پھر بابا جان کو تسلی دی۔

"لیکن وہ بات سنے تو تب نا... وہ تو تمہاری بات ہی نہیں سنتا۔"

بابا جان نے آنکھیں موندے موندے کہا تو مصطفیٰ خاموش ہو گئے۔ یہ سچ ہی تو تھا کہ شانی نے ان کی کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ بہاول پور سے آئے تو سیدھے احسان شاہ کے کمرے میں آئے تھے۔

"مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننا مصطفیٰ بھائی! پلیز فلک شاہ اور عمارہ کے متعلق مجھ سے کوئی بات مت کیجیے گا۔"

وہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں مزید کچھ کہنے سے منع کرتے ہوئے باہر نکل گئے تھے اور مائرہ نے ان سے کہا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ اب اس قصے کو نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔ احسان، فلک شاہ کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے۔"

"لیکن مائرہ بھابی! وہ..."

"پلیز مصطفیٰ بھائی!" اور مائرہ بھی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں اور وہ حیران سے کمرے میں تنہا کھڑے رہ گئے تھے۔

انہیں لگا تھا کہ ان کے بہاول پور سے واپس آنے پر مائرہ گھبرا سی گئی تھیں۔ فلک شاہ سے انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد شانی کو لے کر ان کے پاس آئیں گے۔ لیکن پتا نہیں وہ اپنا یہ وعدہ پورا بھی کر سکیں گے یا نہیں۔

فلک شاہ انہیں بھی کم عزیز نہ تھا۔ سلجوق کی وفات کے بعد تو وہ اس کا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ پھر وہ بہت پسندیدہ عادات کا مالک تھا اور عمارہ سے شادی کے بعد تو یہ تعلق اور گہرا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے دل میں کبھی بھی فلک شاہ کے لیے کوئی غصہ یا نفرت محسوس نہیں کی تھی۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس واقعے کے بعد کبھی فلک شاہ سے یا عمارہ سے ملنے نہیں جائیں گے۔ ٹھیک ہے فلک شاہ اور عمارہ کے الریان میں آنے پر عمارہ کو طلاق ہو سکتی تھی تو وہ تو مراد پیلس جا سکتے تھے اور وہ جانا بھی چاہتے تھے۔ لیکن یہ احسان شاہ تھا جس نے سب کو باندھ دیا تھا۔ زنجیر کر دیا تھا اور فلک شاہ سے تعلق کو اپنی موت کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔

وہ کتنے بے بس تھے۔ یہ صرف وہ ہی جان سکتے تھے۔ شروع شروع میں جب وہ الریان واپس آئے تھے تو بہت مضطرب اور بے چین رہتے تھے۔ لیکن پھر ہولے ہولے سب کے ساتھ انہوں نے بھی حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ ہمدان نے مراد پیلس جانا شروع کیا تو انہیں انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔ اس کے توسط سے انہیں عمارہ اور فلک شاہ کی خیریت پتا چل جاتی تھی۔ پھر ایبک کا الریان آنا بھی انہیں اچھا لگتا تھا۔ وہ بھی دوسروں کے ساتھ اس کی آمد کے منتظر رہتے تھے گو انہوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا اور اب بابا جان کا بہاول پور جانا بھی انہیں اچھا لگا تھا اور انہیں احسان شاہ کے ردعمل پر حیرت ہوئی تھی۔ جو ان کے بہاول پور جانے پر بہت غصے میں تھا۔

"وہ محض تمہاری وجہ سے اتنے سالوں سے اپنی بیٹی کی جدائی برداشت کررہے ہیں' اب ان کے کمزور دل میں اتنی طاقت نہیں رہی احسان!"

"میری وجہ سے نہیں مصطفیٰ بھائی! فلک شاہ کی وجہ سے۔ یہ جدائیاں فلک شاہ نے انہیں دی ہیں' میں نے نہیں۔"

"ہاں فلک شاہ سے غلطی ہوئی تھی۔۔۔ حالانکہ وہ اتنا جذباتی تو کبھی بھی نہیں تھا کہ محض بابا جان کے منع کرنے پر وہ اتنی بڑی بات کہہ دے۔۔۔ پھر بھی اس نے ایسا کردیا تھا تو اس غلطی کو درست کیا جاسکتا تھا۔ ہم عمارہ سے ملنے جاتے رہتے۔ اسے یوں اکیلا نہ چھوڑتے۔ لیکن تم نے احسان۔۔۔ تم نے ہمیں مجبور کردیا۔ بابا جان کو اور ہم سب کو۔"

"لیکن آج بابا جان چلے گئے۔۔۔ مجھے بتائے بغیر۔۔۔"

"اتنے سال گزر گئے۔ اب غصہ تھوک دو یار۔"

انہوں نے احسان شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر چلے گئے تھے۔۔۔ اور وہ سوچتے رہ گئے تھے کہ وہ بہاول پور جائیں یا نہ جائیں۔ لیکن جب بابا جان نے ان سے کہا۔

"مصطفیٰ! تم آ کیوں نہیں جاتے فلک شاہ سے ملنے؟ وہ وہیل چیئر پر ہے۔ بہت روتا ہے وہ۔ بہت تڑپتا ہے تم سب سے ملنے کے لیے۔۔۔ بہت یاد کرتا ہے تمہیں۔"

وہ جانتے تھے احسان شاہ ان کے بہاول پور جانے کا سن کر بہت ناراض ہوگا لیکن وہ رہ نہ سکے تھے۔ ثنا کو بتا کر چلے آئے تھے۔

"میں بابا جان کو لینے جارہا ہوں ثنا! عثمان کی چھٹی ختم ہونے والی ہے۔۔۔ اور ہمیں حفصہ اور عادل کی منگنی بھی کرنا ہے۔ اور بابا جان تو وہاں جاکر بیٹھ ہی گئے ہیں۔۔۔"

ثنا کو اپنے جانے کا جواز دے کر وہ بہاول پور آگئے تھے اور فلک شاہ انہیں دیکھ کر جذباتی ہوگئے تھے۔ کتنی ہی دیر تک ان کے آنسو تھم نہیں سکے تھے اور خود ان کے لیے فلک شاہ کو وہیل چیئر پر دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔

وہ دوڑتا بھاگتا زندگی سے بھرپور فلک شاہ نظروں میں گھوم رہا تھا ان کی آنکھیں نم ہورہی تھیں اور فلک شاہ شکوہ کررہے تھے۔

"مصطفیٰ بھائی! آپ نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ اکیلا کردیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا تھا "الریان" سے اور کوئی آئے نہ آئے لیکن مصطفیٰ بھائی ضرور آئیں گے ہماری خبر لینے۔"

اور وہ کیا کہتے۔ کیا بتاتے کہ احسان نے انہیں زنجیر کردیا تھا۔ اپنی موت کی دھمکی دے کر۔ اس کی زندگی کی قیمت پر وہ کیسے۔ یقیناً بابا جان نے انہیں سب بتایا ہوگا۔

احسان شاہ کی ضد۔

اس کی دھمکی اور اپنی مجبوری۔ انہوں نے فلک شاہ کی طرف دیکھا جو اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔

"تم اتنے زیادہ جذباتی تو کبھی بھی نہ تھے فلک شاہ! پھر تم نے بابا جان کی ذرا سی ڈانٹ پر اتنی بڑی بات کہہ دی۔۔۔"

"نہیں مصطفیٰ بھائی!" انہوں نے تڑپ کر اپنا جھکا سر اٹھایا تھا۔ "میں نے تو بابا جان کی بات دھیان سے سنی بھی نہ تھی۔۔۔ مجھے تو احسان شاہ کے شک نے مار دیا تھا۔۔۔ میں تو صرف اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی

آنکھوں میں لہراتے شک کو۔ اور ان آنکھوں میں اس وقت کتنی اجنبیت اور غیریت تھی۔۔۔ کتنی نفرت تھی آپ اندازہ نہیں کرسکتے۔۔۔ اور پھر میری سماعتوں نے صرف اس کی آواز سنی تھی۔۔۔

"آئندہ یہاں قدم مت رکھنا۔ الریان میں۔" یہ مجھ سے احسان شاہ کہہ رہا تھا۔ میرا سب سے زیادہ اپنا۔ اور تب میرے منہ سے وہ نکل گیا مصطفیٰ بھائی! جس کی تلافی بھی ممکن نہ تھی۔" وہ پوچھنا چاہتے تھے کیسا شک؟ لیکن تب ہی عمارہ اور بابا جان آگئے تھے۔

اور وہ ایک رات ہی تو رکے تھے بہاول پور اور دوسرے دن بابا جان کو لے کر یہاں آگئے تھے۔

"مصطفیٰ!" عبدالرحمٰن شاہ نے آنکھیں کھول کر انہیں پکارا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"عثمان کی چھٹی کا کیا بنا۔۔۔ بڑھی یا نہیں؟"

"بڑھ گئی ہے بابا جان اور اس کی خواہش ہے کہ منگنی کے فنکشن پر ہی نکاح بھی ہوجائے دونوں کا۔۔۔ رخصتی چند ماہ بعد ہوجائے گی۔"

"اچھا لیکن مصطفیٰ!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "میری عمو اور میرا فلک تو شریک نہیں ہوسکیں گے نا۔"

"کیوں نہیں بابا جان۔۔۔ فنکشن تو ہال میں ہی ہوگا وہ وہاں تو آسکتے ہیں۔"

"اجنبیوں کی طرح غیروں کی طرح ہال میں سے ہی آکر چلے جائیں گے۔۔۔ نہیں مصطفیٰ۔۔۔! میں اپنی زندگی کے ان آخری سالوں میں عمارہ کو اس کا میکہ لوٹانا چاہتا ہوں۔۔۔"

"وہ کیسے بابا جان؟" مصطفیٰ شاہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"میں چاہتا ہوں کوئی گھر خرید لوں۔۔۔ یہاں ہی آس پاس کہیں۔۔۔ اور عمارہ کے لیے میکے کا دروازہ کھل جائے۔ وہ وہاں آکر میرے پاس رہے۔۔۔"

"تو کیا آپ "الریان" کو چھوڑ دیں گے؟"

"نہیں۔" ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ "جب عمارہ اور فلک شاہ کو آنا ہوگا تو میں اس گھر میں چلا جایا کروں گا۔۔۔ وہاں وہ پورے مان سے آیا کرے گی۔۔۔ مصطفیٰ! پتا کرو آس پاس سے۔۔۔"

مصطفیٰ بھی ان کی بات سمجھ گئے تھے۔ "ٹھیک ہے میں پتا کرواتا ہوں۔"

"لیکن یہ کام جلد کرنا ہے۔ عادل اور حفصہ کے نکاح سے پہلے۔ اور تم خود جاکر فلک شاہ اور عمارہ کو لانا بلکہ انجی اور جواد کو بھی۔۔۔ انجی نے تو آج تک اپنے نانا کا گھر بھی نہیں دیکھا۔"

وہ خوشی خوشی مصطفیٰ کو انجم اور جواد کے متعلق بتانے لگے۔ مصطفیٰ خاموشی سے سن رہے تھے کہ اچانک انہیں خیال آیا۔

"ارے بابا جان! شاید ملک صاحب اپنا گھر فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اس روز عمر کچھ بتا رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے پاس جارہے ہیں۔"

"تم کیا واقعی۔ مصطفیٰ! تم ابھی جاؤ۔۔۔ ابھی جاکر بات کرو ملک صاحب سے۔ کہیں وہ کسی اور سے سودا نہ کرلیں۔"

"جی بابا جان! جاتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔" مصطفیٰ شاہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"سنو' جاتے ہوئے عثمان کو میرے پاس بھیج دینا۔ کچھ باتیں طے کرنا ہیں اور تم بھی ملک صاحب سے بات کرکے ادھر ہی آنا۔۔۔ مشورہ کرکے دن اور تاریخ طے کرلیتے ہیں۔۔۔ میرے خیال میں اتوار کا دن مناسب رہے گا۔ اور احسان سے بھی کہنا کہ باپ کو اپنی شکل تو دکھا جائے۔۔۔"

"جی اچھا!" مصطفیٰ شاہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ عثمان انہیں لاؤنج میں ہی بیٹھے اخبار پڑھتے مل گئے تھے۔۔۔ عثمان کو بابا جان کے پاس بھیج کر وہ احسان شاہ کو سمجھانے کا ارادہ کرکے ان کے کمرے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ان کی نظر سیڑھیوں سے نیچے اترتی رابیل پر پڑی تو وہ رک گئے۔

"کیسی ہو رابی بیٹی؟"

"ٹھیک ہوں تایا جان۔ آپ کو کچھ پتا ہے پاپا اور مما اچانک رحیم یار خان کیوں چلے گئے؟"

مجھے تو علم نہیں ہے۔ وہ کب گئے ہیں؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"وہ کچھ دیر پہلے ہی گئے ہیں۔ مما کہہ رہی تھیں شاید انہیں زیادہ دن لگ جائیں وہاں۔"

"ہو سکتا ہے' اپنا کوئی کام ہو یا تمہارے ننھیال میں کوئی خوشی غمی۔"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "لیکن مما نے کچھ بتایا نہیں۔"

وہ بات کر کے وہاں رکی نہیں تھی بلکہ منیبہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

مصطفیٰ شاہ اندازہ کر سکتے تھے کہ احسان شاہ کیوں رحیم یار خان گئے ہیں۔ وہ بابا جان اور مصطفیٰ شاہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ یقیناً" ان کے بہاول پور جانے کی وجہ سے بہت غصے میں تھے۔

"احسان شاہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" انہوں نے سوچا "بابا جان اب عمر کے جس حصے میں ہیں۔ وہ کوئی شاک کوئی صدمہ نہیں سہہ سکتے۔"

"اور کیا احسان شاہ اور مائرہ حفصہ اور عادل کے نکاح کے فنکشن میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔" وہ یکدم پریشان ہو گئے تھے۔

کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے رابیل نے مڑ کر انہیں جاتے دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

اندر منیبہ اکیلی اپنے بیڈ پر کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ رابیل کو دیکھ کر وہ ذرا سا حیران ہوئی کہ رابیل بہت کم ہی ان کے کمروں میں آتی تھی۔

"آؤ آؤ رابی!" منیبہ نے جلدی جلدی کتابیں سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔

"سب لوگ کہاں ہیں مونی؟ کوئی بھی نظر نہیں آرہا حفصہ' عاشی' مرینہ۔"

"حفصہ تو تائی چچی کے ساتھ پارلر گئی ہوئی ہے' اس کی اسکن بہت رف اور کھردری ہو رہی تھی۔ کچھ فیشل وغیرہ کروائے گی۔ عاشی بھی ان کے ساتھ ہے۔"

"اسکن تو خراب ہونا ہی تھی' چوبیس گھنٹے کچن میں ہی گھسی رہتی ہے۔ حالانکہ خانساماں ہے' اس کی مدد کے لیے ملازم لڑکا ہے اور۔"

رابیل نے ناک چڑھائی۔

"اسے اچھا لگتا ہے سب کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچھ بنانا۔" منیبہ مسکرائی۔

"تو عادل کے دل میں اس نے ایسے ہی جگہ بنائی ہے۔" رابیل کا لہجہ طنزیہ تھا لیکن منیبہ نے محسوس نہیں کیا۔

"نہیں تو۔ یہ تو بچپن سے ہی طے تھا۔ ذکر اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ بڑے ہونے پر جانے کس کا کیا رجحان ہو۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

رابیل نے بیڈ پر پڑی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی۔ "یہ تم کیا پڑھ رہی تھیں؟" اس نے کتاب کے ورق الٹے۔

"اف! کس قدر مشکل اور خشک سی لگ رہی ہے، تم کیسے پڑھ لیتی ہو یہ سب۔"

"یہ فقہ کی کتاب ہے۔" منیبہ مسکرائی۔ "اور میں بھی ایسے ہی پڑھ لیتی ہوں جیسے تم پڑھ لیتی ہو۔ اپنی کورس کی کتابیں۔"

"کیا تم وکیل بننے کے بعد پریکٹس بھی کرو گی؟" رابیل نے کتاب واپس رکھ دی۔

"ہاں! ارادہ تو ہے لیکن کل کی کس کو خبر ہے۔"

رابیل نے سر ہلایا۔

"اور یہ ایبک نہیں آیا بابا جان سے ملنے۔ کیا واپس چلا گیا ہے بہاول پور۔"

"معلوم نہیں۔ ہمدان کو پتا ہو شاید۔"

تب ہی واش روم کا دروازہ کھلا اور گیلے چہرے کے ساتھ اریب فاطمہ باہر آئی۔

"السلام علیکم رابیل آپی!"

"وعلیکم السلام۔" رابیل نے اس کے دھلے دھلے نکھرے نکھرے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مما سچ کہتی ہیں' اریب فاطمہ یہاں آکر بہت نکھر گئی ہے۔ اور اگر ہمدان نے اس کو پسند کر بھی لیا ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے کیونکہ مجھے ہمدان سے ایسی دلچسپی نہیں ہے جیسے مما چاہتی ہیں۔ اور مما تو چاہتی ہیں کہ میں اور ہمدان۔ جبکہ ہمدان جیسا لڑکا کبھی بھی میرا آئیڈیل نہیں ہو سکتا۔ حفصہ اور منیبہ کی طرح ہر لمحے ہر ایک کی خدمت کو تیار۔"

اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ اریب فاطمہ اپنے بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

"فاطمہ! تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹیسٹوں میں اچھے مارکس آجاتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ ورنہ میں سمجھ رہی تھی تمہارے لیے یہاں ایڈجسٹ کرنا مشکل ہو گا۔"

"نہیں! وہاں رحیم یار خان میں بھی ہمارا کالج اچھا تھا۔ اور پروفیسرز بھی بہت اچھے تھے۔"

فاطمہ کو حیرت ہوئی' جب سے وہ الریان آئی تھی۔ رابیل نے پہلی بار اس سے اتنی بات کی تھی۔ "رابیل شاید مائرہ آنٹی سے مختلف ہے۔" اس نے سوچا۔

وہ اسے بہت مغرور لگتی تھی۔ اور آج سے پہلے اسے لگتا تھا کہ وہ اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ شاید وہ اسے کمتر سمجھتی ہے۔

"مائرہ آنٹی کہاں گئی ہیں؟" منیبہ نے رابیل سے پوچھا۔

"مما اور پاپا تو رحیم یار خان چلے گئے ہیں۔" رابیل نے بتایا۔

"رات تو آنٹی نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔" منیبہ کو حیرت ہوئی۔

"ہاں! بس اچانک ہی پروگرام بنا۔ شاید نانو اور نانا جان سے ملنے کو دل چاہ رہا ہو گا۔ ویسے رات مما بہت دیر تک تم سے باتیں کرتی رہی تھیں۔ کوئی خاص بات تھی کیا۔؟"

رابیل نے بظاہر لاپروائی سے کہا تھا۔ لیکن منیبہ کو اس کے لہجے میں چھپا تجسس محسوس ہو گیا۔

"تو رابی اس لیے آئی ہے میرے کمرے میں۔ صرف یہ پوچھنے کہ مائرہ آنٹی رات دیر تک میرے کمرے میں کیوں بیٹھی رہیں۔ ورنہ بقول عمر "الریان" کی شہزادی ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں سے زیادہ فری ہونا پسند نہیں کرتیں۔" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ بس یونہی وہ عمر کا پتا کرنے آئی تھیں اور پھر ان کے کالج کے زمانے کا ذکر چھڑ گیا۔ اور باتوں میں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

اور اس میں کسی حد تک حقیقت بھی تھی' نہ جانے کس بات پر ان کے کالج کا ذکر چھڑا تھا۔ اور پھر بہت دیر تک وہ اپنی کالج لائف کے متعلق باتیں کرتی رہی تھیں۔ اریب فاطمہ کو انہوں نے باہر بھیج دیا تھا۔

دراصل مائرہ آنٹی چاہتی تھیں کہ وہ ہمدان سے رابیل کے متعلق رائے پوچھے۔

"بھلا ہمدان کو رابی کے ساتھ شادی سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ اتنی خوبصورت بلکہ الریان کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش۔ لیکن مائرہ چاہتی تھیں کہ ہمدان کی رائے بھی معلوم ہو جائے۔ تب وہ مصطفیٰ شاہ سے بات کریں گی۔

"اور رابی؟ کیا آپ نے اس کی رائے پوچھی؟" اس نے پوچھا تھا۔

"بھلا رابی کو کیا انکار ہو سکتا ہے۔" مائرہ مسکرائی تھیں "الریان" کے سارے لڑکے ہی بہت قابل اور اچھے ہیں۔"

منیبہ کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ "کتنا مزا آئے گا نا۔ حفصہ اور عادل کے بعد رابی اور ہمدان۔

اور آج میں ضرور ہمدان سے رابی کے متعلق پوچھ لوں گی۔"

"یہ آپی آپ کیوں مسکرایا جا رہا ہے۔ کیا سوچ رہی تھیں؟"

رابیل بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی' اب حفصہ کے بعد تمہاری

منگنی یا شادی کا فنکشن ہونا چاہیے۔"

"تمہارا کیوں نہیں۔۔۔؟" رابیل کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

"میرا بھی ہو جائے گا لیکن پہلے۔۔۔"

"منیبہ۔۔۔ منیبہ بیٹے۔" عبدالرحمٰن شاہ کی آواز سنائی دی اور منیبہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

منیبہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ لاؤنج میں عبدالرحمٰن شاہ اور عثمان شاہ کھڑے تھے۔

"جی بابا جان!"

عثمان شاہ سے بات کرتے کرتے انہوں نے منیبہ کی طرف دیکھا۔

"حفصہ کی ساری شاپنگ مکمل ہو گئی تھی کیا؟ ہم نے اتوار کا دن سوچا ہے"۔

"جی بابا جان! بس کپڑے ٹیلر کے پاس سے اٹھانے ہیں۔۔۔"

"تو ایسا کرو تم کسی کو ساتھ لے کر چلی جاؤ اور عاشی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ میں تو بہاول پور میں تھا۔ پتا نہیں اس کے لیے بھی کسی نے شاپنگ کی یا نہیں۔"

"بابا جان! میں نے اور ثنا چچی نے اس کے لیے فنکشن کے حساب سے شاپنگ کر لی تھی۔"

"رانی میری بیٹی! کیسی ہے؟" عبدالرحمٰن شاہ نے منیبہ کے کمرے سے آتی ہوئی رابیل کو دیکھا۔

"جی بابا جان! میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ کیسے ہیں۔۔۔"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ اتنے دنوں بعد بہاول پور سے آیا ہوں اور تم نے صبح سے اب تک چکر تک نہیں لگایا میرے کمرے کا۔۔۔"

"بس بابا جان! میں آنے ہی والی تھی۔ لیکن پھر مما نے کہا میری پیکنگ کر دو تو ذرا مصروف ہو گئی تھی۔"

"پیکنگ کیا مطلب؟ کیا وہ کہیں گئی ہیں۔"

"جی وہ تو رحیم یار خان گئی ہیں۔ کیا آپ سے مل کر نہیں گئیں؟"

رابیل نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"نہیں تو۔ مجھے تو خبر ہی نہیں ہے۔۔۔ کیا تمہارے پپا بھی گئے ہیں۔"

"جی! ان ہی کے ساتھ گئے ہیں۔"

"دیکھا۔۔۔ دیکھا تم نے عثمان! یہ احسان کیا کر رہا ہے میرے ساتھ۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ "وہ جان بوجھ کر چلا گیا ہے تاکہ مجھ سے بات نہ کرنا پڑے۔ اس نے مصطفیٰ سے بھی بات نہیں کی۔۔۔ اتنا پتھر ہے وہ۔ ایسے تو کوئی نہیں کرتا نا عثمان۔" انہوں نے نظر اٹھا کر عثمان کی طرف دیکھا۔ "مجرم کو بھی صفائی کا موقع دیا جاتا ہے' لیکن اس نے تو بغیر صفائی کے فیصلہ سنا دیا۔ اس سے کہو۔ میرے پاس آئے۔ میری بات سنے اور اگر اسے میری بات غلط لگے۔ اسے اس سب پر یقین نہ آئے جو فلک شاہ نے مجھے بتایا ہے تو پھر۔۔۔"

"پھر کیا بابا جان؟" عثمان نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر میں مراد پیلس چلا جاؤں گا۔ عمارہ اور فلک شاہ کے پاس۔۔۔ میں نے بہت جدائیاں سہی ہیں۔۔۔ میرا دل ابھی عمارہ اور فلک شاہ کو دیکھ دیکھ کر بھرا ہی کب تھا میں تو صرف حفصہ اور عادل کی خاطر آیا ہوں۔"

رابیل اور منیبہ الجھی الجھی سی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔۔۔

"میں اب مزید جدائیاں نہیں سہہ سکتا عثمان! نہ عمو اور فلک شاہ کی' نہ احسان کی۔ میرے دل میں اتنی طاقت نہیں ہے۔۔۔"

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ منیبہ ایک دم آگے بڑھی تھی اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بابا جان پلیز۔ ریلیکس ہو جائیں۔۔۔ اب کچھ نہیں ہو گا ان شاء اللہ اور پتا ہے ہم نے تو ایک بھائی سے کہہ دیا تھا کہ عادل اور حفصہ کی منگنی کے فنکشن پر سب آئیں گے۔ عمارہ پھپھو' فلک انکل' انجی' جوا د بھائی سب۔ سائرہ چچی اور احسان چچا تو رانی کی نانو سے ملنے گئے ہیں۔ آ جائیں گے' ایک دو روز تک۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی نا۔"

وہ کچھ بھی نہ جانتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہی اس کی سب کو تسلی دینے کی عادت۔

بابا جان نرمی سے مسکرائے۔ اور پاس بیٹھی منیبہ کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے' تم جاؤ' ٹیلر سے کپڑے اٹھا لاؤ۔ دن ہی کتنے ہیں بیچ میں' صرف دو' آج جمعرات ہے اور۔۔۔"

"جی بابا جان!" منیبہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کچھ شاپنگ رہ گئی ہو تو وہ بھی کر لینا۔ اور ہاں وہ بچی فاطمہ اس کے لیے بھی نئے کپڑے بنوائے ہیں نا!"

"جی وہ ثنا چچی نے اریب فاطمہ کے لیے بھی کپڑے بنوائے ہیں۔۔۔" منیبہ فوراً" ہی بولی۔

"وہ اپنے گھر سے اتنی دور یہاں ہے' اس کا خیال رکھا کرو۔" انہوں نے تاکید کی۔

"جی بابا جان! ہم سب اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔۔۔"

منیبہ نے جواب دے کر رابیل کی طرف دیکھا

"رانی تم جلدی جا کر تیار ہو جاؤ تو پھر چلتے ہیں۔"

"میں بس تیار ہی ہوں۔ تم آ جاؤ۔۔۔"

"اچھا! میں بھی بس چادر لے کر آتی ہوں۔۔۔"

منیبہ کمرے میں چادر لینے گئی تو اریب فاطمہ جو کتاب گود میں رکھے خاموش بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ منیبہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"فاطمہ! ہم ٹیلر سے حفصہ کے اور اپنے کپڑے لینے جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو۔۔۔ آؤٹنگ ہو جائے گی۔" اریب نے چونک کر منیبہ کی طرف دیکھا۔

"لیکن مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنا ہے۔"

"ہوتی رہے گی ٹیسٹ کی تیاری۔" منیبہ نے الماری سے چادر نکالتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔ "کم آن یار!"

منیبہ نے اس کی چادر نکال کر اسے پکڑائی۔ اریب فاطمہ نے چادر پکڑ لی اور سیاہ چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے وہ مونی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔

عبدالرحمٰن شاہ نے اپنے والٹ سے کچھ نوٹ نکال کر منیبہ کو دیے۔

"بابا جان! پیسے تو تھے۔ صبح مصطفیٰ انکل نے دیے تھے۔"

"کوئی بات نہیں' یہ بھی رکھ لو اور فاطمہ بیٹی کسی بھی چیز کا دل چاہے تو لے لینا۔ جھجکنا مت۔"

"جی!" اریب فاطمہ نے صرف اتنا ہی کہا اور وہ تینوں لاؤنج سے نکل گئیں۔ تب عبدالرحمٰن شاہ نے پاس بیٹھے عثمان شاہ کی طرف دیکھا۔

"عثمان بیٹا! احسان کا نمبر ملاؤ۔ پہنچ گیا ہو گا' رحیم یار خان اب تک۔"

"جی! میرا خیال ہے' وہ کافی سویرے نکل گئے تھے۔"

عبدالرحمٰن شاہ کی بات کا جواب دے کر عثمان شاہ' احسان شاہ کا نمبر ملانے لگے۔

"وہ اٹینڈ نہیں کر رہا بابا جان!" عثمان شاہ نے بتایا تو انہوں نے متفکر نظروں سے انہیں دیکھا۔

"لینڈ لائن پہ بات کرو۔ موبائل وہ اٹینڈ نہیں کرے گا۔ جو بھی اٹھائے اس سے کہنا' احسان سے بات کروا دے۔"

"جی بابا جان!" عثمان شاہ پھر نمبر ملانے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی احسان شاہ لائن پر آ گئے تھے۔ انہیں رحیم یار خان پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔

"شانی! بابا جان تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" عثمان شاہ نے خیریت پوچھنے کے بعد کہا تو دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر احسان شاہ کی آواز آئی۔

"عثمان بھائی! بابا جان سے کہیں' مجھے فلک شاہ کے متعلق کوئی بات نہیں سننی۔ بالکل نہیں۔ ناٹ ایٹ آل (Not at all)"

اور عبدالرحمٰن شاہ نے ان کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"شانی۔۔۔ وہ میری بیٹی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے رابیل تمہاری بیٹی ہے۔ جس طرح تم محبت کرتے ہو رانی سے' میں بھی عمارہ کا باپ ہوں۔ تمہیں اگر ایسی جدائی سہنی پڑے تو سہہ سکو گے؟ میں نے سہی ہے

چھبیس سال۔ تمہاری ماں اسے دیکھنے کی حسرت لیے قبر میں چلی گئی۔ تمہارا پتھر دل کیوں نہیں پگھلتا؟"

اور احسان شاہ ذرا سے نرم پڑے تھے۔

"ٹھیک ہے بابا جان! میں نے آپ کو اب تو عمارہ سے ملنے سے نہیں روکا۔"

"لیکن تمہیں اچھا بھی نہیں لگا احسان! میں جانتا ہوں۔ عمو اسپتال آئی۔ تم نے اس سے بات تک نہیں کی۔ میں بہاول پور گیا تو تم۔۔۔"

"بابا جان! اتنے لمبے سفر کے بعد میں بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر آرام کروں گا۔ پلیز۔۔۔ پھر کبھی بات کریں گے۔"

انہوں نے دوسری طرف ریسیور رکھ دیا تھا اور عثمان کو فون واپس کرتے ہوئے انہوں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"ٹھیک ہے بابا جان! فلک شاہ نے غصے میں کچھ ایسا کہہ دیا تھا جس نے "الریان" کے دروازے ان پر بند کردیے۔ اس غلطی کی سزا ہم سب نے بہت بھگت لی۔ لیکن احسان وہ آخر اتنا زیادہ ناراض کیوں ہے فلک شاہ سے۔ اس نے کچھ بتایا؟" عثمان شاہ نے فون لیتے ہوئے کہا۔

"شاید کوئی غلط فہمی ہے اسے۔"

"تو یہ غلط فہمی دور بھی تو ہوسکتی ہے۔" عثمان شاہ الجھے ہوئے تھے۔

"وہ کسی کی بات سننا ہی نہیں چاہتا۔" عبدالرحمٰن شاہ کی آواز میں تھکن تھی۔

جو فلک شاہ نے انہیں بتایا تھا۔ وہ انہوں نے مصطفیٰ کو نہیں بتایا تھا اور نہ ہی عثمان یا کسی اور سے ذکر کرنا چاہتے تھے۔

مائرہ ان کی بہو تھی۔ احسان شاہ کی بیوی۔

انہیں اس کی عزت اور بھرم عزیز تھا۔

لیکن احسان شاہ کی ضد؟

وہ بے حد پریشان سے تھے۔

"وہ کیسے اس کے دل کو نرم کریں۔ کیسے اسے وہ سب بتائیں۔ لیکن شاید بتانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔ وہ سب جھوٹ کہے گا۔"

"عثمان! عادل اور حفصہ کی منگنی میں احسان شرکت نہیں کرے گا۔ اگر عمارہ اور فلک شاہ آ بھی جائیں تو۔۔۔ اور میرا جی چاہتا تھا کہ وہ سب بھی آئیں۔ انجی جواد ایبک وہ بھی اس خاندان کا حصہ ہیں۔"

عثمان شاہ جانتے تھے کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ فنکشن سے صرف دو، تین دن پہلے رحیم یار خان جانے کا اور کیا مطلب تھا۔

"بابا جان پلیز! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم فنکشن ایک ہفتہ آگے کردیتے ہیں۔ اگلے سنڈے کو سہی۔ تب تک تو شانی واپس آجائے گا۔ اتنے زیادہ دن تو وہاں نہیں رہ سکتا۔ اس کی جاب ہے یہاں۔"

"ہاں! ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ شاید فلک شاہ اور عمارہ بھی اتنی جلدی نہ آسکیں۔"

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر مرینہ نے اندر قدم رکھا۔ "السلام علیکم بابا جان!"

"وعلیکم السلام بیٹا! آج بڑی دیر کردی۔" عبدالرحمٰن شاہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"آج میں سمیرا کے ساتھ ہاسٹل چلی گئی تھی۔"

اس نے مڑ کر اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور اپنی عینک درست کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"یہ سمیرا ہے، میری دوست، مجھ سے جونیئر ہے ہاسٹل میں ہے، راولپنڈی سے آئی ہے، ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا اس نے راولپنڈی بورڈ میں۔"

ہمیشہ کی طرح وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

"کالج میں تین دن کی چھٹیاں ہوگئی ہیں۔ یہ راولپنڈی نہیں جارہی تھی۔ میں اسے زبردستی گھر لے آئی۔ ہاسٹل میں سے کافی لڑکیاں چلی گئی تھیں نا۔ یہ اکیلی ہی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے خود ہی اس کے ابو سے اجازت لی ہے فون کرکے۔"

"اچھا کیا بیٹی!" عبدالرحمٰن شاہ نے مسکرا کر سمیرا کو دیکھا۔ وہ انہیں بے حد سنجیدہ اور خاموش طبع لگی تھی۔

"اور یہ میرے بھیا ہیں، دبئی میں جاب کرتے ہیں۔ آج کل عادل بھائی کی منگنی کے لیے آئے ہوئے ہیں۔" اس نے پھر مڑ کر سمیرا کی طرف دیکھا۔ "ابھی آئی ہوئی ہیں۔"

سمیرا نے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹا۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے دعا دی اور مرینہ سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹی! انہیں اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ رفیق سے کہو چائے وغیرہ کے لیے۔ کیونکہ تمہاری بہنیں تو سب گئی ہوئی ہیں۔ ابھی آتی ہوں گی۔"

"مجھے بہت خوشی ہورہی ہے کہ ہماری مرینہ نے بھی کسی کو دوست بنایا۔ ورنہ اسکول، کالج میں بھی اس کی کوئی دوست نہیں رہی۔ یہ اپنے میں ہی مگن رہتی تھی۔"

عثمان شاہ نے کھڑے ہوتے ہوئے سمیرا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مرینہ کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ وہ سمیرا کی جھجک کو محسوس کررہے تھے۔

"آؤ سمیرا۔" مرینہ، سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور عثمان شاہ بیٹھتے ہوئے بابا جان کی طرف متوجہ ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

"احمد۔۔۔ رضی!" وہ پوری طاقت سے چیخے تھے۔ لیکن ان کی آواز ان کے حلق میں ہی گھٹ گئی تھی۔

"رضی۔۔۔!" ان کے لبوں سے نکل رہا تھا اور وہ تقریباً" دوڑنے لگے تھے۔

احمد رضا گلی کا موڑ مڑ چکا تھا۔ اب وہ انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ روڈ کی طرف جارہا ہوگا۔ اس گلی سے آگے ایک اور گلی اور بس۔

"حسن رضا صاحب!" قاضی صاحب اچانک ہی ان کے سامنے آئے تھے۔ "السلام علیکم! کیسے ہیں جناب! آپ نے کوئی اتا پتا بھی نہیں بتایا، نہ کسی سے ملے، برسوں کا ساتھ تھا۔"

"جی قاضی صاحب! اچانک جانا پڑ گیا۔" وہ بس لمحہ بھر کو رکے تھے۔ انہوں نے قاضی صاحب کو دیکھا تھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

"نہ سلام، نہ دعا، ایسی بھی کیا بے مروتی۔" قاضی صاحب کندھے اچکاتے ہوئے بڑبڑائے۔ لیکن حسن رضا گلی پار کرکے روڈ پر پہنچ چکے تھے۔

"احمد رضا!" انہوں نے پوری طاقت لگا کر اسے آواز دی تھی۔ لیکن احمد رضا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح سے پکارتے ہوئے بھاگے۔ لیکن گاڑی لمحوں میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے موجود درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بے بسی سے خالی سڑک کو دیکھ رہے تھے۔

وہ آج ہی راولپنڈی سے آئے تھے۔ کچھ چھوٹے موٹے کام تھے جو ابھی باقی تھے اور اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی وہ نہ جانے کس خیال سے اپنے گھر کی طرف آنکلے تھے اور۔۔۔

"احمد رضا یہاں تھا۔ اسی شہر میں۔ ابھی وہ کہیں نہیں گیا تھا۔ شاید وہ وہیں ہو اسی گھر میں۔ میں وہاں جاکر پتا کرتا ہوں۔"

ان کے دل میں امید کا دیا جل اٹھا تھا۔

"وہ ضرور مل جائے گا۔ ایک بار مجھے اس سے بات کرنا ہے اور اسے زبیدہ اور سمیرا کے پاس لے کر جانا ہے۔ بس ایک بار وہ مل جائے۔"

اور کچھ دیر بعد وہ ایک نئی امید کے ساتھ اس کے پرانے ٹھکانے کی طرف جارہے تھے۔ لیکن وہ گھر بدستور بند تھا۔

پھر وہ سارا دن اسے مختلف جگہوں پر ڈھونڈتے پھرے۔ حالانکہ انہیں آفس جانا تھا اور اپنا Experience سرٹیفکیٹ بنوانا تھا۔ لیکن رات ہوگئی تھی۔ جب تھکے تھکے وہ ایک ہوٹل کے ریسیپشن پر کھڑے کمرے کا پوچھ رہے تھے۔

اگلے دو، تین دن تک وہ لاہور میں ہی مقیم رہے۔ آفس میں سلیم صاحب سے انہیں پتا چلا تھا کہ احمد رضا آفس آیا تھا اور ان کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ سلیم احمد وہ واحد شخص تھے جو ان کے جاب چھوڑنے کی وجہ جانتے تھے اور احمد رضا کو بھی جانتے تھے۔

"احمد رضا انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ یقیناً" شرمندہ ہو گا۔ وہ ماں اور بہن کے لیے اداس ہو گا۔" انہوں نے سلیم احمد کو اپنا فون نمبر دیا تھا۔

"اگر کبھی احمد رضا پھر آئے تو اسے یہ نمبر دے دینا سلیم۔ لیکن اس کے علاوہ اور کسی کو نہیں۔"

وہ سلیم احمد کو تاکید کر کے چلے آئے تھے کہ انہیں واپس جانا تھا۔ اجنبی شہر میں سمیرا اور زبیدہ اکیلی گھبرا رہی ہوں گی۔

وہ انہیں رات تک واپس آجانے کا کہہ کر آئے تھے۔ لیکن یہاں جو احمد رضا کے ملنے کی آس بندھی تو وہ یہیں رک گئے تھے اور گھر فون کر دیا تھا۔ انہیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ سلیم صاحب کو فون نمبر دے کر وہ ہوٹل آئے تو بے چین سے ہو گئے تھے۔ انہیں وہاں گئے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا' ابھی تو وہ وہاں کسی کو جانتی تک نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ زبیدہ کی طبیعت خراب ہو گئی تو ... انہوں نے گھر فون کیا تو سمیرا بار بار پوچھنے لگی۔

"آپ وہاں کیوں رکے ہوئے ہیں۔ کیا رضی آپ کو مل گیا ہے اور کیا رضی؟"

"نہیں رضی تو نہیں ملا۔ بس ویسے ہی۔"

"ابو! کیا آپ وہاں رضی کو مارنے کے لیے رکے ہوئے ہیں کیا آپ اسے ...؟" سمیرا پتا نہیں کیا کیا سوچ رہی تھی۔

"نہیں بیٹا! بالکل نہیں ہمیں تو بس ..."

"آپ آجائیں ابو! وہ اب نہیں ملے گا۔ وہ نہیں آئے گا پلٹ کر۔"

وہ اسے بتانا چاہتے تھے کہ وہ آیا تھا۔ گھر میں' آفس میں' لیکن وہ اس سے مل نہ پائے تھے۔ لیکن سمیرا نے روتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

انہوں نے آنکھوں میں پھیلتے آنسوؤں کو ... سے پونچھا اور بیگ اٹھا کر ہوٹل کے کمرے سے نکل آئے۔

سمیرا بہت دیر تک وہیں فون اسٹینڈ کے ... کھڑی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ پتا نہیں کب تک وہ وہیں کھڑی رہتی کہ زبیدہ نے اسے آواز دی۔

"بیٹا! کہاں ہو' ادھر آ کر کمرے کی کھڑکی بند کر ... بہت ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔"

اور اس نے چونک کر اپنے آنسو پونچھے تھے ... کمرے میں جا کر کھڑکی بند کر کے زبیدہ کی طرف ... تھا جو دیوار کی طرف کروٹ لیے لیٹی تھیں۔

"تمہارے ابا کا فون تھا کیا؟" انہوں نے یوں ہی دیوار کی طرف کروٹ لیے لیے پوچھا۔

"جی اماں!"

"وہ کیا کہہ رہے تھے۔ کچھ احمد رضا کا پتا چلا؟"

"نہیں ..." دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

جنوری 2000ء کی پہلی صبح اس کی ... راولپنڈی کے اس مکان میں کھلی تھی۔ جو اس کے لیے اجنبی تھا۔ نامانوس درودیوار۔

اجنبی نظروں سے تکتے کھڑکیاں اور دروازے ... نہیں اس سب سے مانوس ہونے میں کتنا وقت لگے گا۔ اینٹ' مٹی اور چونے کی دیواریں بھی جیسے سانس لیتی ہیں۔

اپنے اندر محبت اور اپنائیت رکھتی ہیں۔

سمن آباد کا وہ مکان جو وہ چھوڑ آئے تھے' کتنا اپنا ... اور یہ مکان تھا تو یہ بھی اپنا ہی۔ لیکن کتنا اجنبی اور پرایا سا لگتا تھا۔

حسن رضا کرائے کا مکان دیکھنے آئے تو اس مکان ... "برائے فروخت" کا بورڈ دیکھ کر رک گئے اور پھر مکان اندر سے دیکھنے پر پسند آیا تو خرید لیا۔ یہ مکان انہیں اس رقم سے کم قیمت میں مل گیا تھا جو انہیں سمن آباد والا مکان فروخت کر کے ملی تھی۔ باقی کی رقم انہوں نے سمیرا کی شادی اور تعلیم کے لیے محفوظ کر دی تھی۔

"یہاں کتنی ظالم سردی ہے سمیرا! ہمارے لاہور میں تو اتنی سردی نہیں ہوتی تھی نا۔" زبیدہ نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا۔

"آپ کو اگر سردی زیادہ لگ رہی ہے تو ہیٹر جلا دوں؟"

"ہاں جلا دو۔"

"تمہارے ابو کل تک آجائیں گے نا۔"

"شاید۔"

"ضرور احمد رضا کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" وہ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سمیرا نے نظریں چرالیں۔ زبیدہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں اور پھر کروٹ بدل لی۔

"آج سے چند دن پہلے کسے خبر تھی کہ ہم یہاں ہوں گے اس اجنبی شہر اور اجنبی گھر میں۔" اسے اسلام آباد دیکھنے کا شوق ضرور تھا۔ لیکن اس نے یہاں رہنے کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ کنیرڈ کے علاوہ کہیں کسی اور کالج سے ایف ایس سی کرے گی۔ لیکن اب ... وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

حسن رضا نے راولپنڈی آتے ہی سب سے پہلا کام اس کے ایڈمیشن کا کیا تھا اور اسے گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن میں داخل کروا دیا تھا۔ یہاں اس کا بالکل بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ صرف چند دن ہی کالج گئی تھی۔ جب سے حسن رضا لاہور گئے تھے۔ وہ گھر پر ہی تھی۔ حالانکہ انہوں نے لاہور سے فون پر بھی اسے تاکید کی تھی کہ وہ کالج باقاعدگی سے جاتی رہے۔ تاکہ پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ گھر کے پاس ہی کالج بس آتی تھی اور کئی لڑکیاں جاتی تھیں۔ حسن رضا کے لیے آج بھی ہر چیز سے زیادہ پڑھائی اہم تھی۔

اس نے ایک نظر زبیدہ پر ڈالی۔ اسے لگا جیسے وہ لحاف کے اندر بھی کانپ رہی ہوں۔ اس نے دوسرے بیڈ پر پڑا کمبل اٹھا کر ان کے لحاف پر پھیلا دیا اور خود آہستگی سے دروازہ بند کرتی ہوئی لاؤنج میں آگئی۔ لاؤنج میں سب بے حد ٹھنڈ تھی۔ لیکن وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کا دل جیسے کسی شکنجے کی زد میں تھا۔ بار بار ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

"ابو کیا صرف احمد رضا کو مارنے کے لیے وہاں رکے ہوئے ہیں؟ کیا ہم پھر کبھی رضی کو دیکھ سکیں گے؟ کیا ہم پھر کبھی ایک فیملی کا حصہ بن سکیں گے۔ کیا رضی کبھی لوٹ کر آئے گا؟"

بہت سے سوال تھے جو اس کے ذہن میں آرہے تھے۔ لیکن اس کے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کا ہر وہ لمحہ جس میں رضی تھا اسے یاد آرہا تھا۔

رضی کے ساتھ مل کر شرارتیں کرنا۔

رضی کے ساتھ گرمیوں کی راتوں میں ٹہلنے کے لیے جانا اور واپسی پر کارنر والے اسٹور سے آئس کریم کھانا۔

رضی کا امتحان کے دنوں میں رات گئے تک پڑھنا اور اس کا اسے چائے بنا کر دینا اور رضی کا شکریہ ادا کرنے کا انداز۔

"مجھے اب سمجھ میں آیا کہ بہنیں اتنی پیاری کیوں ہوتی ہیں۔"

"کیوں؟" وہ چائے کا کپ تھماتے ہوئے پوچھتی۔

"اس لیے کہ وہ امتحان کے دنوں میں بھائیوں کو چائے بنا کر دیتی ہیں۔"

"بس صرف اس لیے۔" وہ ناراضی سے اسے دیکھتی تو شرارت سے اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتیں۔ اس کے لبوں سے سسکی نکل گئی۔

"تو کیا یہ سب رضی کو یاد نہ آتا ہو گا اور وہ بھی تڑپتا نہ ہو گا۔"

وہ بے چین سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر بیٹھ گئی۔ کوئی بھی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ نہ پڑھنے کو' نہ کچھ اور زبیدہ بھی شاید سو گئی تھیں یا اگر جاگ بھی رہی تھیں تو انہوں نے تو باتیں کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ راولپنڈی آکر تو جیسے انہیں بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔ کوئی بات کی تو جواب دے دیا۔ ورنہ خاموش ہی

رہتیں۔ بے حد مضطرب ہو کر اس نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھالیا۔ شاید کچھ دل بہل جائے۔ شاید یہ سب سوچیں ذہن سے نکل جائیں۔

ٹی وی پر خبریں آرہی تھیں۔

"آج صبح اسماعیل کذاب کو ایرپورٹ پر سے گرفتار کرلیا گیا۔ وہ کسی اور نام سے پاسپورٹ پر سفر کرنے والا تھا۔ لیکن کسی مخبر کی اطلاع پر پولیس نے جہاز پر سوار ہونے سے کچھ پہلے گرفتار کرلیا۔ البتہ اس کے ساتھیوں کے متعلق معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ اسی جہاز سے سفر کرنے والے تھے یا پہلے ہی ملک سے فرار ہوچکے ہیں۔"

تمیرا جو بہت توجہ سے ٹی وی کی طرف دیکھ رہی تھی ایک دم چونکی۔

"تو کیا احمد رضا بھی ملک سے جاچکا ہے۔"

ٹی وی پر اب اسماعیل کذاب کے متعلق تفصیل سے بتایا جارہا تھا۔ لیکن وہ بالکل نہیں سن رہی تھی۔ وہ صرف احمد رضا کے متعلق سوچ رہی تھی۔

"وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔"

اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچل ڈالا۔ لیکن پھر بھی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے اور وہ انہیں روکنے پر قادر نہ تھی۔

وہ آنسو پونچھتی اور دوسرے ہی لمحے رخسار پھر گیلے ہوجاتے تھے۔

تو زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔

احمد رضا گھر سے ہی نہیں ملک سے بھی چلا گیا۔

تو اب ہمیں زندگی اس کے بغیر ہی گزارنا ہوگی۔

اجنبی شہر کے اس اجنبی گھر میں۔

اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور ہولے ہولے اس کی آواز بلند ہو رہی تھی اور زبیدہ بیگم اپنے کمرے کے دروازے میں ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ تمیرا گرد و پیش سے بے نیاز روئے چلی جارہی تھی۔ اونچا اونچا۔ بلند آواز میں اس کے اندر ٹمٹماتا امید کا دیا بجھتا جارہا تھا۔



الوینا کے کمرے میں بیڈ پر بیٹھے احمد رضا [illegible] آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی۔ وہ گود میں [illegible] رکھے ساکت بیٹھا تھا اور اس کے دائیں طرف [illegible] رچی کہہ رہا تھا۔

"تو میں کہہ رہا تھا احمد رضا کہ تمہاری زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔ کل سے تم ایک نئی زندگی شروع کروگے۔ ایک نئے نام' ایک نئی پہچان کے ساتھ کل اس وقت تم یوکے جانے کے لیے جہاز میں بیٹھ چکے ہوگے۔" احمد رضا نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

"نیا نام' نئی پہچان۔ یوکے کا سفر۔ لیکن کیوں کس لیے۔ مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ مجھے۔ یہیں رہنا ہے اسی ملک میں۔"

"یہاں رہوگے تو پھر جیل کی کوٹھڑی میں باقی عمر گزار دوگے۔"

"لیکن میرا قصور کیا ہے۔" وہ رچی سے بحث کر رہا تھا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم ایک جھوٹے نبی کے ساتھ تھے۔ جسے آج ملک سے بھاگتے ہوئے ایرپورٹ پر سے گرفتار کرلیا گیا۔ وہ صرف جھوٹا نبی ہی نہیں تھا' بلکہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا۔"

"نہیں۔۔۔ وہ ایسے نہیں تھے۔" احمد رضا نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہا احمد رضا! بلکہ تمہارا پریس کہتا ہے۔ اب وہ باقی ماندہ زندگی جیل میں ہی گزار دے گا اور اگر وہ یہاں رہتا تو کسی روز کوئی سرپھرا اسے مار دیتا۔ اسی لیے اس کا ملک سے باہر جانا ضروری تھا۔ لیکن افسوس نہ جانے کس نے مخبری کی کہ وہ پکڑا گیا۔ شکر کرو تم اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اگر ساتھ ہوتے تو تم بھی پکڑے جاتے۔"

"تو۔۔۔؟" احمد رضا الجھا۔ "تحقیق کرنے پر وہ مجھے چھوڑ دیتے' مجھ پر کوئی جرم ثابت نہ ہوتا۔"

"اچھا!" رچی کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری اور اس نے تمسخرانہ نظروں سے احمد رضا کو دیکھا۔

"تم ابھی یہاں کی پولیس اور جیل کے متعلق کچھ نہیں جانتے میری جان۔ تحقیق پر تم ضرور بے گناہ ثابت ہو جاؤ گے۔ لیکن تحقیق میں کتنا وقت لگے گا۔ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔ تمہاری باقی ماندہ زندگی جیل میں ہی گزر جائے گی، چکی پیستے جانتے ہو جس کوٹھڑی میں تمہیں رکھا جائے گا۔ وہاں جو جگہ تمہیں ملے گی اتنی چوڑی اور لمبی ہوگی جس میں تم بمشکل لیٹ سکو گے۔ کروٹ بدلنا بھی مشکل ہوگا اور پھر تمہارے ساتھ جو اور لوگ اس کوٹھڑی یا بیرک میں تمہارے ساتھ ہوں گے وہ تمہاری طرح پڑھے لکھے نازک مزاج نہیں ہوں گے۔ ان میں ڈاکو بھی ہوں گے اور قاتل بھی۔ نشہ کرنے والے بھی ہوں گے۔

اور دادا قسم کے لوگ تم سے ٹانگیں بھی دبوائیں گے اور ہر طرح کا ان کا حکم تمہیں ماننا پڑے گا۔

جب کنکر ملی دال کا پانی اور جلی ہوئی روٹیاں کھاؤ گے تو تمہیں افسوس ہوگا کہ تم نے میری بات کیوں نہیں مانی۔"

اس نے خاموش بیٹھے احمد رضا کو دیکھا اور قدرے نرمی سے کہا۔

"دیکھو احمد رضا! یہ ضروری نہیں کہ تم بے گناہ ہی ثابت ہو جاؤ۔ ہماری پولیس کے لیے کسی بے گناہ کو گناہ گار ثابت کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہوتا۔ تم اپنی عمر دیکھو اور سوچو کہ کیا تم اپنی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پسند کرو گے یا ایک لگژری زندگی کو ترجیح دو گے؟"

اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے اس کے گود میں رکھے ہاتھوں کو چھوا۔

"یہ ہاتھ... یہ قلم تھامنے والے نازک ہاتھ۔ جب تمہیں جیل کی مشقت جھیلنا پڑے گی تو ان ہاتھوں میں گڑھے پڑ جائیں گے یا کھردرے اور بھدے ہو جائیں گے۔" وہ اسے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

احمد رضا نے ایک جھرجھری سی لی، لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے رچی سے کچھ نہیں کہا۔ رچی لمحہ بھر اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔

"آج رات اچھی طرح سوچ لینا احمد رضا! کل فلائٹ سے تمہیں جانا ہے۔ ہم سب بھی ایک ... دو کر کے یہ ملک چھوڑ دیں گے۔ بعد میں اگر تم ... ملک چھوڑنا چاہا تو شاید تمہارے لیے اتنا آسان ... ایک نئے نام نئی شناخت سے آئی ڈی کارڈ حاصل ... پاسپورٹ بنوانا۔ تمہارے بس کا کام نہیں ... اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کے لیے ہمیں کتنے پاپڑ ... پڑے اور کتنا پیسہ خرچ کرنا پڑا۔"

اس نے دروازہ کھولا۔

"اور اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اپنے لیے جیل کی کوٹھڑی منتخب کرتے ہو یا ایک شان دار ... زندگی۔"

"شان دار گھر، گاڑی، نام، شہرت، بہت کچھ ... رکھا ہے ہم نے تمہارے لیے۔"

وہ ایک دم ہی دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا تھا۔

اور احمد رضا خالی دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

جیل کی مشقت بھری زندگی۔

ایک شان دار زندگی۔

ایک ایسی زندگی جس کی اس نے تمنا کی تھی۔ ...

اس تمنا کی تصویر میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ... اپنے اس کے ساتھ تھے۔

امی ابو اور سمیرا۔

لیکن یہ زندگی جس کی پیش کش ابھی رچی کر ... گیا۔ اس میں وہ تنہا تھا۔ بالکل اکیلا۔

سمیرا، امی، ابو کہیں نہیں تھے۔ تصویر میں صرف ... تھا۔ لیکن سمیرا، امی، ابو اب کہاں تھے۔ اب بھی ... اکیلا تھا۔

وہ اسے چھوڑ گئے تھے۔ آج صبح بھی وہ اپنے گھر ... طرف گیا تھا اور اس نے الوینا کو بھیجا تھا اپنے ... لیکن وہی جواب۔ "کچھ نہیں جانتے۔ حسن ... صاحب کہاں گئے ہیں۔" الوینا نے قاضی صاحب

ملک صاحب کے دروازے پر بھی دستک دی تھی۔ لیکن وہ بھی بے خبر تھے۔ اس روز وہ آفس بھی تو گیا تھا سلیم صاحب نے اسے بتایا تھا کہ وہ جاب چھوڑ کر اور ... گئے ہیں۔ کہاں؟ یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

"اگر میں نہ بھی جاؤں تو میرے پاس سمیرا، امی، ابو نہیں ہوں گے اور مجھے اکیلے قید کی صعوبتیں برداشت کرنا ہوں گی۔ ابو ہوتے تو شاید مجھے قید سے بچا لیتے۔ بھاگ دوڑ کر کے وہ کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے۔ آخر اتنے سارے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ لیکن اب جب اسے تنہا ہی رہنا ہے تو وہ جیل کی بند کوٹھڑی میں زندگی گزارنے کے بجائے ایک شان دار زندگی کا انتخاب کیوں نہ کرے۔"

اس نے سوچا، لیکن اس کے باوجود وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

وہ الجھ رہا تھا۔ پریشان ہو رہا تھا۔ شاید وہ کبھی فیصلہ نہیں کر پائے گا۔

اس نے سوچا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔

"یہ بہت مشکل ہے۔" اس نے زیر لب کہا۔

لیکن بند دروازے کے باہر لاؤنج میں کھڑا رچی پورے یقین سے کہہ رہا تھا۔

"وہ فیصلہ کر چکا ہے الوینا۔"

"کیا فیصلہ؟" الوینا بے چین ہوئی۔ "وہ نہیں جائے گا۔ وہ یہ ملک کبھی نہیں چھوڑے گا۔ جہاں اس کے والدین اور بہن رہتی ہے۔ ہم نے جو کچھ اس پر انویسٹ کیا ہے۔ وہ سب ضائع چلا جائے گا۔"

الوینا کچھ مایوس سی تھی۔

"کچھ بھی ضائع نہیں جائے گا الوینا!" رچی مسکرایا۔ "وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ صاف لکھا ہوا، بس وہ کہنے سے جھجک رہا ہے اور یہ کام تم کرو گی الوینا اور تمہارے پاس آج کی رات ہے۔ صبح تک تم کو اس سے فیصلہ لینا ہے اور کل اس وقت تم اور احمد رضا جہاز میں بیٹھے ہو گے۔"

الوینا نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور رچی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔

الوینا نے دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"جی سر! سب کچھ ایسے ہی ہوا ہے جیسا آپ نے کہا تھا۔ اسے گرفتار کروا دیا گیا ہے، لیکن سر! یہ کچھ جلدی نہیں تھا۔"

"اوکے سر! آپ بہتر سمجھتے ہیں۔" الوینا دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"بالکل سر۔ آج اس کی زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا ہے۔ کل سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے نئی زندگی۔

نیا نام نئی پہچان۔"

وہ زور سے ہنسا اور مڑ کر الوینا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ الوینا کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ رچی بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے وکٹری کا نشان بنایا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ الوینا ہلکا سا سر خم کرتے ہوئے دروازہ کھول کر کمرے میں چلی گئی۔ رچی وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حمیرا عروش



میں آپ کو ایک مثالی گھرانے کی سیر کرانے جارہی ہوں۔ آیئے! میرے ساتھ۔ مگر۔۔۔

شش۔۔۔ خاموش۔

نمرہ حیات کو تو آپ جانتے ہیں نا۔ یہ اسی کا گھر ہے اور میں اس کی بڑی بہن ہوں۔

آپ یقیناً "میرا شمار خوش قسمت لوگوں میں گردان رہے ہوں گے کہ میں معروف مصنفہ کی ہمشیرہ ہونے کا اعزاز رکھتی ہوں۔

اللہ کے فضل و کرم سے میرا تعلق بہت اچھی فیملی سے ہے اور میں بہت اچھی زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ اگر۔۔۔

نمرہ حیات نامی کانٹا میری زیست میں نہ ہو۔

اب آپ یقیناً "مجھے غلط سمجھ رہے ہوں گے۔

لیکن نہیں' آپ میں سے جو لوگ نمرہ کے عتاب کا نشانہ بن چکے ہیں۔ وہ ایک سو ایک فیصد میری بات سے متفق ہوں گے۔ سو فیصد ان کا حق ہے اور ایک فیصد اضافی متفق۔

"نمرہ حیات" وہ شے ہے' جس سے خود شیطان بھی گھبراتا ہے۔

آہستگی سے راہ داری سے گزر کر میرے کمرے میں تشریف لایئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی ذات نمرہ کی نگاہوں کی زد میں آجائے اور پھر۔۔۔

ایک نئی کہانی تیار۔

جی ہاں۔۔۔ یہی تو مسئلہ ہے۔ جہاں اس کو کوئی بندہ نظر آیا' وہیں اس کی تازہ کہانی تیار اور پھر لوگوں کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ جب نمرہ حیات ان کی داستان زیست بمع ان کے نام کسی بھی ڈائجسٹ کو کردیتی ہیں اور پھر چند ہی روز بعد وہ منظر عام پر آ ہے۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے۔ اپنے سامنے وال انکل کے بڑے فرزند نے اپنے ہی گھر میں ڈاکا ڈال ان کے والد محترم نے اپنے فرزند کے عیب ڈھا کے لیے بات آئی گئی کرنا چاہی' مگر۔۔۔

کچھ روز بعد ہی مقامی رسالے نے سارا قصہ مسالا لگا کہ ان لوگوں تک بھی پہنچا دیا' جن کے علم نہ تھا۔ یوں ان کی بدنامی نمرہ حیات کے ہاتھوں ہوگئی۔

میری اکثر سہیلیاں ہمارے ہاں آنے سے کترا ہیں کہ نمرہ حیات نے ان کے وہ افیئرز جن سے وا فقط ان کی اپنی ذات تھی۔ اپنے زور قلم سے ان والدین تک پہنچا دیے اور یوں ان کی شامت ہوگئی۔

اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نمرہ حیات شیطان کیوں گھبراتا ہے۔ میری اپنی ذات' جس کبھی کسی کو ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچتی۔ اکثر حیات کے "زیر قلم" آئی رہتی ہے۔

جب کبھی میں خاموش بیٹھی رہوں تو اسے میر آنکھوں میں تنہائی و یاسیت کے جالے دکھائی دیت ہیں۔ جب بات چیت کروں تو اسے اپنی کسی کہانی کوئی نیا موڑ میری ذات میں پنہاں نظر آتا ہے۔ دا



اپنی کہانیوں کے لیے زندہ مثال تلاشتی رہتی ہے۔

اپنی پچھلی گلی کے کونے والے مکان کے نئے کرائے داروں کی لڑکی فریحہ سامنے والی نویرا خالہ کی بیٹی جویریہ کی شادی میں نمرہ سے ٹکرا گئی۔ ظاہر ہے نمرہ کو اپنی نئی کہانی مل گئی۔

لڑکی کے۔۔۔ بیک وقت دو بوائے فرینڈز تھے۔ دونوں کے ساتھ عاشقی زوروں پر تھی۔ ایک موصوف کا قیام یونیورسٹی میں تھا تو دوسرے کا تعلق اپنے خاندان سے ہی تھا۔ اس نے اپنی دونوں پریم کہانیاں بڑی ڈینگیاں مارتے ہوئے نمرہ کے گوش گزار کردیں۔

اب اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارنے لگی ہے۔

بہرحال دو ماہ بعد جب وہ ہاتھ میں رسالہ تھامے منہ بسورے ہمارے گھر داخل ہوئی تو میں سارا معاملہ سمجھ گئی۔ یہ وہی رسالہ تھا' جس میں اس کی داستان عشق بلکہ "داستان ڈبل عشق" بڑے ہی اہتمام سے شائع کی گئی تھی۔

آتے ہی وہ نمرہ کے کمرے کی جانب بڑھی۔ نمرہ اپنی نئی کہانی لکھنے میں مصروف تھی' جو نویرا خالہ کی بیٹی جویریہ کے سابق قصوں سے وابستہ تھی۔ فریحہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

"نمو! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ تو نے تو مجھے برباد کردیا۔ یہ دیکھ! یہ کیا کیا ہے تو نے؟" اس نے رسالہ نمرہ کے سامنے ایسے کھول کے رکھ دیا۔ جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ میں بمشکل ہنسی ضبط کیے کھڑی رہی۔

نمرہ نے اپنا چشمہ پہلے آنکھوں کے سامنے کیا اور پھر ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہوگئی۔

وہ بے چاری روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ جاتے سے اپنا رسالہ اٹھانا نہ بھولی تھی۔ مبادا میں اس کی کہانی سے لطف اندوز نہ ہوجاؤں۔

ہوا یوں تھا کہ فری کی داستان ڈبل عشق جب اس کے اصلی نام اور اس کے بوائے فرینڈز کے ناموں اور ان کے ڈائیلاگز سمیت شائع ہوئی تو ان دونوں رقیبوں تک پہنچ گئی۔ فریحہ کا بھانڈا پھوٹ گیا اور یوں اب وہ "ناکامئ عشق" میں آنسو بہاتی پھر رہی تھی۔

نمرہ کی دوست فروا کی بڑی بہن کی چار سالہ بیٹی فروا کے ہمراہ نمرہ سے ملنے کے لیے آئی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب وہ اپنی توتلی زبان میں نمرہ سے بولی۔

"آنتی! آپ چوڑیل ہونا۔" (آنٹی! آپ چڑیل ہونا) نمرہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آنتی نے بتایا تھا' آپ چوڑیل (چڑیل) ہو۔" وہ فروا کی طرف اشارہ کرکے معصومیت سے بولی۔ میں ہنسی ضبط کرتی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور قارئین! حیرت کی بات بتاؤں کہ اس دن کے بعد نمرہ نے کسی کی بھی ذات کے پرخچے نہیں اڑائے۔

☼

ناولٹ



نازیہ جمال

محبت معتبر میری

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟ پاگل تو نہیں ہوگئیں؟"

عظمیٰ اس کی بات سن کر غصے سے چیخ پڑی۔ اسے ایک لمحے کو گمان ہوا' شاید اس کا ذہنی توازن خراب ہوچکا ہے یا پھر وہ مذاق کے زبردست موڈ میں ہے۔ مگر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے خوب صورت نقوش سے سجے چہرے پہ مذاق کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ ہاں بس جہاں بھر کی مظلومیت اور لاچاری چھائی ہوئی تھی۔

"پلیز یار! کچھ کرو' میں سخت پریشان ہوں۔" منت آمیز لہجے میں بولتے ہوئے اس نے عظمیٰ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ انداز میں اس حد تک عاجزی تھی کہ لگتا تھا' کسی لمحے ہاتھ چھوڑ کر پاؤں پکڑنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

"دفع ہوجاؤ۔ اس قسم کی فضول بونگیوں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔" عظمیٰ نے جھٹکے ہاتھ چھڑا لیے۔

"تو ٹھیک ہے۔ پھر آج میرا تمہارے گھر آخری دن ہے۔ بلکہ گھر کیا' ہماری دوستی کا بھی ہوگیا آج سے۔"

عظمیٰ کے صفاچٹ انکار نے جیسے اس کے آگ بھردی تھی۔ فوراً" طیش میں آکر بیگ کند ڈالا اور ساتھ پڑی چادر اٹھا کر اوڑھنے لگی۔ وہ چہرہ بے کسی' بے چارگی' التجا اور مظلومیت کے چھائے ہوئے تھے۔ اب صرف وہاں غصہ' ناراضی بے گانگی ہی نظر آرہی تھی۔

"مہرماہ! ایسے تو مت کرو۔" عظمیٰ اس کے کندھے سے بیگ زبردستی اتارتے ہوئے روہانسی ہو کر بولی۔

"میں تمہاری دوست ہوں۔ اصلی اور پکی والی۔ یہ دشمنوں جیسا رول کیوں پلے کروانا چاہتی ہو مجھ سے؟" عظمیٰ عاجزی سے بولی۔

"ہونہہ! دوست۔" اس نے طنز سے ہنکارا بھرا۔ "دوست وہ ہوتا ہے جو مشکل وقت میں کام آئے نا کہ آنکھیں پھیرے۔ تمہارا فرض بنتا ہے کہ اپنی اکلوتی فرینڈ کی ہر حال میں مدد کرو۔"

"اپنی اکلوتی فرینڈ کی یہی مدد کر سکتی ہوں کہ اسے اس قسم کی فضول حرکت سے روکوں کہ وہ نہ تو اپنے کردار کو لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنائے اور نہ ہی اپنی بیوہ ماں کی پریشانیوں میں اضافہ کرے۔" عظمیٰ نے تحمل سے اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی ۔جس کا الٹا اثر ہوا۔

"میں جانتی تھی پھر بھی موہوم سی آس لیے تمہارے پاس چلی آئی۔ مگر خوامخواہ ٹائم ہی ویسٹ کیا۔" پلنگ کے نیچے جوتے ڈھونڈتے ہوئے وہ رکھائی سے بولی۔ اجنبیت' بے گانگی اور بے مہری ایک ایک انداز سے چھلک رہی تھی۔ عظمیٰ کچھ دیر اسے گھورتی رہی' پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو! بیٹھو مرو۔ میں باقر کو بلاتی ہوں۔" عظمیٰ جل کر بولی۔ پھر پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ سیدھے ہوتے ہوئے اس کے لبوں پہ مسکراہٹ آ بجی

چند لمحوں بعد باقر سمیت عظمیٰ کی واپسی ہوئی۔ اس نے بیگ سے فوراً" ایک چٹ نکالی' جس پہ ایک فون نمبر درج تھا۔

" باقر مائی لٹل بردار! آج تم سے ایک کام آپڑا ہے۔ تمہارے پاس اپنا موبائل تو ہے نا؟" بے حد پیار و نرمی سے بولتے ہوئے وہ صوفے پہ اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔

"جی آپی! موبائل تو ہے۔ آپ کام بتائیں۔" باقر مؤدب ہو کر بولا۔ وہ عظمیٰ کی فرینڈ ہونے کے ناتے اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ بچپن سے اپنے گھر میں آتے دیکھا۔ اپنا کوئی بھائی نہ ہونے کی وجہ سے اس نے سارے برادرانہ حقوق باقر کو سونپ دیے تھے۔ تب ہی تو اعتماد سے اس سے اپنا مسئلہ شیئر کرنے لگی۔

" اس نمبر پہ کال ملاؤ۔ عثمان نام کا ایک شخص کال ریسیو کرے گا۔ اسے صرف یہ کہنا ہے کہ "مہرماہ عنادل' جس سے اگلے ہفتے اس کی منگنی ہونے جارہی ہے۔ وہ کسی اور کی محبوبہ و معشوقہ ہے۔ بلکہ کسی اور کی کیوں تمہاری' یعنی باقر احمد کی ہے۔ جسے تم بے حد چاہتے ہو اور اگر اس بندے عثمان نے بیچ میں آنے کی کوشش کی تو اس کا حشر نشر کر دیا جائے گا۔" بے حد ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہوئے اس نے پورا اسکرپٹ باقر کے گوش گزار کیا۔ جسے وہ پچھلے ایک ہفتے کی مغز ماری کے بعد تیار کر پائی تھی۔

"مگر کیوں آپی!" باقر تو بھونچکا رہ گیا۔

" بس میرے بھائی! بڑا مشکل وقت آپڑا ہے۔" باقر کی حیرانی و پریشانی بجا تھی۔ اسے اصل بات کے متن مع سیاق و سباق سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

"عثمان امیر کا پرپوزل کوئی دو ہفتے قبل میرے لیے اس کی ماں' بہنیں لائیں۔ جدہ میں ایروناٹیکل انجینئر' کافی کھلا روپیہ پیسہ' گھر' زیور' سب کچھ لکھ کر دینے کو تیار۔ ہماری اماں ریشہ خطمی نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں۔ فوراً" سے پیشتر اس رشتے کو سند قبولیت بخشتے ہوئے ہمارے دیس نکالا کی تیاریوں میں لگ گئی ہیں۔ ان کے مطابق اگلے چاند کی کسی بھی تاریخ کو مایوں کا پیلا جوڑا ہمارے تن پہ سج جائے گا۔ بہت دہائیاں دیں۔ لاکھ سر پٹخا۔ مگر سب بے سود۔ ان کی ایک ہی رٹ جو میں ہوش سنبھالتے ہی سے سنتی چلی آرہی ہوں۔ تمہیں اپنے گھر کا کرکے بس سکون سے آنکھیں موندنا چاہتی ہوں۔" بولتے بولتے وہ رک گئی اور یاسیت بھری ایک لمبی سانس لی۔ جیسے اس سے آگے کچھ بولنا مشکل ہو رہا ہو۔

باقر کے لیے فون پہ کسی کو دھمکانا' ڈانٹنا کون سا مشکل کام تھا۔ دن کے چوبیس گھنٹے میں بارہ گھنٹے موبائل کے لیے تو بارہ انٹرنیٹ کے لیے مختص تھے۔ پاکستانیوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی ان سہولیات کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا عادی تھا۔ مگر مہرماہ کے لیے محبوبہ اور معشوقہ جیسے الفاظ نکالنا۔ جسے وہ بہن کہتا ہی نہیں مانتا بھی تھا۔ بہت ناگوار لگ رہا تھا۔

"پلیز میرے بھائی! کسی طرح اس بندے کو مجھ سے برگشتہ کر دو۔ میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ادھر اماں میرے انکار کو کسی خاطر میں نہیں لا رہیں۔ بس یہی ایک راستہ بچا ہے میرے پاس کہ وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے۔" باقر کو خاموش پا کے وہ منتوں پر اتر آئی۔ منتوں کا سیشن پھر سے شروع ہوا چاہتا ہی تھا کہ باقر نے اس کے ہاتھ سے چٹ لے لی۔

"اوکے! میں کچھ کرتا ہوں۔ آپ کے سامنے تو اس بندے سے بات کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔ رات اپنے کمرے میں ہی ٹھیک رہے گا۔" باقر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کی جان میں جان آگئی۔ سر سے ایک بوجھ سا ٹل گیا تھا۔

"چلو جی! سر کر لیا معرکہ سر؟" عظمیٰ جو اس دوران خاموش تماشائی بنی کھڑی اسے خونخوار نظروں سے گھورتی رہی تھی۔ باقر کے جانے کے بعد طنز سے پوچھنے لگی۔

"جو بھی سمجھو۔ اب کم از کم رات کو نیند تو آرام سے آئے گی نا۔ قسم سے پورے ایک ہفتے سو نہیں پائی ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تمہیں خالہ جان کا تو خیال کرنا چاہیے۔" عظمیٰ کا انداز شرمندہ کرنے والا تھا۔

"ان ہی کا تو کر رہی ہوں۔" وہ ترنت بولی۔

"تم نہیں جانتیں کیا اماں کا میرے علاوہ اور میرا اماں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ یہ موصوف شادی کے بعد مجھے اپنے ساتھ سعودی عرب لے جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ سوچو! میرے بعد اماں کتنی اکیلی رہ جاتیں۔ انہیں کس کے سہارے پہ چھوڑ کے میں اتنی دور الگ دنیا بسا لوں۔" بولتے بولتے اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ پلکوں پہ شفاف موتی آٹکے۔

"تم اپنی محبت سے مجبور ہو کر کہہ رہی ہو' جو یقیناً" غلط نہیں مگر ایک بیٹی کو وقت پہ وداع کرنا بھی تو ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے۔ خالہ بھی تو کچھ غلط نہیں چاہتیں۔" عظمیٰ نے نرمی سے بولتے ہوئے اس کے آنسو اپنی انگلی سے چن لیے۔



دوپہر میں ڈھیر سارا سو چکنے کے بعد وہ لمبے ریشمی سنہری بالوں کا جوڑا بناتی باہر چلی آئی۔ اماں گھر گھر کپڑے بیچنے والی سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔ سرخ' زرد' نیلے' اودے' ہر رنگ کے ریشمی کامدار



جھلملاتے کپڑے دری پہ بکھرے ہوئے تھے۔ اماں نے اسے دیکھا تو پکار لیا۔
"مہپاہ! ادھر آؤ' دیکھو' نارنجی رنگ تمہارا پسندیدہ ہے نا؟" وہ ایک نارنجی رنگ کا موتیوں وستاروں سے مزین چمکیلا وبھڑکیلا سوٹ اٹھائے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ آپ کو پسند آرہا ہے تو لے لیں۔" وہ بے دلی سے کہتی صوفے پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ سارے جسم میں سستی بھری تھی۔ ایک عجیب سی کسل مندی چھائی تھی اس پہ۔
"یہ آپ کی بیٹی ہے جی!" موٹے موٹے نقوش والی سانولی سی عورت نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ نظریں واضح طور پر اسے سراہ رہی تھیں۔
"ہاں! یہی ایک میری اولاد ہے۔" اماں دوپٹے کے چوڑے بارڈر پہ ہاتھ پھیر کر کام کی نفاست کا اندازہ لگانے لگیں۔
"بڑی سوہنی بیٹی ہے آپ کی۔ بس! اللہ آگے نصیب بھی ایسا سوہنا کرے۔" عورت دعائیہ انداز میں بولی۔ اماں نے پانچ مختلف رنگوں کے جوڑے الگ سے نکال لیے۔ گویا پوری گٹھڑی میں سے انہیں یہی پانچ جوڑے پسند آئے تھے۔ باقی کو تہہ لگانے میں عورت کی مدد کرنے لگیں۔
"بس! تم اب اپنا حساب کرو۔" سارے کپڑے پھر سے گٹھڑی میں بندھ چکے تھے۔
"جو آپ مناسب قیمت لگائیں۔ مجھے منظور ہے۔ حساب تو آپ کو بتا چکی ہوں۔"
اماں اور عورت میں مول تول جاری تھا۔ وہ اکتا کر اندر کمرے میں آگئی۔ ٹی وی چلا کر ابھی ایک' دو چینل سرچ کیے ہی تھے کہ لائٹ چلی گئی۔
چوبی کھڑکی کے پٹ زور سے آپس میں ٹکرائے۔ مٹی سے بھری ہوا کا تیز جھونکا اندر آیا تھا۔ کمرے کی ہر چیز پہ گرد کی ہلکی سی تہہ آجمی تھی۔ وہ باہر نکلی۔ آسمان پہ شمال کی طرف سے زرد آندھی کا غبار اٹھتا نظر آیا۔

اماں چارپائیاں گھسیٹ کر اندر برآمدے میں لانے لگیں۔ وہ صحن میں بکھری چیزیں اٹھانے میں اماں کی مدد کرنے لگی۔ آندھی اتنی تیز تھی کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
سورج کی روشنی پہ طوفان کی تیرگی غالب آچکی تھی۔ اسی گردوغبار کے طوفان میں بادل بھی چھپے تھے جو اتنی زور سے کڑکے کہ ایک لمحے کو مہپاہ اماں سے لپٹ گئی۔ وہ لالٹین اپنے سر سے اونچا کیے کمرے کی چھت کے چاروں کونوں میں نظر دوڑا رہی تھیں۔
باہر چھاجوں چھاج مینہہ برس رہا تھا۔ چھت کے چاروں کونوں سے بارش کا پانی اندر آرہا تھا۔
اماں نے لالٹین کیل پہ اٹکانے کے بعد شیلف کے سارے برتن اتار کر دیواروں کے ساتھ لگادیے۔ چند سیکنڈز میں برتن لبالب بھر جاتے اور اماں انہیں باہر صحن میں خالی کر آتیں۔
قدرت یہ مشغلہ انہیں ہر برسات میں فراہم کرتی تھی۔ سالوں سے یہ شغل جاری تھا۔ وہ بے تاثر نظروں سے ماں کو اندر باہر آتا دیکھتی رہی۔
"مہپاہ! تم ٹارچ لے کر ذرا دوسرے کمرے کا جائزہ تو لو۔ ماں کی خواری تو تمہیں نظر نہیں آرہی۔" اماں اسے یوں ساکت کھڑا پاکر غصے سے بولیں۔ وہ خاموشی سے ٹارچ اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی آئی۔
چاروں کونوں میں روشنی کا دائرہ گھمایا۔ دیواریں خشک تھیں۔ اس نے سکھ کا سانس لیا۔
"چلو! شکر ہے یہ چھت تو سلامت ہے۔ ورنہ پلستر تو سارے کا سارا اکھڑ چکا ہے۔ اینٹیں بھی ابھری ہوئی ہیں۔ بارش کا کیا قصور' ہم نے بھی تو کئی برسوں سے ان کی مرمت نہیں کی۔"
اماں نے بھی آکر جائزہ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔
"تمہارے ابا بہشتی اچھے دنوں میں بنوا گئے تھے۔ بڑا سستا زمانہ۔۔۔" اماں کی بات ادھوری رہ گئی۔ ان کے سر پہ پانی ٹپکا تھا۔ پشت تو اسی لمحے مہپاہ کی بھی گیلی ہوئی

تھی۔ چھت کئی جگہوں سے بوند بوند پانی ٹپکانے لگی تھی۔ کچن کے سارے برتن فرش پہ سج چکے تھے۔
"تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہو کر پہلا کام اس کی مرمت کا کروائی ہوں۔ مگر کیا کروں' کافی پیسہ تمہاری چیزیں جوڑنے میں لگ گیا۔ کپڑے' برتن' زیور تو میرا اپنا شکر ہے' پڑا ہے۔" اندھیرے میں اماں کی آواز ابھری۔
"ان فضول سے چمکیلے واہیات کپڑوں سے زیادہ ضروری چھت کی مرمت ہے۔" وہ غصے سے بولی۔ کئی گھنٹوں سے کھڑے رہنے کی وجہ سے ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔
"برتنوں کا اتنا ڈھیر لگالیا جیسے میں وہاں جا کر کوئی کراکری کی دکان کھولوں گی۔" اسے اماں کی ان فضول خرچیوں پہ بہت غصہ آیا ہوا تھا۔
"جو بھی کرنا' چاہے باہر پھینکنا یا کسی کو اللہ واسطے دے دینا' مگر مجھے میرا فرض پورا کرنے دو۔" اماں جل کر بولیں۔ "جب سے رشتہ طے ہوا ہے۔ صاحب زادی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ ہر وقت تیوریاں چڑھائے بس گونگے کا گڑ کھائے رہتی ہے۔ جیسے ماں نہ ہوئی کوئی دشمن ہو گئی۔ "جب بندے کو اوقات اور ضرورت سے زیادہ مل جائے تو یوں ہی ناشکری کرنے لگتا ہے۔ جیسے تم کر رہی ہو۔ بات بات پہ ماں کو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔" ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ اماں اس کے رشتے' منگنی' شادی یا جہیز کے متعلق کوئی بات یا دلچسپی دکھائیں اور مہپاہ ان کا بائیکاٹ نہ کرے۔ وہ کھانا پینا' کام کرنا اور بولنا ترک کر کے کمرے میں بند ہو کر سوئی رہتی۔
اماں تو اس کی غیر سنجیدگی پر سخت تاؤ کھائے رہتی تھیں۔ کیا کرتیں اس کے ساتھ۔ صرف ایک ہی جگر کا ٹکڑا۔ شادی کے بارہ سال بعد دعائے نیم شبی کی قبولیت کا انعام اور مرحوم شوہر کی نشانی۔ دل پہ پتھر رکھ کر رشتے سے انکار کہلوا بھیجتیں اور صاحب زادی اگلے ہی لمحے خوش باش اور نہال۔ سرو قد' نازک سراپا' رنگت ایسی اجلی کہ چاندنی کھلی ہو۔ لمبے ریشمی بال'

سرمئی چمکتی آنکھیں۔ ابھی چودھواں سن لگا ہی تھا کہ بیری پہ وہ تڑاتڑ پتھر برسے کہ وہ تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔
اتنی کم عمر' اوپر سے لاپروائی اور ہٹ دھرمی میں ثانی نہ رکھنے والی۔ وہ کیسے اتنی جلدی خود سے جدا کر دیتیں۔ مگر اپنی گرتی ہوئی صحت نے انہیں عثمان امیر کا رشتہ منظور کرنے پہ مجبور ہی کر دیا تھا اور مہپاہ نے وہی مخصوص تکلیف دہ رویہ اختیار کر لیا۔ مگر اب کی بار وہ اس کی کسی بلیک میلنگ کو خاطر میں نہ لائیں۔ جھٹ سے ہاں کہہ دی۔ اب اس کی عمر کا ہندسہ بھی تو اٹھارہ عبور کرنے والا تھا۔
"عثمان اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا' کمانے والا' ہر سال تمہیں پاکستان مجھ سے ملوانے بھی لائے گا۔" بارش کے تیز شور میں اماں کی دھیمی آواز سنائی دی۔
"اگر اتنا ہی اچھا ہے تو اسی گھر میں رہ جائے۔۔۔ آپ کا بیٹا بن کر۔۔۔ میں بھی آپ سے جدا نہ ہو پاؤں گی۔" وہ فوراً "تپ گئی۔
"صاف بتا دیا' یتیم بچی ہے۔ نہ باپ نہ بھائی' کوئی لمبا جہیز نہیں ملے گا۔ کوئی اعتراض نہیں۔" وہ برتن اٹھا کر باہر برآمدے میں چلی آئی۔
کچھ دیر غائب دماغی کی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد اس نے پانی زور سے صحن میں اچھال دیا۔ بجلی کی چمک میں سارا صحن لمحہ بھر کو روشن ہوا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر برآمدے کے شیڈ کے آگے تنی موتیوں کی جھالر کو کھڑی دیکھتی رہ گئی۔
پہلے اس کا سر بھیگا' پھر بالوں میں رستا ہوا پانی پوری چوٹی کو بھگوتا قطرہ قطرہ کر کے چوٹی کے سرے سے ٹپکنے لگا تھا۔ اس نے سردی سے کپکپاتے ہوئے سر پہلو سے ٹکا دیا۔ پانی سے شرابور چہرے پہ اس کے آنسو بے آواز بہے چلے جا رہے تھے۔
وہ اب سرتاپا بارش کے پانی سے بھیگ چکی تھی۔ کیونکہ برآمدے میں جس جگہ وہ کھڑی تھی' وہاں عین اس کے اوپر برآمدے کی چھت ٹپک رہی تھی۔
"ابا! آپ ہمیں جلدی چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ آپ کے ہوتے ہوئے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ

بارش میں چھت چار گھنٹے ٹپکتی رہے۔" وہ سیاہ گھپ اندھیرے میں کسی نادیدہ نقطے کو روتے ہوئے گھورے گئی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات "ٹینشن" کھڑے ہونے اور بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اس کا جوڑ جوڑ درد سے دکھ رہا تھا۔ حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اماں صبح سے کچن میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ازلی کام چوری اور جسمانی تکلیف کو ایک طرف رکھے رات کے "استعمال شدہ" برتن دھونے میں لگ گئی۔ تیز چمکیلی دھوپ پورے گھر کو سنہری پن عطا کر رہی تھی۔

برتن دھو کر اس نے خشک ہونے کے لیے چارپائی پہ پھیلا دیے۔ وائپر اٹھا کر ٹیڑھے میڑھے فرش کی اینٹوں سے بارش کا پانی نکالا۔ گملے برآمدے سے نکال کر دیوار میں نصب لوہے کے اسٹینڈ میں رکھے۔

اماں اپنے لیے سادہ روٹی' دہی اور اس کے لیے گھی میں تربتر خوشبو اڑاتا پراٹھا اور چائے کے دو مگ لے کر باہر آگئیں۔

وہ ہاتھ پونچھتی چارپائی پہ آکر ان کے ساتھ ناشتا کرنے لگی۔

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی نظر اماں کے چہرے پہ گئی۔ ان کی آنکھیں بھی بے خوابی اور تھکاوٹ کے باعث سرخ اور مضمحل نظر آ رہی تھیں۔

اسی دم دروازے پہ کھٹکا ہوا اور بوا زینت شلوار اڑسے' برقع سمیٹے' کیچڑ زدہ چپلوں سے دھلے فرش پہ مٹی کے نشان چھوڑتی ان کے پاس آئیں۔

"ارے آؤ زینت! کافی دنوں بعد پھیرا ڈالا ہے۔" اماں نے خوش اخلاقی سے ایک طرف ہو کر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"سلام بوا!" مہرماہ نے سلام کیا۔

"جیتی رہو۔ اللہ جوڑا اچھا بنائے۔" وہ دعا دیتے ہوئے برقع اتار کر بیٹھ گئیں۔ ان کا برقع بھی پیچھے سے کیچڑ سے داغ دار تھا۔

"جاؤ بیٹا! خالہ کے لیے چائے بنا دو۔" اماں اس سے مخاطب ہوئیں تو وہ سرہلاتی اٹھ گئی۔ زینت کے توسط سے ان کی بیٹی کا اتنے اچھے گھر میں رشتہ طے پایا تھا۔ وہ ان کی ازحد ممنون تھیں۔ وہ کئی دنوں سے زینت کی آمد کی منتظر تھیں۔

"اور سب خیر تو ہے نا زینت!" اماں نے پوچھا۔

"سرخ کوٹھی والوں کی کوئی خیر خبر؟"

"مٹی ڈالیں ان کوٹھی والوں پر۔" بوا زینت بے زاری سے بولیں۔

"کیوں بھئی' خیر تو ہے ناں؟" اماں کو اچنبھا ہوا۔

"مجھ سے کیا پوچھتی ہیں۔ میں نے تو اس طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ بڑے کمینے لوگ نکلے۔ سفید دھن پر کالے من والے۔"

اماں ہونق سی زینت کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ بات ان کے پلے نہ پڑی تھی۔

"مہو بیٹی کے لیے انکار کر دیا انہوں نے۔" نظریں چراتے ہوئے بوا زینت ہولے سے بولیں۔

"انکار کر دیا؟ مگر کیوں؟" اماں تو ہکا بکا انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

"کتنے چاؤ سے رشتہ لائیں۔ بہت مان سے مہو کو اپنایا۔ نہ کوئی اعتراض' نہ کوئی آنا کانی۔۔۔ اب ایسے خواہ مخواہ کا انکار۔" مارے صدمے کے اماں سے بولا نہ جا رہا تھا۔

"وہی تو۔۔۔ اب بھی اعتراض تو نہیں جڑا۔۔۔ مہو بیٹی پہ تو ماں بیٹیاں دل و جان سے فدا ہیں۔۔۔ بے چاریاں ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافی مانگنے لگیں' پر کیا کریں مجبور ہیں۔ بیٹا جو نہیں مان رہا۔ کہتا ہے ایسی کردار کی ڈھیلی لڑکی کو اپنی بیوی ہرگز نہیں بناؤں گا' جس کے عاشق اسے دن میں ہزار بار فون پہ دھمکاتے ہوں۔ جان لینے کے درپے ہوں۔"

"کم بخت مارا' یہ الفاظ میری نیک بچی کے لیے زبان سے نکالے۔ تو نے گدی سے کھینچ لی ہوتی زینت!" اماں تو جوش غضب سے پھٹ پڑیں۔ کچن میں ان دونوں کی گفتگو غور سے سنتی مہرماہ کا دل خوشی سے جھگڑے ڈالنے کو چاہا۔ چائے گرم کر کے فوراً پراٹھے کا بیڑا اٹھا لیا۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے' یوں ہی منہ سے لوٹ آئی۔ خوب سنائیں لڑکے کو' غضب خدا کا۔۔۔ ہماری بچی پہ انگلی اٹھاتے ہوئے شرم نہ آئی اسے۔" بوا زینت نے بھی اپنے دلی جذبات کی عکاسی کی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ اب کے ایسا رشتہ مہو بیٹا کے لیے لاؤں گی کہ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ ذرا موسم ٹھیک ہو جائے' پھر نکلتی ہوں کام پہ۔ کوئی شہزادہ ہو گا جو ہماری رانی بٹیا کو بیاہ لے جائے گا۔" ناشتے سے مکمل انصاف کرتے ہوئے بوا زینت نے اماں کو امید کی ڈور پکڑائی اور رخصت ہوئیں۔

"ارے اماں! بوا ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ آپ اتنی مایوس کیوں ہو رہی ہیں؟"

باقر کی غائبانہ بلائیں لیتی اماں کی دلجوئی کو آگے بڑھی۔ چہرے پہ مچلتی مسکراہٹ پہ زبردستی سنجیدگی چڑھاتے ہوئے وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

"چلو کہہ دیتے لڑکی منہ پھٹ' زبان دراز ہے۔ بڑوں کا ادب کرنا نہیں جانتی۔ سلیقہ شعور چھو کر نہیں گزرا۔ صرف اچھی صورت ہے۔ چائے تک سیدھی نہیں بنا سکتی۔ مگر ایسا الزام۔۔۔" اماں کو رہ رہ کر عثمان پہ غصہ آ رہا تھا۔

"اماں!" اس نے سخت برا مانا۔

"یہ آپ انہیں برا بھلا کہہ رہی ہیں یا میری خامیاں گنوا رہی ہیں؟"

"حق ہا! کیسے سوچا تھا کہ بیٹی کوٹھی میں راج کرے گی۔ مگر ہوا کیا؟" وہ وہیں چارپائی پہ لیٹ گئیں۔ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے چلے جانے کا ملال کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"صرف سات سو روپے؟" اخبار والے نے حیرت سے اپنے ہاتھوں میں پیسے دیکھے جو اماں نے ابھی اسے تھمائے تھے۔

"بہن جی! آپ کا ایک ہزار روپے بل بنتا ہے۔ پچھلے چار ماہ سے آپ نے اخبار کا بل ادا نہیں کیا۔"

"اچھا! میں لاتی ہوں۔" اماں نے خاموشی سے بقیہ پیسے لا کر اسے تھمائے۔

"اور بھیا! آئندہ سے ہمارے گھر اخبار نہ ڈالیے گا۔" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے گیٹ بند کر دیا۔

"دانتوں سے پکڑنے کے باوجود پیسہ آرام سے نکلا جا رہا ہے۔ اب ایک ہزار اخبار والے کو دینے ہیں۔" ڈیوڑھی سے صحن تک پہنچتے ہی اماں یوں ہانپنے لگیں جیسے طویل مسافت طے کی ہو۔

"تو کیا اخبار ہمارے گھر نہیں آئے گا اب؟" اس نے مایوسی سے پوچھا۔

"ہاں! میں نے منع کر دیا۔ کہاں سے بل بھریں گے۔ تمہارے ابا کی زندگی میں جوڑی جمع پونجی سوچا تھا تمہارے جہیز اور تعلیم میں کام آئے گی۔ مگر یہ روز کے خرچے ہی پورے نہیں ہو رہے ہیں۔"

اس نے اماں کی بات کا جواب نہ دیا۔ اخبار بینی کا شوق اسے ابا سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ جب زندہ تھے تو اس وقت سے روزانہ ان کے گھر میں اخبار آتا۔

"اماں! ایسے بیٹھے رہنے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جب آمدن کا دروازہ بند ہو۔" وہ اماں کے سرمئی بالوں میں انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ اوپر ایک پورشن بنوا کر کرائے پر چڑھا دیں۔ ایک لگا بندھا کرایہ ملے گا تو گھر کا خرچ بآسانی نکل آئے گا۔ ورنہ تو یہ چند ہزار جو بچے ہیں۔ وہ بھی کھانے پینے میں نکل جائیں گے۔" وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔ مہرماہ کی بات ان کے دل کو لگی تھی۔ مگر ان کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے جو اوپر کام شروع کروا سکیں۔ چھت کی مرمت کی تو گنجائش نکل نہیں رہی۔"

"اماں! جو بھی جمع جتھا ہے' اسی سے اوپر کمرے بنوا لیں۔ بعد میں جب کرایہ آئے گا تو دوبارہ جمع ہو جائیں گے پیسے۔" مہرماہ کی بات اماں کو معقول لگی۔ اللہ کا نام لے کر کام شروع کرا دیا۔ قابل اعتماد پڑوسی

بھائی صدیق سے کام کی نگرانی کی درخواست کی' وہ مقدور بھر ہاتھ بٹانے کو تیار ہو گئے۔ یوں چند مزدوروں نے ان کے حسب منشا اوپر والی منزل تیار کر دی۔ ایک کمرہ ملحقہ باتھ روم' کچن اور آگے برآمدہ۔ کرایہ دار ڈھونڈنے کا کام بھی انہوں نے صدیق بھائی کے ذمے لگایا' مگر اس شرط کے ساتھ کہ پوری فیملی قابل قبول ہو گی۔ صرف چھڑے چھانٹ بندے کو منظور نہ کیا جائے گا۔



اس نے پلگ کئی بار نکال کر جوڑا' مگر ٹی وی کی اسکرین تاریک ہی رہی۔ وہ جھنجلا کر باہر نکل آئی۔

"اماں! ساتھ والی خالہ زرینہ سے پوچھیں ان کا کیبل آرہا ہے یا نہیں' ہمارا تو تین دن سے بند ہے۔" اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اماں کو پکارا۔

"ہمارا کیبل کٹ گیا ہے۔ چار مہینوں سے بل جو جمع نہیں کروایا۔" دال چنتے ہوئے اماں نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"تو بل کیوں نہیں جمع کروایا آپ نے؟ میری ساری فیورٹ رائٹرز کے ڈرامے چل رہے ہیں۔ فائزہ افتخار' عمیرہ احمد۔" وہ روہانسی ہو گئی بولی۔

"کہاں سے جمع کرواؤں۔ تین دن سے گھر میں دال پک رہی ہے۔ سارا پیسہ اوپر لگ گیا۔ اوپر سے لاکھوں کا قرض بھی چڑھ گیا۔" اماں غصے سے بولیں۔ وہ یوں بھی آج کل خاصی چڑی ہوئی تھیں۔ چار ماہ ہو گئے تھے' مگر کسی کرایہ دار نے تاحال شکل نہ دکھائی دی تھی۔ وہ موہوم امید لیے صدیق بھائی سے دریافت کرتیں تو ہر بار ان کا یہی جواب ہوتا۔

"فاطمہ بہن! میں نے کئی ایک لوگوں سے کہا ہوا ہے' مگر ڈھنگ کی کوئی فیملی مل ہی نہیں رہی۔"

وہ یہ سن کر چپ ہو جاتیں۔ کنسٹرکشن کے دوران انہیں صدیق بھائی سے قرض بھی لینا پڑا تھا۔ اس کی ادائیگی کے خیال نے راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔

"اماں! مجھے ایک جاب مل رہی ہے۔ اچھی جاب ہے۔ بہترین تنخواہ۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں گھر سے باہر نکلنے کی۔ زمانہ خراب ہے۔ اکیلی لڑکی کو دیکھ کر بھیڑیے جگہ جگہ گھات لگا بیٹھتے ہیں۔" اماں کا لہجہ اندیشوں سے پر تھا۔

"اماں! آپ کو اپنی بیٹی' اپنی تربیت اور ابا کے خون پر بھروسا ہونا چاہیے۔ میں یوں ترس ترس کر زندگی نہیں گزار سکتی۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولی۔

"مہر ماہ! ناشکری بہت بڑا گناہ ہے۔ ہم سینکڑوں سے اچھا کھا رہے ہیں۔" اماں ٹھہرے ہوئے انداز میں سمجھانے لگیں۔

"کھانا پینا صرف جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ مگر اور بھی تو بہت کچھ ضروری ہوتا ہے زندگی کے لیے۔" وہ بحث کرنے کے سے انداز میں بولی۔

"زندگی کو صرف ضروریات تک محدود رکھو۔ خواہشات کا پیالہ تو بادشاہ کا بھی خالی رہ گیا تھا۔"

"حق ہاہ! خواہشات...... یہاں تو ضروریات پوری کرنے کے لالے پڑے ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"مہر ماہ! قناعت بہت بڑی دولت ہوتی ہے۔" صاف شدہ دال اماں نے ڈبے میں ڈالنا شروع کر دی۔

"جی ضرور' لیکن زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ ساکن ہونے کو موت کہتے ہیں۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

اماں نے ایک نظر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور پھر سر ہلا کر رہ گئیں۔



آفس کا ماحول بے حد اچھا تھا۔ اس کی ساتھی ورکرز بے حد خوش اخلاق اور ملنسار تھیں۔ وہ بھی ان کے

ساتھ گھر گھر کمپنی کی پروڈکٹس متعارف اور بیچنے کا کام کرنے لگی۔

جاب کے تقاضوں میں خوش اخلاقی کے ساتھ ساتھ خوش لباسی اور جدید فیشن کے رجحانات کا اظہار اپنی شخصیت سے کرنا لازمی تھا۔ ساری لڑکیاں ایک سے ایک بے حد ماڈرن اور فیشن ایبل تھیں، مگر ایک وہی تھی، جو اپنا گھریلو حلیہ اپنائے ہوئے تھی۔ لمبے بالوں کی سیدھی چوٹی۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص، بڑا سا دوپٹا جسے وہ سر پہ اوڑھنے کے بعد اچھی طرح ارد گرد لپیٹے رکھتی تھی۔

باس کی پی اے مس رائمہ نے کئی مرتبہ اس کی توجہ اس طرف دلائی تھی کہ وہ اپنی شخصیت میں کچھ تبدیلی لائے۔ اپنی ذات پہ اعتماد ہی سے وہ زیادہ سے زیادہ کسٹمرز کو متوجہ کرسکے گی۔ "یس میم" کی گردان کرنے کے باوجود اس کا میڈم رائمہ کی باتوں پہ عمل کرنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ یہ نسوانیت کی تذلیل کرتا بے حجاب لباس، یہ کمرشل انداز گفتگو۔

اماں تو اس کے گھر گھر پھر کر چیزیں بیچنے کا سن کر ہی خفا ہوگئی تھیں۔

"ایسے پیسے کو آگ لگے جو یوں لور لور پھر کر کمایا جائے۔ دیکھنا! ایک دن تم اپنی ضد کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھاؤ گی۔" وہ کئی دن اس پہ اپنا غصہ انڈیلتی رہیں۔ مگر کچھ دنوں سے وہ اسے بہت خوش اور مطمئن دکھائی دیں۔ سو جہ اسے جلد ہی معلوم ہوگئی۔

صدیق چاچا کے توسط سے ایک کرایہ دار اوپر والے پورشن میں جو آچکا تھا۔

"صرف ایک اور وہ بھی مرد۔ سوچا تھا، کوئی لڑکی ہوگی، جس سے فارغ وقت میں گپ شپ لگاؤں گی۔" مہرماہ کو سخت مایوسی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا اماں! میں چلتی ہوں۔" دروازے پہ اپنے مخصوص چنگ چی رکشے کا ہارن سن کر اس نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ چادر اوڑھ کر اماں کو "اللہ حافظ" کہتی باہر نکل آئی۔ رکشہ تنگ گلی سے نکل کر جوں ہی مین روڈ پہ آیا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اس کے پیچھے آرہا تھا۔ بلیک موٹر سائیکل پہ وجیہہ چہرے پہ سیاہ چشمہ لگائے گھنے سیاہ بال تیز ہوا کی بدولت الجھ کر پیچھے کے رخ پہ سیٹ ہوگئے تھے۔

یہ بندہ اس کے پیچھے پچھلے دو ہفتوں سے لگا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی آفس جانے کے لیے رکشے پہ سوار ہوتی اس کا تعاقب شروع ہوجاتا۔ پھر آفس آتے ہی وہ کہیں غائب ہوجاتا تھا۔

"یا اللہ! یہ مصیبت کہاں سے گلے آپڑی ہے۔ کیسے پیچھا چھڑاؤں۔ نجانے کس مقصد کے لیے میرے پیچھے لگا ہے۔ اماں کو بھی نہیں بتا سکتی۔ پریشان ہوجائیں گی۔ الٹا مجھے گھر بٹھالیں گی۔ اگر اسی طرح پیچھا کرنا جاری رکھا تو سر سے کہہ دوں گی۔ سیکیورٹی کے ذمے ہے۔"

فکر مندی سے سوچتے ہوئے وہ ایک نتیجے پہ پہنچ کر مطمئن ہوگئی۔ اس کا آفس آچکا تھا۔ وہ ہینڈسم سا موٹر سائیکل سوار بھی کہیں غائب ہوچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی تنخواہ کے دس ہزار اور کرائے کے سات ہزار ملتے۔ اماں بے حد مطمئن سی صدیق بھائی کو ان کے قرض کی پہلی قسط ادا کر آئیں۔

اوائل نومبر کی شام خنکی لیے ہوئے تھی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر کچن میں آگئی۔ سوجی کا حلوہ اچھی طرح بھوننے کے بعد اماں نے پستہ بادام کی ہوائیاں اوپر چھڑک کے ڈھکن بند کردیا۔ وہ چولہے کے پاس ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھ گئی۔ ہلکی ہلکی حرارت سکون دینے لگی تھی۔

"بڑا شریف بچہ ہے۔ بہت محنتی اور ایمان دار۔" نیلی آگ کے شعلوں کو دیکھتے ہوئے غیر دلچسپی سے اس نے اماں کی بات سنی۔ وہ اکثر اس کے سامنے کرائے دار کے قصیدے پڑھتی رہتی تھیں۔

"میں نے کہا تھا کہ رات کا کھانا میں اوپر پہنچا دوں گی مگر انکار کردیا۔ رات کا ہوٹل سے اور ناشتا خود تیار کرلیتا ہے۔ دوپہر شاید دفتر میں بسر ہوتی ہوگی۔"

"آپ خواہ مخواہ ہلکان نہ ہوں۔ اسے واقعی کسی کا احسان لینا اچھا نہ لگتا ہوگا۔" گرم گرم حلوہ حلق سے اتارتے ہوئے اس نے کہا۔

"حلوہ زیادہ بن گیا ہے۔ دل چاہ رہا ہے، اوپر دے آؤں۔ مگر شاید نہ کھائے، کیونکہ اس دن کھیر کی پلیٹ دی تھی، جب صبح برتن اٹھانے گئی تو کھیر یوں ہی پڑی تھی۔" اماں متذبذب تھیں۔

اگر اتنا ہی نخریلا ہے تو جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے غصہ آگیا۔

"ہونہہ! اکڑو اور مغرور لوگوں کو تو منہ بھی نہیں لگانا چاہیے۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"ارے! توبہ کرو۔ مغرور کہاں۔ اتنا شریف اور بھلا بچہ ہے۔ انکساری تو ختم ہے۔ بس مجھے تکلیف نہ دینے کے خیال سے منع کرتا ہوگا۔" اماں تو اس کے خلاف کچھ سننے پر تیار نہ تھیں۔ فوراً حلوے سے پلیٹ بھری اور باہر نکل گئیں۔ مہرماہ بس ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اماں محلے میں کسی کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ آج سنڈے تھا۔ بیرونی دروازے کی کنڈی لگا کر وہ نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی۔ کاسنی کاٹن کا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ قمیص پہنے، سر پہ تولیہ لپیٹے وہ سردی سے کپکپاتی دھوپ میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ نرم گرم دھوپ اعصاب کو سکون دینے لگی۔ تولیہ سر سے اتار کر چارپائی پہ ڈالا اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آرام دہ انداز میں آنکھیں موند لیں۔

"ایکسکیوزمی! خالہ فاطمہ کہاں ہیں۔" ایک بلند مردانہ گمبھیر آواز عین اپنے سر کے اوپر سن کر اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ نظر جوں ہی سامنے کھڑی ہستی پہ پڑی تو وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ مارے دہشت کے گلابی رنگت سفید پڑگئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ سامنے کھڑے وجود کو تکنے لگی۔ یہ اس کا واہمہ ہے یا حقیقت؟ وہی نقشہ، وہی لمبا قد، گندمی رنگت، کھڑی ناک، چوڑی پیشانی، گھنی مونچھوں تلے بھرے بھرے لب۔ ہاں! بس معمول کی پینٹ شرٹ کے بجائے سادہ کھدر کے سرمئی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ پیروں میں لیدر کے چپل تھے۔

"محترمہ! میں نے خالہ فاطمہ کے بارے میں پوچھا ہے۔" اب کے وہ ذرا جھنجلا کر بولا۔ سامنے کھڑی بے حد خوب صورت اور کامنی سی لڑکی جس کے لمبے ریشمی نم بالوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ کرسٹل گرے آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں جن میں خوف و ہراس واضح نظر آرہا تھا۔ وہ اسے اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"آپ! آپ یہاں کیسے، نکلیے یہاں سے۔" ہنہ گلابی چہرہ جس پہ کچھ دیر پہلے حیرت و دہشت چھائی تھی۔ اب وہاں صرف غصہ ہی غصہ تھا۔

"آپ کی جرات کیسے ہوئی دن دیہاڑے کسی کے گھر میں گھسنے کی؟ میں ابھی پولیس کو کال کرتی ہوں۔ یعنی روزانہ پیچھا کرتے کرتے اتنی ہمت بھی کرلی کہ گھر میں گھس آئے؟"

"اسٹاپ اٹ محترمہ! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" سبکتگین حیدر کو واضح محسوس ہوا کہ مقابل کھڑی دوشیزہ کسی زبردست قسم کی غلط فہمی کا شکار ہے۔ تب ہی تو اس کے بارے میں فضول گوئی کررہی ہے۔

اس کا لہجہ اتنا دبنگ اور چہرے کے نقوش پہ ابھرتی برہمی اتنی واضح تھی کہ مہرماہ کا دل کانپ اٹھا۔ جو پورے دو مہینے لگاتار اس کا پیچھا کرسکتا ہے، دیوار پھاند کر گھر میں آسکتا ہے تو یقیناً وہ آگے اس کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی سردی میں اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ ڈرتے ڈرتے دو قدم پیچھے ہٹی۔ معاً اسے احساس ہوا کہ وہ اتنے خطرناک بندے کے سامنے ننگے سر کھڑی ہے۔ فوراً شانوں پہ پڑا دوپٹا سر پہ ڈالا۔ وہ گھر میں تن تنہا ہے، اماں نجانے کب لوٹیں۔ عدم تحفظ کے شدید احساس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی تھی۔ اب جو کرنا تھا، خود ہی کو کرنا تھا۔

"دیکھو! اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اکیلا جان کر تم میرے ساتھ کچھ ایسا ویسا کرلوگے تو یہ تمہاری بھول ہے۔" وہ انگلی اٹھا کے خبردار کرنے والے انداز میں بولی۔ انگلی میں لرزش صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"شٹ اپ۔" وہ دھاڑا۔ اب اس سے مزید کچھ سننا سبکتگین کی برداشت سے باہر تھا۔ اسے لگا اس کا سامنا کسی پاگل لڑکی سے پڑا ہے۔ ہاتھ میں پکڑی دواؤں کی تھیلی چارپائی پہ رکھ دی۔

"خالہ فاطمہ نے کچھ میڈیسنز منگوائی تھیں۔ انہیں دے دیجیے گا۔"

اپنے مخصوص بارعب لہجے میں کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا فوراً سیڑھیاں چڑھ گیا۔

اس کے تعاقب میں جاتی مہرماہ کی نظریں چھت کی ریلنگ پہ ٹک گئیں۔ اس کا منہ اور آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"یہ اماں نے کس عذاب کو گھر میں گھسا لیا۔۔۔ اور اسے دیکھو ڈھیٹ، بدتمیز۔۔۔ مکان مالکن کا تعاقب کرتے ذرا بھی شرم نہ آئی اور ہماری اماں پہ تو بھول پن ختم ہے۔ شریف، نیک بچہ، ہونہہ! آئیں تو سہی۔ اس سڑک چھاپ کا بوریا بستر نہ بند ہوایا تو میرا نام مہرماہ عنادل نہیں۔" غصے سے کھولتے ہوئے وہ صحن میں چکراتے ہوئے بے تابی سے اماں کا انتظار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

دانت پہ دانت جمائے، رکشے کے ڈنڈے کو ایک ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑے، وہ اس ڈھیٹ ابن ڈھیٹ کو دیکھتی رہی، جو بے شرمی اور ڈھٹائی کے سارے ریکارڈ توڑے آج بھی اپنی بائیک پہ اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس کا دل چاہا فوراً رکشے سے اتر کر کھری کھری سنائے کہ موصوف کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں۔ اماں سے رات بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اول تو مشکل سے اس کی بات کا اعتبار کرتیں۔ کیونکہ اس کی بھولی بھالی ماں اس سے ازحد متاثر ہو چکی تھیں۔ ان کے ساتھ مسئلہ تھا۔ جو ایک بار ان کے دل پر چڑھ جاتا، مشکل ہی سے اترتا تھا۔ ایسے میں اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

"بھیا! ذرا میری بات سنیے۔" اس نے کچھ سوچ کر ڈرائیور کو پکارا۔

"جی باجی! کیا حکم ہے۔" ڈرائیور نے ذرا گردن موڑ کر پوچھا۔

"اس نیلی شرٹ والے آدمی کا پیچھا کرو۔ جہاں یہ رکے، وہاں رکشہ روک دینا ہے۔" مہرماہ کی بات سن ڈرائیور ذرا سا حیران ہوا۔

"کافی شریف لڑکی ہے۔ دو ماہ سے پک اینڈ ڈراپ کررہا ہوں۔ ایک مرد کا تعاقب۔۔۔؟ خیر! مجھے کیا۔" ڈرائیور نے کندھے اچکاتے ہوئے رفتار ذرا سست کردی۔ بائیک اپنی مخصوص متوازن رفتار سے آگے نکل گئی۔

پندرہ منٹ بعد رکشا اس کے آفس کے سامنے آکر رک گیا۔ وہ کچھ حیران ہوتی نیچے اتر آئی۔

"باجی جی! وہ آدمی آپ والے ہی دفتر جارہا ہے۔" ڈرائیور کی نشان دہی پہ اس نے دیکھا کہ وہ واقعی اپنی بائیک سے چابی نکالتا بلڈنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گلاسز اس نے گلے کے نیچے والے بٹن میں اٹکا لیے۔ وہ کچھ الجھتی سی گارڈ کے پاس چلی آئی۔

"ابھی جو صاحب اندر گئے ہیں، نیلی شرٹ والے آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"جی بالکل! سبکتگین صاحب ہیں۔ اسی کمپنی میں

فوڈ کوالٹی انسپکٹر ہیں۔ پچھلے ایک سال سے کام کررہے ہیں۔" گارڈ نے مؤدب ہو کر بتایا۔

"او میرے خدایا! میں کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار تھی۔" وہ اپنے ماتھے پہ ہاتھ مار کر رہ گئی۔

"وہ بے چارہ اپنے کام پہ جاتا تھا اور میں سمجھی میرا پیچھا کررہا ہے۔" وہ اپنے کیبن میں بیٹھی کتنی دیر تک اپنی عقل پر ماتم کرتی رہی۔

"ہیلو گرلز! گڈ مارننگ۔" اسی لمحے میڈم رائمہ کزریں ہنستی مسکراتی خوشبوئیں بکھیرتیں وہ آج بھی اپنے معمول کے حلیے میں تھیں۔ سلیولیس تنگ شرٹ جس کا گلا آگے پیچھے سے بے حد گہرا تھا۔ تنگ ٹراؤزر، دوپٹا ندارد، بے حد تیز میک اپ اور مناسب جیولری کے ساتھ وہ آفس میں کیا عورتیں کیا مرد ہر ایک کی نظروں کا مرکز ہوتیں۔

مہرماہ حیران تھی کہ شادی شدہ، دو بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی انہوں نے کس کمال سے خود کو مینٹین کررکھا تھا۔ کھانے کے وقفے کے دوران وہ انیلا کے کیبن کی طرف آگئی۔ وہ کمپنی کے ہفت روزہ رسالے کی تازہ اشاعت کی ورق گردانی کررہی تھی۔ وہ بھی اشتیاق سے جھک کر دیکھنے لگی۔ ٹائٹل پہ نظر پڑتے ہی وہ سُن رہ گئی۔

"یہ۔ یہ تو؟" وہ بے یقینی سے انیلا کو دیکھنے لگی۔

"ہاں! یہ میڈم رائمہ ہی ہیں۔ باس کی پی اے۔ کمپنی کے رسالے کی ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ماڈلنگ بھی کرتی ہیں۔" انیلا سادگی سے بتانے لگی۔

میڈم رائمہ نیم عریاں لباس میں کمپنی کی کسی پروڈکٹ کی ماڈلنگ کرتی نظر آئیں۔ تصویر اتنی مخرب اخلاق تھی کہ اس نے دوسری نظر ڈالنے سے گریز ہی کیا۔

"اخلاق کی بہت اچھی ہیں۔ ہر ایک سے ہنس کر ملتی ہیں۔" وہ ٹیبل کے کنارے پر ٹکتے ہوئے بولی۔

"ہاں! ہنسنا بولنا تو سب کے ساتھ ہے۔ خصوصاً میل ورکرز کے ساتھ تو زیادہ ہی ہنستی بولتی ہیں۔ آج کل تو سبکتگین حیدر پہ خاصی مہربان دکھائی دے رہی ہیں۔" انیلا کسی قدر ناگواری سے بولی۔

"کون سبکتگین حیدر؟" اس نے چونک کر دیکھا۔

"یہی اپنے فوڈ انسپکٹر۔ بہت اسٹرونگ کیریکٹر کے مالک ہیں۔ کسی فی میل کو تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ میڈم رائمہ کو کتنی بار سارے اسٹاف کے سامنے جھڑک چکے ہیں۔ مگر سلام ان کی مستقل مزاجی کو۔ ذرا جوان کی ڈانٹ ڈپٹ کو مائنڈ کرتے ہوئے سابقہ روش ترک کی ہو۔" انیلا مسکراتے ہوئے بولی۔

"مس! آپ دونوں کو میڈم رائمہ کانفرنس ہال میں بلا رہی ہیں۔"

اسی دم پیون نے انہیں آکر پیغام سنایا۔ کانفرنس روم میں ساری فی میل ورکرز نہیں تھیں۔ صرف چند لڑکیاں تھیں۔

"گرلز! کل سے آپ بی بلاک ایریا وزٹ کریں گی۔ صرف آپ کو نامی نیٹ کیا گیا ہے۔ فریش اور ینگ گرلز ہی زیادہ سے زیادہ کنزیومرز کو موٹی ویٹ کرسکتی ہیں۔ آئی ہوپ آپ سب اس وزٹ کی ڈیمانڈ پہ پورا اتریں گی۔" رائمہ نے مسکراتے ہوئے میٹنگ برخاست کی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! آج باہر واک پہ چلیں۔" رات کے کھانے کے بعد اس نے اماں سے فرمائش کی۔

"نہیں بیٹا! میں اتنا چل نہیں سکتی۔ اوپر سے ٹریفک کا رش۔ میری طبیعت گھبرا جاتی ہے۔" انہوں نے عذر پیش کیا۔

"ارے اماں! ہم زیادہ دور تھوڑی جائیں گے۔ بس سڑک تک ہو کر پندرہ منٹ میں لوٹ آتے ہیں۔" وہ زبردستی انہیں اپنے ساتھ گھسیٹ لائی۔ کالونی کا ایک

چکر لگا کر وہ واپس ہولیں۔ اماں اس سے چند قدم آگے چل رہی تھیں۔ اپنے گھر کے سامنے والے احاطے میں اسے سبکتگین کی موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ اس بائیک اور اس کے سوار نے اسے دو ماہ ذہنی کوفت میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ جانے کیا سوچ کر اس نے ایک ٹانگ کا پورا زور لگا کر بائیک گرادی۔

"کتنا مزا آئے گا جب وہ صبح اپنی بائیک کو گرا دیکھے گا۔ اگر کوئی پرزہ ورزہ ٹوٹ جائے تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔" وہ سوچ کر ہی لطف اندوز ہوئی۔ مگر جوں ہی بائیک دوسری طرف گری' ایک بلند مردانہ درد بھری آواز اندھیرے میں ابھری۔

"یہ کیا کیا اسٹوپڈ نظر نہیں آرہا تھا کہ میں ادھر بیٹھا ہوں؟" مہر ماہ کے تو ہوش اڑ گئے۔ فوراً "اسپیڈ پکڑ کر اماں سے جا ملی۔ وہ گیٹ کا لاک کھول رہی تھیں۔ اپنے پیچھے مردانہ آواز سن کر چونک کر پیچھے پلٹیں۔

"مہر ماہ! ابھی یہاں ایک آدمی کی آواز آئی ہے۔" انہوں نے اندھیرے میں کسی ذی روح کو تلاشنا چاہا۔

"ارے! یہ کس کی موٹر سائیکل گری پڑی ہے۔ مجھے تو بچے کی لگتی ہے۔" وہ فکر مندی سے بولتی آگے بڑھیں۔

"ارے اماں! جس کی بھی ہو۔ ہمیں کیا' چلیں! گھر چلتے ہیں۔" اس نے گھبرا کر انہیں روکنا چاہا۔

"ارے بیٹا! یہ آپ ہو۔ موٹر سائیکل کس نے گرائی ہے؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔ ساتھ ہی بائیک کے نیچے دبی ٹانگ نکالنے میں اس کی مدد کرنے لگیں۔

"بس خالہ جان! نیچے بیٹھا فیول ٹنکی کی مرمت کررہا تھا۔ کسی نے پرانی دشمنی نکال کر۔۔۔" وہ کراہ کر بولا۔ تھوڑی سی تگ ودو سے ٹانگ نکل تو آئی مگر چوٹ اتنی زیادہ لگی تھی کہ درد کے مارے ٹانگ سن ہوئی جارہی تھی۔ جسم سے پسینہ چھوٹ گیا۔

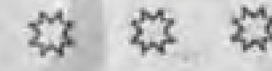
"آؤ ہم تمہیں اوپر چھوڑ آئیں۔" اماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے چل رہا تھا۔ مہر ماہ کو اس کی حالت پہ افسوس ہوا۔ وہ تو محض اس کی بائیک گرا کے اسے ستانا چاہتی تھی۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ ہلکی سی شرارت کا اتنا سنگین نتیجہ نکلے گا۔

زینہ کافی تنگ تھا۔ اماں آگے چل رہی تھیں۔ اس نے کچھ سوچ کر معذرت کے لیے اسے مخاطب کیا۔

"سنیے!" خشک ہوتے حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ سبکتگین نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ دو سیڑھیاں پیچھے کھڑی تھی۔

"سمجھ لوں گا میں آپ کو۔" کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتا وہ زینہ طے کرنے لگا۔

"بھاڑ میں جاؤ۔ میری بلا سے۔" اس کی پشت پہ ایک کھولتی نظر ڈال کر وہ گھر چلی آئی۔



یہ پوش ایریا تھا۔ خوب صورت' جدید طرز تعمیر کے شاہکار نمونے' بلند و بالا دو' سہ منزلہ کوٹھیاں۔ مہر ماہ سر اٹھا کر حیرانی سے انہیں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

"رائمہ میم نے مجھے کس جگہ بھیج دیا ہے۔ اتنے بڑے محلوں میں رہنے والی بیگمات بھلا کہاں روز مرہ استعمال کی اشیا اس طرح خریدتی ہوں گی۔ ان کی ملازمائیں جو یہ کام کرلیتی ہیں۔ خیر! مجھے کیا۔" کندھے اچکاتے ہوئے اس نے پھولوں سے ڈھکے گھر کی بیل بجادی۔

چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ ملازمہ کی معیت میں بیش قیمت سامان آرائش و تعیشات سے سجے وسیع ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

"پلیز! بیگم صاحبہ کو بھیج دیں۔" نرم و گداز صوفے پہ ٹکتے ہوئے وہ ملازمہ سے بولی تو وہ اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

بیگم صاحبہ تو کیا گھر کا کوئی فرد تاحال ظاہر نہ ہوا تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی۔ دیواروں پہ قیمتی و نایاب پینٹنگز کے شہ پارے لگے ہوئے تھے۔

ڈرائنگ روم کی سیڑھیاں اترتے برہان لاشاری کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ نظریں سامنے بیٹھے وجود پہ جم گئیں۔ معصوم چہرہ' جس پہ نوعمری کا رنگ غالب تھا۔ سفید بے داغ اجلی رنگت' گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند نازک ہونٹ' قدرت کی صناعی کا شاہکار اس سے چند قدم پہ موجود تھا۔ وہ یک ٹک اسے تکتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ ایک اجنبی مرد کو سامنے پا کے بری طرح گھبرا اٹھی۔

"السلام علیکم! وہ بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟" وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ سامنے کھڑے بندے کی نظریں اسے اپنے بدن میں تیروں کی طرح جا بجا کھبتی محسوس ہورہی تھیں۔

"آرہی ہیں۔ آپ بیٹھیے نا۔" حریص نظریں اس کے چہرے کا طواف کررہی تھیں۔ سامنے کھڑی گلابی گڑیا اس کے لیے ایک امتحان بنی کھڑی تھی۔ مزید برداشت کا یارا نہ رہا تھا۔

"مم۔۔۔ میں چلتی ہوں۔" اس سوٹڈ بوٹڈ مرد کے ارادے اسے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ اس کا تیزی سے دھڑکتا دل کسی انہونی کا سگنل دے رہا تھا۔

"ارے جی! چلی جائیے گا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہمیں خدمت کا موقع تو دیجیے۔ اس دولت کدے کی سیر بھی آپ کو کراتے ہیں۔" برہان لاشاری فدویانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"کم آن بے بی۔" مخمور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اسے تھامنے کے لیے آگے قدم بڑھایا۔ نظریں ماہ مہر پہ ٹکی ہونے کی وجہ سے وہ سامنے رکھے گلاس ٹیبل نہ دیکھ سکا۔ اس سے ٹکرا کر وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا اور مہر ماہ نے یہ ذرا سی مہلت ملنے پر سرپٹ دوڑ لگانے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ لگائی۔ اگلے دن آفس میں اس نے میم رائمہ کو صاف جواب دے دیا کہ وہ دوبارہ اس سائیڈ پہ کبھی نہیں جائے گی۔ اسے صرف متوسط طبقے کی آبادی تک ہی محدود رکھا جائے۔

"او کے میری جان! جیسے تم چاہو۔" رائمہ نے پیار سے اس کا گال چھوا۔ پھر جھک کر رازداری سے پوچھنے لگی۔

"ویسے تمہیں علم ہے' یہ سبکتگین حیدر بھی کسی مڈل کلاس ایریے میں رہتا ہے۔ شہر کے کس سائیڈ پہ ہے؟ سنا ہے اس کی طبیعت خراب ہے۔ اس لیے آفس سے چھٹی لی ہوئی ہے۔ میں اس کی عیادت کو جانا چاہتی ہوں۔"

"نو میم! مجھے تو ان کی رہائش کا علم نہیں ہے۔" اس نے صفائی سے جھوٹ بول دیا۔ اگر ٹھیک ایڈریس بتا دیتی تو یہ کل ان کے گھر پہنچ چکی ہوتی اور اماں رائمہ کا حلیہ دیکھ کر اس کی ملازمت کے خلاف ہو جاتیں۔

"اچھا! میں کسی اور ورکر سے پتا کرتی ہوں۔" رائمہ مایوس ہوئی تھی۔

مہر ماہ کے لیے اب رائمہ کی سبکتگین کی ذات میں دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہی تھی۔ رائمہ جتنا والہانہ انداز اپناتی' وہ اتنا ہی کٹھور بنتا تھا۔

"رائمہ! ذرا میرے آفس میں آئیے۔ کچھ آفیشلی میٹرز ڈسکس کرنے ہیں آپ سے۔" اسی لمحے باس وہاں سے گزرے اور رائمہ کو مخاطب کیا۔

"یس سر!" رائمہ مستعدی سے ان کے پیچھے چل دی۔

"لو جی! اب یہ میٹنگ چار گھنٹے چلے گی۔" نیلا ہنس کر بولی۔ سارے ورکرز نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سرگوشیاں کرنا شروع کردیں۔

"کمال ہے' میم رائمہ شادی شدہ' دو بچوں کی ماں۔ باس سے بھی اتنے قریبی اور گہرے تعلقات۔ اوپر سے سبکتگین حیدر سے محبت کا جادو بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔" وہ کتنی ہی دیر اس تلون پہ غور کرتی رہی پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔



"مہو! میں رات یخنی اور گاجر کا حلوہ اوپر لے گئی

تھی۔"

"اور موصوف نے کھانے سے انکار کیا ہوگا۔۔۔ ہے نا؟" وہ استہزائیہ پوچھنے لگی۔

"بس! برا ہی سوچنا۔ انکار کیوں کرتا' اسی وقت کھانا شروع کردیا۔ میں برتن بھول آئی۔ تم جاؤ برتن لے آؤ۔" حکم جاری ہوا۔

اماں اپنی پرانی جرسی کو ادھیڑ کر اون کے گولے بنانے میں مصروف تھیں۔ ناچار اسے ہی اوپر جانا پڑا۔

وہ بیڈ پہ نیم دراز میگزین کا مطالعہ کررہا تھا۔ شیو خاصی بڑھی ہوئی تھی۔ الجھے حلیے میں بھی اس کی شخصیت متاثر کن نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھ کے چونک پڑا۔

"وہ۔۔۔ میں برتن لینے آئی تھی۔" اٹک اٹک کر اس نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

"یہ رکھے ہیں۔۔۔ لے لیں۔" اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ برتن اٹھا کر خاموشی سے پلٹنے لگی کہ پشت پہ اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

"مس مہواہ عنادل! میری بات سنیے ذرا۔" وہ حیران ہوکر پلٹی۔ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ لب خاموش ہی رہے۔

"آفس میں آپ کے خلاف سازش کی جارہی ہے۔ آپ یقیناً "لاعلم" ہوں گی۔ اس سازش میں باس اور ان کی پی اے صاحبہ بھی شامل ہیں۔ بی کیئر فل۔" اس کے پرفسوں سراپے کو اپنی نظروں کے حصار میں لیے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ مہواہ کی پیشانی شکنوں سے اٹی چلی گئی۔

"بہت شکریہ آپ کی نوازش کا۔ ویسے میرے بارے میں آپ کو اتنا ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالغ اور باشعور لڑکی ہوں۔ اچھے برے لوگوں کی پہچان مجھے اچھی طرح ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ چبا چبا کر بولی۔

"اوکے ایز یو وش۔ آپ کو انفارم کرنا میرا فرض تھا۔ آفٹر آل "آپ میری مکان مالکن ہیں۔ آگے آپ کی مرضی۔" کندھے اچکا کر کہتے ہوئے وہ دوبارہ میگزین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ جلتی بھنتی نیچے آگئی۔

"ہونہہ۔۔۔ بڑا آیا میرا خیر خواہ۔" وہ کتنی ہی دیر آپ ہی آپ بڑبڑاتی رہی۔



اس کی خواہش پہ میڈم رائمہ نے اسے آج متوسط درجے کے علاقے کی طرف بھیجا تھا۔

"معمولی نوکریاں اور اتنے شان دار گھر۔۔۔ کمال ہے۔" وہ حیران ہوتے ہوئے سامنے گھر کو دیکھنے لگی۔ دو منزلہ سفید ماربل کا گھر' سبز بیلوں اور مختلف رنگ کے پھولوں سے سجا ہوا۔ میڈم رائمہ کے مطابق یہاں کے رہائشی مرد حضرات چھوٹا موٹا بزنس اور بیس پچیس ہزار کی نوکریاں کرتے ہیں۔ لیکن یہ گھر تو ان کی باتوں کی نفی کررہا تھا۔ ڈرائیو وے کے دو طرف کورین لش گرین گھاس کے قطعے' انواع و اقسام کے پھول' پودے' اندرونی حصے سے بھی امارت کا اظہار ہورہا تھا۔

وہ آئیں ہمارے گھر' خدا کی قدرت۔ کبھی ہم ان کو اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ایک شوخ مردانہ آواز پہ وہ تیزی سے گھوم کے پلٹی۔

سامنے برہان لاشاری کھڑا تھا۔ چہرہ پہ تمام تر خباثت لیے۔ غلاظت سے لتھڑی آنکھیں مہواہ کے پورے وجود کا جائزہ لے رہی تھیں۔

مہواہ پہ تو ساتوں آسمان ٹوٹ پڑے۔ وہ اس دن تائید ایزدی سے برہان لاشاری کے چنگل سے بچنے کے بعد دعا کررہی تھی کہ یا اللہ اس شیطان کا دوبارہ منہ نہ دکھانا۔" مگر اگلے ہی مہینے وہ اس کے گھر میں اس کے سامنے موجود تھی۔

"تم؟" نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ حقارت سے بولی۔

"جی! ہم۔۔۔ آپ کے قدردان آپ کے چاہنے والے۔"

مہواہ دروازے کی طرف لپکی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتی پیچھے سے برہان نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"کہاں جاتی ہو میری جان! تمہاری جگہ تو میرے دل میں ہے۔"

"دور ہٹو کمینے مجھ سے۔ خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔"

خود کو اس شیطان کے چنگل سے چھڑانے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اس کوشش میں چادر اس کے سر سے اتر چکی تھی۔ سر کے بال بکھر کر الجھ گئے تھے۔ آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔

"یا اللہ! میری ناموس کی حفاظت فرما۔" دل ہی دل میں اللہ کے حضور گڑگڑاتے ہوئے وہ اپنی عفت و عصمت کے بچاؤ کے لیے بھی کوشش کررہی تھی۔ برہان لغاری کا اس کے گرد حلقہ تنگ ہوتا جارہا تھا۔ اچانک اس کی کمر لکڑی کے ایک ریک سے جالگی۔ جس پر مختلف دھاتوں کی آرائشی اشیا سجی تھیں۔ پیچھے ہاتھ گھمانے سے ایک پیتل کا گلدان اس کے ہاتھ آلگا۔ وہی وزنی گلدان اس نے پوری طاقت سے برہان لاشاری کے سر پر دے مارنے میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہیں کی۔

برہان درد سے ڈکراتا ہوا پیچھے گر گیا۔ اس کے ماتھے پہ خون کا فوارہ پھوٹتے وہ دیکھ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر سنبھلتا اور اس پہ جھپٹتا' مہواہ دروازہ کھول کر اندھا دھند بھاگتے ہوئے طویل ڈرائیو وے عبور کرکے گیٹ سے نکل چکی تھی۔ اس کا بیگ وہیں رہ گیا تھا۔



اگلے دن آفس کا ماحول معمول کے مطابق تھا۔ صرف اس کی حالت خراب تھی۔ کل برہان لاشاری کے بنگلے سے نکلنے کے بعد وہ واپس آنے کے بجائے گھر چلی گئی تھی۔ اماں اسے یوں پسینے میں شرابور' حواس باختہ دیکھ کر پریشان ہوگئی تھیں۔ مگر مناسب بہانے سے اس نے انہیں مطمئن کردیا تھا۔ مگر خود کو ایک پل سکون نہ آیا تھا۔

"اگر جو سیٹھ برہان اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہوجاتا' میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتی۔" یہ سوچ کر ہی وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اس کی ذہنی حالت ابتر ہوچکی تھی۔ دماغ تو جیسے ماؤف ہوچکا تھا۔ اپنے کیبن میں خالی الذہنی کی حالت میں بیٹھی ہی تھی کہ اسے باس کا بلاوا آگیا۔ مرمرے قدموں سے وہ دستک دے کے اندر آئی۔

باس شعیب مرزا غصے سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ میڈم رائمہ بھی صوفے پہ بیٹھی کڑی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مس مہواہ عنادل! پروڈکٹ گرل کا کام پروڈکٹس کی سیل ہوتا ہے۔۔۔ ناکہ اپنے کنزیومرز کی جان لینا۔" باس درشتی سے اس سے پوچھ رہے تھے۔ باس کا یہ غضب ناک رویہ اس کی فوراً" سمجھ میں نہ آیا۔ وہ منہ کھولے حیرانی سے انہیں گرجتے برستے دیکھتی رہی۔

"آئی ایم سوری! بٹ آپ کس لیے مجھے بلیم کررہے ہیں۔"

"ڈونٹ ٹیل می انوسنٹ تو نہیں آپ کہ سمجھ نہ سکیں۔ کل آپ نے سیٹھ برہان لاشاری پہ قاتلانہ حملہ کرکے نہ صرف خود کو مصیبت میں ڈالا ہے' بلکہ ہماری کمپنی کی ساکھ کو بھی زبردست دھچکا پہنچایا ہے۔" باس غصے سے پھٹ پڑے۔

مہواہ کے پیروں سے تو جیسے زمین نکل گئی۔ اس پہلو پہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ برہان لاشاری کے ماتھے پہ بہتا خون تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی تھی۔

"مگر سر! انہوں نے میرے ساتھ بدتمیزی کرنا شروع کردی تھی۔ میری عزت پر حملہ کیا تھا انہوں نے۔ کیا اپنا دفاع کرنے کا مجھے حق نہ تھا؟" وہ الٹا ان سے پوچھنے لگی۔

"شیم آن یو مہواہ! بجائے اپنی حرکت پر شرمندہ ہونے کے ایک شریف اور معزز سٹیزن پہ الزام لگا رہی ہو۔" رائمہ اس کے سامنے آکر غصے سے بولی۔ مہواہ کا

دل چاہا اس سامنے کھڑی خوب صورت بلا کا منہ نوچ لے۔

"انہوں نے تم پہ اقدام قتل ـــــ کر دیا ہے۔ اب تم جو چاہو اسٹینڈ لے سکتی ہو۔" رائمہ کی اگلی بات نے تو اس کے حواس ہی گم کر دیے۔ وہ ہراساں سی ٹکر ٹکر کبھی رائمہ تو کبھی باس کی شکل دیکھنے لگی۔

"میں آج سے ریزائن کرتی ہوں۔ بھاڑ میں جائے یہ نوکری اور سیٹھ برہان۔" وہ تیزی سے گھومتے سر کو ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے تحمل سے بولی۔

"آں ہاں پریٹی گرل! ہماری کمپنی کا ایک رول ہے جو بھی ورکر ریزائن کرے گا اسے پندرہ دن پہلے مجھے انفارم کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے اصولاً" تمہیں ابھی مزید پندرہ دن کام کرنا ہے۔ تمہارے اوریجنل ڈاکومنٹس جو ہمارے پاس ہیں۔" رائمہ معنی خیزی سے مسکرائی۔

مہماہ یک دم ٹھنڈی پڑ گئی۔ مردہ قدموں سے چلتی ہوئی بمشکل اپنے کیبن تک پہنچی۔

اب اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ بچا تھا کہ اماں کو ساری بات بتادی جائے۔

"میں کہتی تھی نا تمہاری یہ نوکری ایک دن ضرور کوئی نقصان پہنچائے گی۔ لگ گیا نا بدنامی کا داغ۔ ہائے! اب کیا ہوگا مہو۔ ہم اکیلی عورتیں۔"

اماں کی دہائیاں جاری تھیں۔ ان کا رد عمل توقع کے عین مطابق تھا۔ سو وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔ کچھ غلط بھی تو نہ کہہ رہی تھیں۔

"بس! کل سے تم باہر قدم نہ نکالو گی۔ لعنت ایسی نوکری پر جس میں عزت گروی رکھنی پڑے۔"

"لیکن اماں مجھے دو ہفتے لازمی جانا ہے۔ میرے اصل کاغذات ان کے پاس پھنسے ہوئے ہیں۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"آگ لگے ان کاغذوں کو۔ خبردار جو قدم باہر نکالا تو۔" اماں غصے سے چلائیں۔

"میں حیدر بچے سے بات کرتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کل کو پولیس ہمارے دروازے پہ آ کھڑی ہو۔" وہ کچھ سوچ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھیں تو وہ فوراً ان کے سامنے آگئی۔

"اماں! ابھی اتنا اندھیر بھی نہیں مچا۔ آپ فی الحال اس سے کچھ نہ کہیں۔ اگر باس لوگ کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو پھر ہم کوئی ایکشن اٹھا سکتے ہیں۔ ورنہ یہ از مرگ واویلا تو فضول ہے۔" وہ ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر لجاجت سے بولی۔

اماں کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر لمبی سانس کھینچتے ہوئے اندر کمرے میں چل دیں۔ اس نے سکون کی سانس لی۔ اگر اماں ساری رام کہانی اسے سنائیں تو اسے موقع مل جانا تھا اپنی دکھانے کا کہ جی میں نے تو اسے خبردار کیا تھا۔ پر یہ ہی ناقص العقل ٹھہری۔ اس کے سامنے تو کسی طور وہ نیچا پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ خواہ مخواہ موصوف کو اپنی بڑائی جتانے کا موقع مل جاتا۔

☼ ☼ ☼

دو دن خیریت سے گزر گئے۔ اماں نے سختی سے آفس جانے سے منع کر دیا۔ اسے اپنی تعلیمی اسناد صرف میٹرک، ایف اے اور بی اے کی تھیں۔ ہاتھ سے جانے پہ دکھ ہو رہا تھا۔

"غضب ہو گیا مہو! پولیس ہمارے دروازے پہ آن کھڑی ہے۔ ہماری تو ناک کٹ گئی۔ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔" ابھی وہ پوری طرح آنکھیں کھول کر بیدار بھی نہ ہو پائی تھی کہ اماں افتاں و خیزاں کمرے میں داخل ہو گئیں اور سینے پہ دوہتڑ مار کر رونے لگیں۔

اوسان تو اس کے بھی خطا ہو گئے تھے۔ جھٹ دروازے پہ گئی۔ آنکھ لگا کر جھری سے دیکھا۔ واقعی دو پولیس والے کھڑے تھے۔ اس کا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حال تھا۔

"اماں! اب کیا ہوگا۔ یہ تو مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔" کرسی پہ گر کر وہ رونے لگی۔

"یہ سارا فساد تیرا لایا ہوا ہے۔ نہ تو گھر سے قدم نکالتی۔ نہ اس منحوس کا سر پھاڑتی اور نہ آج یہ حال ہوتے۔" اماں غصے میں اس پہ چلا اٹھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اسے پیٹ ڈالیں۔ مگر یہ وقت ہوش سے کام لینے کا تھا۔

وہ سر جھکائے ہچکیوں میں روتی رہی اور خبر ہی نہ ہوئی کہ اماں اوپر سے سبکتگین حیدر کو بلا لائیں۔

"خالہ! آپ حوصلہ رکھیں۔ میں دیکھتا ہوں۔" وہ انہیں تسلی دیتا باہر گلی میں چلا گیا۔ اب جانے اس نے پولیس والوں سے پورا گھنٹہ کیا بات کی کہ وہ لوگ چلے گئے۔ مہماہ نے تشکر بھری سانس لیتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔

☼ ☼ ☼

"خالہ جان! یہ معاملہ اتنا ایزی نہیں لیا جا سکتا۔ سیٹھ برہان، شعیب مرزا اور رائمہ حسن ان سب کی ملی بھگت ہے۔ آج مہماہ کی جان خطرے سے دوچار ہو چکی ہے۔" سنجیدگی سے بولتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔

"تو بیٹا! گلو خلاصی کی کوئی صورت نہیں؟" اماں نے موہوم سی امید سے پوچھا۔

"کیوں نہیں خالہ! ان لوگوں کا کیس خاصا کمزور ہے۔ ٹھیک ہے مہماہ نے سیٹھ برہان پہ حملہ تو کیا ہے۔ مگر اپنے دفاع کی خاطر۔ جسے یہ لوگ اقدام قتل کے زمرے میں لا رہے ہیں۔ صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ سیٹھ برہان کی مہماہ پہ نیت خراب ہو چکی ہے۔ وہ ایک کرپٹ اور حد درجہ عیاش شخص ہے۔ وہ مہماہ کو آسانی اغوا بھی کرا سکتا ہے۔"

"ہائے میرے مالک! یہ کس آزمائش میں ڈال دیا تو نے۔" اماں پھپھک کر رونے لگیں۔ صورت حال اتنی سنگین ہو جائے گی۔ انہوں نے سوچا نہ تھا۔

"پلیز خالہ جان! آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر حوصلہ بڑھانے لگا۔

"اگر آپ ان چند دنوں میں مہماہ کی شادی کر دیں تو معاملہ کچھ آسانی سے نمٹ سکتا ہے۔ اس قماش کے لوگ عام طور سے بزدل ہوتے ہیں۔ گھر میں کوئی مرد موجود ہو تو پھر یہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔" سبکتگین کی بات سن کر اماں رونا بھول کر اسے دیکھنے لگیں۔

"پر بیٹا اتنے تھوڑے دنوں میں کہاں سے رشتہ لاؤں۔ زینت بہن بھی اس بار کسی کام کا رشتہ نہ لائیں۔ چالیس سال کا فیکٹری مالک۔ بھلا بتاؤ! میری نازک کومل سی بیٹی اتنے ادھیڑ عمر کے ساتھ کیسے رہ پائے گی۔ بے شک پیسے کی ریل پیل ہے۔" اماں مایوسی سے بولیں تو سبکتگین کو لگا اپنی بات کہنے کا موقع اس سے اچھا پھر کبھی نہیں آئے گا۔

"خالہ! میرے سارے حالات سے آپ اچھی طرح واقف ہو چکی ہیں۔ اماں، ابا بچپن میں چھوڑ گئے۔ چچا نے سر پر ہاتھ رکھا۔ پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ شیخوپورہ میں اپنی آبائی زمینوں میں سے پورا شرعی حصہ دیا۔ اب سنجیدگی سے مجھ پہ شادی کا زور دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لڑکی میری پسند کی ہو کیونکہ گاؤں کی الھڑ مٹیار نیں۔ انہیں اپنے بھتیجے کے لیے مناسب نہیں لگتیں۔" کہتے کہتے وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"اگر مجھے اس لائق سمجھیں کہ میں آپ کا بیٹا بن جاؤں تو یہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی۔" سر جھکائے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں اپنا مدعا ان کے سامنے پیش کر دیا۔

اماں کچھ دیر تو اس کے جھکے سر کو دیکھتی رہیں۔ پھر اگلے ہی لمحے ان کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔ آگے بڑھ کر انہوں نے سبکتگین کی چوڑی پیشانی چوم لی۔

☼ ☼ ☼

"مہو! بیٹا کپڑے تو میں ساتھ درزن کو دے رہی ہوں۔ دو دن میں سی دے گی۔ لیکن جوتوں کے لیے تمہیں میرے ساتھ بازار چلنا ہوگا۔ تمہارے ناپ کا جو مجھے صحیح علم نہیں ہے۔" سونے کے کنگن دوبارہ کیس میں رکھتے ہوئے وہ مصروف انداز میں بولیں۔

ابھی کل ہی تو انہوں نے اپنے زیور پالش کروائے تھے۔ ہر چیز اتنی مکمل، سبکتگین کی صورت میں انہیں بیٹا مل گیا تھا۔ خوشی ان کے ہر انداز سے چھلکی پڑ رہی تھی۔

"اماں! میں کہہ رہی ہوں آپ سے میں کوئی نہیں شادی کرنے والی آپ کے اس بچے سے۔" آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ وہ حلق کے بل چلائی۔ وہ احتجاج کے سارے آزمودہ طریقے اپنا چکی تھی۔ مگر سب بے سود۔ اماں ہر حال میں اسے سبکتگین حیدر کے پلے باندھنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔

"پتا نہیں کیا گھول کے پلا دیا اس جادوگر نے آپ کو۔ جس کے آگے پیچھے کا کچھ علم نہیں۔ دیکھیے گا بہروپیا ہے۔ سر پکڑ کر بیٹھی روتی رہیں گی۔" اب کے اس نے انہیں ڈرانا چاہا۔

"بس! چپ کر۔" اماں نے سختی سے ڈپٹ دیا۔

"انسانوں کی پہچان ہے مجھے۔ دھوپ میں چونڈہ سفید نہیں کیا۔ بچے کی پیشانی ہی اس کے عالی نسب کی گواہی دیتی ہے۔" اماں کا لہجہ مطمئن تھا۔

مہواہ کا رونا دھونا، حلق پھاڑنا، سب بے کار ہو گیا۔

جنوری کی ایک سرد سی شام میں وہ محلے کے چند معززین کی موجودگی میں سبکتگین حیدر کی بنا دی گئی۔ ہلکے گلابی دبکے تلے کے کام والے سوٹ میں ملبوس، اماں اپنے سارے زیور اسے پہنا کر دعائیں دیتی اوپر چھوڑ آئیں۔

اماں کے جانے کے بعد وہ بیڈ سے اتر کر نیچے قالین پہ آ بیٹھی۔ بیڈ سے ٹیک لگائے وہ اپنی زندگی میں اچانک در آنے والی اس تبدیلی پہ غور کر رہی تھی۔

"کس خوب صورتی سے اپنی اچھائیوں اور خوبیوں کا جال پھینکا ہے میری ماں پہ سبکتگین حیدر نے۔ مگر میرے دل تک رسائی اتنی آسان نہیں۔ ہماری مجبوری، بے بسی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ساری زندگی اپنی اسی اچھائی کو جتا جتا کر میری زندگی میں زہر گھولتا رہے گا۔ مگر یہ بازی میں اس پہ الٹ دوں گی۔ میرے قرب تک کو ترسے گا۔ اپنے وجود کی خوشبو کبھی محسوس نہ ہونے دوں گی اسے۔"

اپنی حنائی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے وہ متفکر سی سوچ رہی تھی۔ اسی دم دروازہ کھلا۔ سبکتگین ٹھہرے ہوئے مضبوط قدموں سے چلتا سامنے ہی وہ پری وش پیکر بیٹھا تھا۔ نہ روایتی کانوں میں چھوٹی سی طلائی جھمکیاں، گلے میں دائیں ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی اور کلائی میں مگر سبکتگین کو اس کا یہ روپ سروپ بہت انوکھا فریب لگا۔ شاید یہ دل میں پہنچتے نئے نویلے جذبوں کا اعجاز تھا کہ وہ اسے آسمان سے اتری کوئی اپسرا ہو رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پہ بے زاری اتنی واضح تھی کہ وہ قدرے حیران ہوتا بیڈ پہ ہو گیا۔

"ساری رات یوں ہی بتانی ہے کیا؟"

جذبوں سے بوجھل آواز میں پوچھتے ہوئے اس نے ذرا سا آگے ہو کر مہواہ کے بالوں کو چھوا۔ وہ کسمسا کر پہلو بدل گئی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہ... میں نیچے چلتی ہوں... مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔" بمشکل بولتے ہوئے وہ نیچے قالین لگی۔ پھر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل سبکتگین حیدر لب بھینچے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

اماں نے ناشتے پہ خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ انڈا، حلوہ، مغز، دودھ، دیسی گھی میں تلے پراٹھے، دہی جانے کیا کیا۔

"مہو بیٹا! تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ ہی نیچے چاہیے تھا۔ حیدر بیٹا کیا سوچے گا۔ بیوی پہلے گئی۔"

اماں اسے اتنے سویرے نیچے دیکھ کر حیران گئیں۔ اب انہیں کیا معلوم کہ اس نے ساری رات ان کے ساتھ والے کمرے میں گزاری ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ اوپر کمرے میں نہیں۔

"چلو! اب ناشتا تیار ہے۔ تم حیدر بچے کو بلا لاؤ۔" چائے تھرماس میں ڈالتے ہوئے اماں نے اس سے کہا۔

"اماں! میں کیسے بلا لاؤں۔" وہ تو گڑبڑا اٹھی۔

"ہائیں! شوہر کو کھانے پہ کیسے بلایا جاتا ہے؟" اماں

کو اس کی بات سن کر حیرانی ہوئی۔

"پلیز اماں! آپ خود جا کر کہہ آئیں نا۔ مجھے شرم ہے۔" وہ بات بنا کر بولی۔ اماں سر ہلا کر اٹھ

"مہواہ کو دو ہفتے میرے ساتھ آفس جانا چاہیے۔ سنس واپس لینا بہت ضروری ہے۔ زندگی سے موقعوں پہ تعلیم کام آتی ہے۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سبکتگین سنجیدگی سے بولا۔ اس بات سے دونوں نے اتفاق کیا۔

مہواہ روٹین کے سادہ حلیے میں تیار ہوئی۔ بائیک کے پیچھے بیٹھنے کا خیال ہی اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ مگر وہ جوں ہی چادر لے کر باہر آئی تو اسے ——— گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

سبکتگین نے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ خاموشی سے آ کر بیٹھ گئی۔ اپنی ڈرائیونگ سیٹ پہ آتے ہی اس نے گاڑی تیز رفتاری سے بڑھا دی۔

سبکتگین لب بھینچے ڈرائیو کرتا رہا۔ مہواہ کو امید تھی کہ وہ اس سے رات کی انسلٹ کے بارے میں پوچھے گا۔ اپنے جذبوں کی بے توقیری پہ اس پہ چلائے گا۔ مگر وہ تو مگن انداز میں ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ یہ انداز بے نیازی تو مہواہ کو سلگا گیا۔" وہ اندر ہی اندر کھولنے لگی۔

"آفس میں کسی پر بھی اپنا نیا رشتہ ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی پرابلم ہو تو مجھے کال کر لینا۔" سنجیدگی سے کہتا ہوا سبکتگین گاڑی سے اترا۔ اسی دم ان کے قریب رائمہ کی وائٹ کرولا آ رکی۔

"تم اس کے ساتھ کیسے؟ آج اینٹی گرلز پرفیوم اسپرے کرنا بھول گیا ہو گا شاید۔" گاڑی سے نکل کر رائمہ اس کے قریب آ کر طنز سے بولی۔ وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اندر بلڈنگ میں چل دی۔ سارا دن آفس میں خیریت ہی رہی۔

"بیٹا! یوں سادہ حلیے میں کیوں پھر رہی ہو؟ نو بیاہتا ہو۔ بنو، سنورو، سجو۔ میاں کی توجہ بھی ادھر ادھر نہیں بھٹکتی۔"

اماں نے اسے ملگجے حلیے میں دیکھ کر ٹوکا۔ محلے کی عورتیں مبارک باد دینے آ رہی تھیں۔ اسے یوں سادہ کاٹن کے کپڑوں، میک اپ، جیولری کے بغیر دیکھ کے کافی ناک بھوں چڑھانا۔ عورتوں کے آگے اماں کو بوکھلا کر وضاحتیں دیتا دیکھ کر اس نے ہلکا سبز کام والا جارجٹ کا سوٹ پہن لیا۔ دونوں ہاتھوں میں بھر بھر چوڑیاں ڈالیں۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیر کھینچی۔ گداز ہونٹوں پہ ہلکی لپ اسٹک لگا کر پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا۔ پھر ذرا دور ہٹ کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

دھیرے دھیرے زینہ چڑھتی وہ اوپر کمرے میں آ گئی۔ اس کا روز یہی معمول تھا۔ اماں کے سوتے ہی نیچے آ کر رات بسر کرتی۔

وہ اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی۔ مگر اس کی ایک گہری نظر سے ہی خود پہ چڑھائے لاتعلقی کے خول میں دراڑ پڑنے لگتی تھی۔

اس کے وجود سے اٹھتی قیمتی کلون کی خوشبو، اس کا دھیما گمبھیر لہجہ، گہری شفاف آنکھوں کا نرمی سے دیکھنا، یہ سب مل کر اس کے گرد ایک طلسم سا باندھ دیتے۔ وہ اس حصار میں بندھی بے بس ہو جاتی۔ قطرہ قطرہ پگھلنے لگتی۔ دل اس ستم گر کو دیکھنے کو چاہتا۔ مگر سینے سے لگی ٹھوڑی اوپر اٹھنے سے ہی انکار کر دیتی۔ وہ تو سوچے ہوئے تھی کہ جب وہ وارفتگی سے اس کی طرف پیش قدمی کرے گا، وہ بری طرح اسے جھڑک دے گی۔ جب وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی محبت و چاہت کا قصہ سنانا شروع کرے گا، وہ سختی سے اس کا ہاتھ جھٹک کر دور کھڑی اس کی بے تابیوں کا لطف لے گی۔ اسے تڑپائے گی، کلسائے گی۔

مگر الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔

اس کے احساسات ایک دم سے بدلے تھے۔ اپنی بدلتی ہوئی کیفیات پر اسے خود حیرانی ہو رہی تھی۔ کمرہ خالی تھا۔ جاب کے بعد وہ اسے گھر ڈراپ کر کے کہیں چلا جاتا تھا۔

پورے کمرے میں اس کے وجود کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک لمبی سانس کھینچ کر وہ صوفے پہ بیٹھ گئی۔

آج جب رات بھیگ چکی ہوگی اور وہ نیچے جانے کا قصد کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ وہ دشمن جاں اس کا ارادہ بھانپ کر اس کا مرمریں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لے گا۔ محبت بھرے لہجے میں کہے گا۔

"بس مہواہ عنادل! اب بس کرو۔ اس سے زیادہ خود پہ ظلم کا مجھ میں یارا نہیں۔ وہ خود میں ہاتھ چھڑانے کی طاقت کیسے لا پائے گی۔ جب دل ہی داسی بن کر اس کے چرنوں میں بیٹھ کر عمر بتانے کے ارادے میں ہو۔"

دروازے پہ کھٹکا ہوا تو وہ خیالوں سے چونک کر نکلی۔

سبکتگین اندر آیا۔ اسے دیکھا۔ مگر زباں سے کچھ نہ کہا۔ الماری سے شلوار سوٹ نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ مہواہ نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا میگزین اٹھالیا۔ چہرے پہ بے نیازی کا تاثر سجائے ورق گردانی کرنے لگی۔ لیکن یہ بے نیازی و لاپروائی اس کے سامنے بھاپ کی مانند اڑ گئی۔ اب صرف گھبراہٹ ہی تھی۔

واش روم سے نکلنے کے بعد اس نے بالوں میں برش چلایا۔ پھر ریموٹ لے کر بیڈ پہ نیم دراز ہوگیا۔

"از ایوری تھنگ آل رائٹ؟ دس بج رہے ہیں اور تم نیچے سونے نہیں گئیں؟" وہ جو کچھ اور سننے کی منتظر سر جھکائے بیٹھی تھی، جھٹکے سے اوپر دیکھا۔

"میں نے پوچھا آج نیند نہیں آرہی؟" وہ ہونٹ دبائے نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ مگر سیاہ آنکھوں سے چھلکتی شوخی مہواہ کی جان جلا کر خاکستر کر گئی۔

"جا رہی ہوں۔ آپ کو فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میگزین سائیڈ پہ پٹخ کے وہ تڑخ کے بولی۔ پھر جھٹکے سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

جو ہم محسوس کرتے ہیں
اگر تم تک پہنچ جائے
تو بس اتنا سمجھ لینا
یہ ان جذبوں کی خوشبو ہے
جنہیں ہم کہہ نہیں سکتے
مگر تم جو اجازت دو
تو چند لفظوں میں کہہ ڈالوں
کہ۔۔۔
تم بن مر تو سکتے ہیں
تم بن جی نہیں سکتے

☼ ☼ ☼

آج اس کی جاب کا آخری دن تھا۔ وہ دل لگا کر تیار ہوئی۔ آف وائٹ کلیوں والا فراک جس کی آستینیں چوڑی دار تھیں۔ گلے اور گھیر پہ عنابی کام کیا گیا تھا۔ ساتھ میں تنگ چوڑی دار پاجامہ، بڑا سا میچنگ دوپٹہ اوڑھا۔ لمبے بالوں کی سادہ سی چوٹی بنا کے آگے ڈال لی۔ کانوں میں اسٹیل کے بالے، آنکھوں میں کاجل کی لکیر کھینچ کر وہ باہر آگئی۔

اماں نے بلائیں لے کر چار قل پڑھ کے اس پہ پھونکے۔ کف کے بٹن بند کرتے تیزی سے اترتے سبکتگین حیدر کے قدم بھی ٹھٹک کے رک گئے تھے۔ اس کی نظروں میں ستائش آسمانی تھی۔

"چلیں پھر دیر ہو رہی ہے۔" لمحوں میں خود پہ قابو پا کے وہ اس کے قریب آکے نارمل انداز میں بولا۔

گاڑی میں آج پھر وہی جان لیوا خاموشی بول رہی تھی۔ سگنل پہ رکتے ہی پھول بیچنے والا لڑکا بھاگ کے کھڑکی پہ آیا۔

"بھائی جان! پھول چاہئیں؟" مہواہ کا دل اک نئی لے پہ دھڑکنے لگا۔ اس نے دو عدد گجرے اور تین لڑیاں لے کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیں۔

تازہ گلاب اور بیلے کی خوشبو سے گاڑی کی فضا مہک اٹھی۔

"خوامخواہ کیوں پھول لے لیے۔ لازمی پیسے برباد کرنے تھے۔" مہواہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ خوامخواہ جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگی۔ دل نہ جانے کیوں بھر آرہا تھا۔

"بس ایسے ہی لے لیے۔" موڑ کاٹتے ہوئے

سبکتگین نے "مختصرا" جواب دیا۔

"وہ بے چارہ بچہ تھا۔ ہم بھکاریوں کو تو آرام سے پیسے دے دیتے ہیں۔ مگر ان غریبوں کو اجرت دینے کی سکت نہیں رکھتے۔ اب دیکھو نا، تھوڑے سے پیسوں سے گاڑی میں کتنی خوشبو رچ گئی ہے۔" اس کے تپے تپے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ آرام سے بولا۔ وہ اپنے ناخن کٹ رہی تھی۔

"کوئی خوشبو نہیں رچی۔ بیلے کی خوشبو سے میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔" غصے سے بولتے ہوئے مہواہ نے وہ پھول اٹھا کر گاڑی کے باہر پھینک دیے۔

"کسی کی محنت کو یوں ضائع کرتے ہیں۔ کوئی نقصان دے رہے تھے۔ یہاں پڑے ہوئے۔" سبکتگین متاسف لہجے میں بولا۔

"کوئی فائدہ بھی نہیں دے رہے تھے۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"حیرت ہے تم خوشبو سے الرجک ہو۔ حالانکہ لڑکیاں تو خوشبو کی دیوانی ہوتی ہیں۔" سبکتگین نے بھنویں اچکا کر حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھے پروین شاکر کی "خوشبو" اچھی لگتی ہے بس۔" فاصلے چڑھے ہوئے انداز میں جواب دے کر وہ زور سے گاڑی کا دروازہ بند کرتی اتر آئی۔ سبکتگین کی دبی دبی مسکراہٹ بے ساختہ ہنسی میں بدلی تھی۔ اپنے کیبن میں بیٹھ کر کام نمٹانے کے بجائے وہ ساتھی ورکرز سے گپ شپ لگاتی رہی۔ اسی دم چپراسی نے اسے باس کے کمرے کا پیغام دیا۔ وہ جب آفس پہنچی تو وہاں باس اور مس رائمہ کے ساتھ دو پولیس والوں کو بھی اپنا منتظر پایا۔ اس کے تو چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"مس مہواہ! ہمارے پاس آپ کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ آپ پہ سیٹھ برہان لاشاری کے اقدام قتل کا الزام ہے۔" ایک پولیس والا سختی سے اس سے مخاطب ہوا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے باس کو دیکھا۔

"سوری! ہم کسی ورکر کی مجرمانہ سرگرمیوں کی حمایت کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ قانون کے ساتھ تعاون ہمارا فرض ہے۔" باس رکھائی سے بولے۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے ٹیبل پہ رکھے فون پہ نمبر ملانے لگی۔

"پلیز سبکتگین! آپ ذرا باس کے آفس میں آجائیں؟" وہ پریشانی سے بولی۔ خوف و دہشت سے جیسے اس کے اعصاب ختم ہوئے جا رہے تھے۔

"اسے کیوں بلا رہی ہو؟ کیا لگتا ہے تمہارا؟" رائمہ طنز سے پوچھنے لگی۔ اسے کوئی جواب دینے کے بجائے وہ سبکتگین کا انتظار کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ آگیا۔

"جی کیا مسئلہ ہے؟" وہ تمام نفوس پہ سرسری نظر ڈالتے ہوئے پولیس والوں سے دبنگ انداز میں پوچھنے لگا۔

"ہم مس مہواہ کو تھانے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ ان پہ سیٹھ برہان پر حملہ کرنے کا الزام ہے۔" پولیس آفیسر کی بات سن کر اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"تھانے لے جانا چاہتے ہیں یا سیٹھ برہان لاشاری کے بنگلے پہ؟" اس نے سخت کٹیلے لہجے میں پوچھا۔ پولیس آفیسرز کے ساتھ ساتھ رائمہ اور شعیب مرزا کے چہرے کا رنگ بھی فق ہوگیا۔

"دیکھیے مسٹر! آپ جو بھی ہیں، اس معاملے سے دور رہیں۔ ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔" پولیس والے کو اس کی مداخلت سخت بری لگی۔ تب ہی درشتی سے بولا۔

"میں سبکتگین حیدر، مہواہ کا شوہر ہوں۔ یہ میری قانونی اور شرعی بیوی ہیں۔ ان کا تحفظ میرا اولین فرض ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تو مہواہ کو ایسا لگا، جیسے وہ جلتی بلتی دھوپ سے ایک ٹھنڈے سایہ دار سائبان تلے آگئی ہو۔ سارے وہم و گمان، تفکرات کہیں دور منہ چھپا کے بھاگ گئے تھے۔ رائمہ کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔

"تت، تم نے اس سے شادی کرلی؟" وہ شاکڈ سی سبکتگین کو دیکھنے لگی۔

"اس شہر کے ڈی ایس پی میرے دوست ہیں۔ آپ ذرا اپنے اوریجنل پیپرز دکھائیے۔ تاکہ پتا چل

سکے کہ آپ کس تھانے سے آئے ہیں۔ تھانے سے واقعی آئے ہیں یا پھر وردیاں کرائے پر لی ہیں؟" وہ پولیس والوں سے طنزیہ انداز میں مخاطب ہوا۔

ان نوسربازوں کی ساری طراری منٹوں میں ہوا ہوگئی۔ ڈرامے کا ڈراپ سین آخر ہو ہی گیا۔

"مجھے بہت افسوس ہے سر! کہ آپ بھی ایسی گھناؤنی سازش میں ملوث تھے؟" اب کے وہ شعیب مرزا سے مخاطب ہوا۔

"بجائے اپنے ورکرز کا دفاع کرنے کے سیٹھ برہان جیسے کرپٹ اور عیاش انسان کے ہاتھوں کھلونا بنے رہے۔ یہ میرا استعفیٰ ہے۔ میں یہاں اب مزید کام نہیں کر سکتا۔" جیب سے اس نے استعفیٰ نکال کر باس کی ٹیبل پہ رکھ دیا۔

"نہیں سبکتگین! ایسے مت کرو۔ تم میرے انتہائی محنتی اور ایمان دار آفس ممبر ہو۔" شعیب مرزا لجاجت سے بولے۔

"مہماہ کو برہان کے پاس بھیجنے اور پولیس ڈراما۔ یہ سب رائمہ کے شیطانی ذہن کی کارستانی ہے۔ میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" شعیب مرزا نے تو جیسے سارے راز فاش کردیے۔

"شٹ اپ مرزا! سارا ملبہ مجھ پہ ڈال کے خود بری الذمہ ہو رہے ہو؟" رائمہ غصے میں حلق کے بل چیخی۔

"حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود مہماہ کو اس کے حوالے کرنے پر سیٹھ برہان سے لاکھوں کی ڈیلنگ کی ہے۔" وہ زہر خند انداز میں بولی۔ دونوں جیسے آج ایک دوسرے کے چہرے پہ پڑے نقابوں کو ہٹانے کے درپے تھے۔

"چلو مہماہ! ہم چلتے ہیں۔" سبکتگین نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کو پیچھے جھگڑتا چھوڑ کر وہ پارکنگ میں آگئے۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔

"اف! اتنے خطرناک لوگ بھی ہیں اس دنیا میں۔" گاڑی سے باہر رواں دواں زندگی کو دیکھتے ہوئے اس نے دکھ سے سوچا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اسے مسلسل خاموش [دیکھ کر] سبکتگین نے نرمی سے پوچھا۔

"بس یہی کہ اگر یہ سب لوگ اپنے گندے [ارادوں] میں کامیاب ہوجاتے تو میرا کیا ہوتا۔ شاید میری [اماں کی] دعائیں مجھے بچالائی ہیں۔"

"اماں کی دعائیں اور میری محبت بھی۔"

"محبت؟" مہماہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ [اس کی] سیاہ آنکھیں جذبوں کی لو سے چمک رہی تھیں۔ [اس] تپش سے گھبرا کر اس نے نظریں جھکالیں۔

"باس ہوں، رائمہ یا سیٹھ برہان، ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ کرپٹ، لالچی اور دولت کے پجاری۔" سبکتگین نے بات بدل دی۔ وہ جی بھر کے بدمزا ہوئی۔

"یہ بندہ اظہار میں اتنا بخل سے کام کیوں لیتا ہے۔"

"رائمہ صرف باہر سے اٹریکٹیو ہے۔ مگر اندر [سے یہ] عورت بہت کرپٹ ہے۔ مڈل کلاس گھرانے [سے] تعلق ہے۔ شوہر کسی اور فیکٹری میں معمولی [ملازم] ہے۔ مگر باس شعیب مرزا کے عالی شان گھر [میں] برسوں سے بغیر کسی شرعی تعلق کے رہ رہی ہے۔"

"اف میرے خدایا!" مہماہ تو اس انکشاف پہ [دنگ] ہوگئی۔

"افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں کے ناجائز مراسم کا رائمہ کے شوہر کو پورا علم بھی ہے۔"

"اف! یہ کردار کی پستی کی کون سی حد ہے۔" [وہ] تاسف سے بولی۔

"بس! ناجائز دولت کے حصول کی اندھا دھند کوشش۔" سبکتگین سادگی سے بولا۔

"یہ ہم کہاں جارہے ہیں؟ یہ گھر کا راستہ تو نہیں ہے۔" خود کو انجانے راستے سے گزرتا پاکے وہ بے تابی سے بولی۔

"ہم وہاں جارہے ہیں۔ جہاں ہمیں جانا چاہیے۔" مبہم سی بات اس کے پلے نہ پڑی۔ گاڑی ایک خوب صورت گھر کے سامنے آکر رک گئی۔

وہ الجھی سی ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سبزے اور پھولوں کی بہتات تھی۔ پھولوں کی مہک فضا میں رچی ہوئی تھی۔

"یہ ہم کہاں آگئے؟"

"اپنے گھر۔" سبکتگین نے مختصر جواب دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک بے حد آرام دہ بیڈ روم میں آگئے۔

"یہ ہمارا یعنی میرا اور تمہارا بیڈ روم ہے۔ آئندہ تمہاری اوپر نیچے کی اٹھک بیٹھک برداشت نہیں کی جائے گی۔" وہ مصنوعی رعب سے بولا۔

"یہ گھر میں دو سالوں سے تعمیر کرا رہا تھا۔ پسند آیا؟" مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

جواب دینے کے بجائے وہ اس وسیع کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ جہازی سائز بیڈ، نفیس سرسراتے ریشمی پردے، بیش قیمت فرنیچر، دیواروں پہ سجی نایاب پینٹنگز اور خطاطی کے نمونے۔

"شاہ جہاں نے ممتاز کے لیے تاج محل بنا کر ہم غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ میں محل تو نہیں لیکن ایک خوب صورت سا چھوٹا گھر ضرور بنانا چاہتا تھا جو میرے دل کی رانی کے شایان شان ہو۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے بولا۔

"مہماہ! تم لو ایٹ فرسٹ سائٹ کی قائل ہو؟" وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اب اس سے کیا کہتی۔

"مجھے تم سے پہلی نظر میں محبت ہوئی تھی۔ جب تم گیلے بال بکھرائے آنکھیں موندے چیئر پہ دھوپ سینک رہی تھیں۔ میرا دل اسی دن تمہارا اسیر ہوا تھا۔ ابھی میں قدرت کے اس دلکش شاہکار پہ اللہ کی تعریف کر بھی نہ پایا تھا کہ تم نے مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کردی۔" وہ اسے پرانے دنوں کی یاد دلا رہا تھا۔ وہ بے طرح شرمندہ ہوئی۔

"آپ کی حرکتیں جو اتنی مشکوک تھیں۔ بنا تعارف کے گھر میں گھس آئے تھے۔ میرا گھبرانا تو فطری تھا نا۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"آفس میں جب تمہارے خلاف سازش کا علم ہوا تو میں پریشان ہو اٹھا۔ تمہیں ہر مصیبت سے بچانا تو گویا میری زندگی کا مشن بن گیا تھا۔ ہر بار خود سے سوال کیا۔ از اٹ لو سبکتگین؟ اتنی بے قراری اور بے چینی صرف مہماہ کے لیے کیوں؟ تمہارے لیے میرا "ہو کیئرز" والا اسٹائل نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میری محبت سچی تھی۔ تب ہی میرے جذبے بار آور ٹھہرے اور آج تم میرے ساتھ ہو۔" دھیرے دھیرے بولتا ہوا وہ اس کے کانوں میں امرت گھول رہا تھا۔

"میرے چاچا نے شیخوپورہ میں اپنی اور ابا کی مشترکہ زمینیں بیچیں تو مجھے بھی میرا شیئر مل گیا۔ میرا ارادہ ان پیسوں سے اپنی فیکٹری لگانے کا تھا۔ لیکن تجربہ نہ تھا۔ اسی لیے دو سال شعیب اینڈ کمپنیز میں کام کیا۔ تاکہ کچھ کاروباری اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرلوں۔ میری اپنی فیکٹری تقریباً" تکمیلی مراحل میں ہے۔" وہ اس کی صبیح پیشانی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"کافی دیر ہوگئی ہے۔ گھر چلتے ہیں۔ اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔" کھڑکی سے باہر اترتے اندھیرے کو دیکھ کر وہ فکر مندی سے بولی۔

"یہ اماں کا کمرہ ہوگا۔ بالکل ہمارے سامنے۔" بیڈ روم سے باہر آکر سبکتگین نے سامنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا اماں یہاں رہیں گی؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"تو وہ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں اکیلی کیسے رہیں گی؟ جب ہم یہاں ہوں گے تو لازمی انہیں بھی میں ادھر لے آؤں گا۔" وہ اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ کچھ کہنے کے بجائے اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔ آگے بڑھ کر سبکتگین کے کندھے پہ اپنا سر ٹکا دیا۔ یہ شخص اس کے لیے ابدی خوشیوں کا پیامبر بن کر آیا تھا۔

"ارے پگلی! وہ میری بھی ماں ہیں نا۔ ماں اپنے بیٹے کے گھر میں نہیں رہے گی تو کہاں رہے گی بھلا۔" نرمی سے بولتے ہوئے سبکتگین نے اپنے بازوؤں کا مضبوط حصار اس کے گرد باندھ دیا۔

✿

شازیہ جمال نیر

دل کے آس پاس



جوں ہی وہ آخری پیپر دے کر کالج سے گھر لوٹی ایک سکون بھری سانس فضا میں خارج کرکے سرشار سی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"پیپر کیسا ہوا؟" آپا نے "زیرو پوائنٹ" سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"معلوم نہیں۔" وہ چادر اتار کر اب پاؤں سینڈلز کی قید سے آزاد کر رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" چینل سرچنگ میں مصروف افشی نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ آج میرا لاسٹ پیپر تھا۔ کل مجھے شاپنگ کے لیے بازار جانا ہے اور پرسوں میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہوگا جس کا مجھے پچھلے چھ ماہ سے انتظار تھا۔" وہ حسب عادت پاؤں جھلاتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

"تم واقعی پرسوں گاؤں جا رہی ہو؟" افشی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"تمہیں کوئی شک ہے؟" اس نے تکیے سے ٹیک لگالی۔

"عنادل! پہلے پیپرز کی تھکن اتار لو، پھر آرام سے چلی جانا۔ گاؤں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔" آپا نے کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں! میری تھکن تو وہاں جاتے ہی اتر جائے گی۔" وہ نوالہ توڑتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ آپا اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

ناولٹ

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح ہی صبح اس نے بازار جانے کا شور مچا دیا۔

"اچھی طرح ناشتا تو کرلو پہلے۔" امی کو اس کی ہر کام میں جلدی مچانے والی عادت سے بہت چڑ تھی۔ شاپنگ کے لیے رقم وہ رات ہی ابو سے لے چکی تھی۔ اب امی کی ہائے وائے کو نظر انداز کرکے افشی کا ہاتھ پکڑے جلدی سے باہر نکل آئی۔ دادی کے لیے سوٹ، جوتے، نوڈلز، اسنیکس، پاستا، جیم وغیرہ ایک ایک کرکے خریدتی چلی گئی۔ اس کے بعد چاچی اور نور بھابھی کے لیے چیزیں خریدیں۔ البتہ چار عدد "کزنز" کے لیے وہ کوئی ایک چیز بھی نہ خرید سکی کیونکہ اسے اس شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ چار گھنٹوں کی مسلسل مشقت کے بعد افشی تو بری طرح تھک چکی تھی۔ لیکن اس کے جوش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ امی اور آپا کو سب چیزیں ـــــ دکھانے کے بعد اب وہ پیکنگ میں مصروف تھی۔

"تھکتی نہیں ہے یہ لڑکی۔ پتا نہیں کون سے سیل فٹ ہیں اس کے اندر۔" سبزی کاٹتی آپا نے اس کی مسلسل چلتی زبان اور ہاتھ دیکھ کر افشی سے کہا۔ جو بازار سے واپسی پر ہاتھ پاؤں چھوڑے چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اس نے فون کرکے دادی کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ اس کی آمد کی شدت سے منتظر ہوں گی۔

"امی! صبح مجھے جلدی سے جگا دیجیے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پڑی سوتی رہوں۔" اس نے بلا مبالغہ کوئی دسویں



بار جب یہ جملہ دہرایا تو امی بری طرح چڑ گئیں۔

"اُفوہ! سوؤگی تو جگاؤں گی نا۔ عجیب پاگل لڑکی ہے۔" امی کی بڑبڑاہٹ سن کر آپا اور افشی کے چہرے مسکراہٹ اُمڈ آئی، لیکن وہ برا مانے بغیر تکیے میں منہ گھسیڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ان کا آبائی گھر شہر سے کافی دور "خان پور" گاؤں میں تھا۔

جہاں زرتاج خاتون اپنے دو بیٹوں اشفاق احمد اور آفاق احمد کے ساتھ شوہر کی وفات کے بعد برسوں سے مقیم تھیں۔ اشفاق احمد نے باپ کی وفات کے بعد زمین جائیداد وغیرہ کے تمام معاملات سنبھال لیے تھے جبکہ آفاق احمد زمین داری سے شغف نہ رکھنے کی بنا پر شہر میں ملازمت کر رہے تھے۔ نور فاطمہ ان کی چھوٹی اور اکلوتی بہن تھیں۔ زرتاج خاتون نے مناسب وقت پر اپنے تینوں بچوں کی شادیاں کردی تھیں۔ آفاق احمد کے لیے بیوی بچوں کے بغیر شہر میں اکیلے رہنا بہت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی تینوں بیٹیوں مہرین، افشین اور عنادل کو لے کر مستقل شہر شفٹ ہو گئے۔ ان کی بیوی صفیہ ایک باشعور خاتون تھیں اس لیے بہت کم عرصہ میں وہاں کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرلیا۔ اس تمام عرصہ میں ان کا گاؤں سے رابطہ برابر قائم رہا۔ زرتاج خاتون ضعیف العمری کے باعث سفر نہیں کرسکتی تھیں اس لیے یہ لوگ، عید بقرعید اور دیگر تہواروں پر گاؤں ان سے ملنے چلے جاتے تھے۔ لیکن عنادل کا دل گاؤں میں اپنی دادی کے ہاں زیادہ لگتا تھا۔ اس لیے وہ وہاں جانے کے لیے اکثر بے چین رہا کرتی تھی۔ خاص طور پر دادی کا چھ کھڑکیوں والا بڑا سا کمرا جسے وہ "بنگلہ" کہا کرتی تھیں۔ جس کی چار کھڑکیاں باغ میں کھلتی تھیں اور جہاں رات کی رانی کی خوشبو اسے دیوانہ کردیتی تو "دن کا راجہ" کی مہک وہ اپنے اندر تک اتار لیتی۔ امرود کے گھنے پیڑ پر بلبل علی الصباح نغمہ سرا ہوتی اور کچے پکے امرود ٹپ ٹپ کرکے گرتے چلے جاتے۔ عصر کے وقت دادی اپنے پیڑ پودوں کو پانی سے نہلاتیں اور وہ انگور کی بیل میں چھپی کوئل کو ڈھونڈنے میں ہلکان ہو جاتی۔ کوئل تو نہ ملتی، البتہ بیری پر مستیاں کرتی گلہریاں اس کی نظر میں آجاتیں اور وہ گلاب کے پھولوں پر رقص کرتی رنگ برنگی تتلیاں مبہوت ہو کر دیکھتی رہ جاتی۔

اسے اپنی دادی، ان کا چھ کھڑکیوں والا بنگلہ اور انواع اقسام کے پیڑ پودوں سے بھرے سرسبز باغ سے عشق تھا۔

صبح وہ امی کے آواز دینے سے پہلے ہی جاگ رہی تھی۔ وہ چھٹیاں ہمیشہ دادی کے پاس گاؤں جا کر گزارا کرتی تھی۔

"دل! غزین بھائی آئے ہیں تمہیں لینے کے لیے جلدی کرو اب۔" افشی نے دروازے سے جھانک کر اسے اطلاع پہنچائی۔

"اُف! غزین اشفاق۔۔۔ یعنی کہ ٹوٹل بور سفر۔" وہ گیلے بالوں کو کیچر میں مقید کرتی باہر آگئی۔ لاؤنج میں غزین سے گاؤں اور اہل گاؤں کا حال سننے کے ساتھ ساتھ خاطر تواضع کا بھی برابر انتظام کیے جا رہی تھیں۔

"چلیں؟" اسے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سنو! دعا کرنا کہ میں بخیر و عافیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں اطلاع ملے کہ آنسہ عنادل آفاق کی تو راستے میں ہی "تاثیر ٹائمیں فش" ہو گئی تھیں۔" وہ آہستہ سے افشی کے کان میں بولی تو وہ اسے ایک دھپ رسید کرکے ہنس پڑی۔

"بدتمیز!"

"آپ کی جیپ بہت خوب صورت ہے۔" وہ گاڑی میں پہل کرتے ہوئے توصیفی لہجے میں بولی تھی کیونکہ موصوف تو "جیسے جانتے نہیں پہچانتے نہیں" کی عملی تفسیر بنے اس کے وجود سے یکسر بے نیاز ڈرائیونگ میں مگن تھے۔ جب کہ دل کے لیے زیادہ دیر تک چپ رہنا محال تھا۔

"جانتا ہوں۔" گمبھیر آواز میں جواب دے کر شاید ... کی اگلی سات نسلوں پر احسان کیا گیا تھا۔ وہ جل ہی ... اس کے الفاظ و انداز پر۔

"... بھی کیا ضرورت ہے بات کرنے کی ہونہہ۔" ... موڑ کر باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھنے لگی۔ ... جلد ہی اکتا گئی۔

"واؤ! آپ کا میوزک کلیکشن تو غضب کا ..." "راحت فتح علی خان کی سی ڈیز دیکھتے ہوئے وہ اپنی ... بے عزتی فراموش کر چکی تھی۔

"پوچھ رہی ہو یا بتا رہی ہو؟" اب کی بار وہ براہ راست اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی؟" دل اس کے اس طرح دیکھنے اور پوچھنے پر کچھ گڑبڑا سی گئی۔

"میرا میوزک کلیکشن بہت غضب کا ہے یہ ... ہوں اگر تمہیں اچھا لگا ہے تو آئی ڈونٹ ..."

... ایسا پتھر توڑ لہجہ۔ یعنی "اپنی حد میں رہو۔" کا ... اشارہ۔ وہ نہ بولنے کی قسم کھائی آرام سے بیٹھ ... زیادہ دیر تک منہ بند رکھنا مشکل تھا۔ بات کرنے کے لیے نہ سہی، پر کچھ کھانے کے لیے تو کھولا جاسکتا ہے۔ اب وہ چپس کا پیکٹ کھول کر مزے سے چپس کترنے لگی۔ گاڑی کی خاموش فضا میں "کچر کچر" کی آواز غزین کو کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ لیکن عنادل ... واقعی منہ بند کرکے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

... ہی گاڑی لکڑی کے بڑے دروازے کے ... سامنے رکی، وہ قلانچیں بھرتی اندر کی جانب بھاگ گئی۔

"ارے! میری پوتی آگئی۔"

دادی کا مخصوص جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا تو وہ بھاگ کر ان کی کھلی شفیق بانہوں میں سما گئی۔ ان کے سینے سے لگ کر ڈھیروں سکون اس کے اندر تک اتر ... اور جب وہ اس کی پیشانی اور ہاتھوں پر بوسہ دیتیں تو وہ دیر تک یہ محبت بھرا لمس محسوس کرتی رہتی۔ وہ دیر تک اسے اپنے ساتھ لگائے ایک ایک کا حال پوچھتی رہیں۔

راشدہ چاچی اس وقت سو رہی تھیں۔ حالانکہ یہ سونے کا وقت تو ہرگز نہیں تھا۔ لیکن چاچی پہلے کون سا کوئی کام وقت پر کرنے کی عادی تھیں بھلا۔ وہ سر جھٹک کر دادی کو ان کی شاپنگ دکھانے لگی۔

"سفر کیسا گزرا تھا؟"

کھانے پر نور پھپھو کے پوچھنے پر دل تو چاہا کہہ دے کہ اس "کھڑوس" کے ساتھ سفر کیسا گزر سکتا ہے، یہ تو کوئی پاگل بھی "اچھے طریقے سے" بتا سکتا ہے۔ لیکن "کھڑوس" سامنے ہی تو سر جھکائے کھانا کھانے میں مگن تھا۔ اس لیے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ باغ کی طرف چلی آئی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔

وہ سفید خرگوش دیکھنے لگی تھی جو ابھی ابھی اس کے سامنے سے بھاگتے ہوئے گئے تھے۔

"گھر کے اندر قدم رکھتے ہی ہمیں پتا چل گیا تھا کہ کسی چنچل حسینہ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ہے اس لیے

تو ہر سو رنگینی پھیلی ہوئی ہے۔" حمزہ اور زین العابدین نے اسے دیکھ کر والہانہ جوش کا اظہار کیا تھا۔

"میں تو سوچ سوچ کر ہی پاگل ہونے لگا تھا کہ یہ پہاڑ جیسی چھٹیاں آخر گزریں گی کیسی؟ لیکن اللہ میاں نے ہماری ہر رات شب برات اور ہر دن عید بنانے کے لیے آپ کو یہاں بھیج ہی دیا۔" حمزہ نے انگور توڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اپنے ان دو چھوٹے کزنز کی کمپنی کو خوب انجوائے کرتی تھی۔ دونوں جڑواں تھے۔ شکلوں اور عادات میں بالکل ایک جیسے۔

"سنو! اس وقت تمہارا وہ والا بھائی کہاں ہے جو سال میں صرف ایک بار مسکراتا ہے۔"

وہ بلبل کا ٹونگا ہوا کچا امرود گلہری کی طرف اچھالتے ہوئے رازداری سے پوچھنے لگی تو دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کون، غزین بھائی؟ اپنے دوست سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔" جواب زین العابدین نے دیا تھا۔

"اچھا! تمہارے بھائی کا کوئی دوست بھی ہے...؟ اسٹرینج!" وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

"آہستہ بولیں۔ اگر امی نے سن لیا تو بھونچال آجائے گا" کیونکہ وہ "سال میں صرف ایک بار" مسکرانے والے اپنے بیٹے کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتیں۔" حمزہ نے اسے پتے کی بات بتائی۔ وہ سامنے سے آتی راشدہ چاچی کو دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

✲ ✲ ✲

دن کے بارہ بج چکے تھے اور کھانا پکانے کے ابھی دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ چاچی اپنے کمرے میں سوئی پڑی تھیں اور ان کے خراٹوں کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ بھوک کے مارے اس کے پیٹ میں چوہوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں بھی سب سے پہلے وہی "بھوک بھوک" کا شور مچاتی تھی۔

"دل! تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ جاؤ [illegible] اپنے لیے کچھ بنالو۔ یہاں تو سب دیر سے کھانا [illegible] کے عادی ہیں۔ ناشتا جو دن چڑھے کرتے ہیں [illegible] نے شاید اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ [illegible] تھے۔ وہ سہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کون سی ڈش اچھی پکالیتی ہو؟"

"نوڈلز۔" دادی کے پوچھنے پر وہ شرارت [illegible] جواب دیتی باہر نکل گئی۔

چاچی بہت تساہل پسند تھیں۔ ہر کام بہت [illegible] سے اور اپنے موڈ کے مطابق کرنا پسند کرتی تھیں [illegible] شروع شروع میں دادی کو ان کی ایسی عادتیں اکثر [illegible] میں مبتلا کردیتی تھیں۔ لیکن بہت جلد ان پر حقیقت [illegible] آشکار ہوگئی کہ بہو وہی کچھ کرتی ہے جو اس کا دل چاہتا ہے۔ لہٰذا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور چار بیٹوں کو پیدا کرنے کے فخر میں مبتلا راشدہ چاچی کسی کی بات پر کان دھرنا کب کا چھوڑ چکی تھیں۔ اشفاق چاچا سست ملنگ ٹائپ انسان تھے۔ ان کی طرف راوی ہمیشہ ہی چین لکھتا تھا۔

"امی! پلیز جلدی سے کھانا..." غزین کچن سے [illegible] کھٹ پھٹ کی آوازیں سن کر سیدھا ادھر ہی چلا آیا تھا۔ لیکن سامنے موجود ہستی کو دیکھ کر آدھی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

"چاچی! امی شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اندر اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ مجھ سے تو بھوک برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نوڈلز بنا رہی ہوں۔ آپ کھائیں گے؟" جواب دینے کے ساتھ کھانے کی آفر بھی کر ڈالی۔

"کیا گھر کے باقی افراد بھی آج "نوڈلز" ہی کھائیں گے؟" غزین اس کے "سگھڑاپے" پر چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ وہ مصروف تو یوں نظر آرہی تھی گویا بریانی، قورمہ بنا رہی ہو۔ دل نے لاعلمی سے کندھے اچکائے تو وہ سر جھٹکتا باہر نکل گیا۔

"نہ تو نہ سہی۔" وہ باؤل اٹھاکے دادی کے "منگلے نما کمرے" میں چلی آئی۔

[illegible] نہیں کھائی جارہیں یہ شوربے والی نمکین [illegible] نوڈلز۔"

دادی جب چوتھی بار بھی نوڈلز اپنے منہ تک لے جانے میں ناکام ہوئیں تو جھنجلا کر چمچہ پٹخ دیا۔ دل ہنستے ہوئے انہیں نوڈلز کھانے کا طریقہ سمجھانے لگی۔

✲ ✲ ✲

"میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے کوئی بیٹی نہیں دی، ورنہ ہر دوسری عورت کی طرح بیٹیوں کے نصیبوں پر رو رہی ہوتی۔" چاچی سبزی بنانے کے ساتھ ساتھ ہمسائی سے بھی گفتگو کر رہی تھیں۔

"لیکن چاچی! بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں۔" دل کو چاچی کے خیالات جان کر حقیقتاً "افسوس ہوا تھا۔

"ہاں بیلکل کسی کسی کے لیے ہوتی ہوں گی۔ ہم نے تو اکثر انہیں ماں باپ کے لیے زحمت ہی بنتے دیکھا ہے۔" وہ سامنے سے آتی نور پھپھو کو دیکھ کر طنزیہ لہجے میں بولیں۔ دل نے گھبرا کر تسبیح پڑھتی دادی کو دیکھا تو وہ بھی بس نظر چرا کر رہ گئیں۔

نور پھپھو بہت آہستگی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ چاچی کی ان ہی باتوں نے انہیں اپنے کمرے تک محدود کرکے تنہائی پسند بنا دیا تھا۔ انہیں اپنے سسرال سے ناراض ہوکر میکے کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ شادی سے پہلے گھر بھر کی لاڈلی ہوا کرتی تھیں۔ کچھ تیکھے مزاج کی مالک تھیں، اس لیے بھرے پرے سسرال میں ایڈجسٹ نہ ہوسکیں۔ انہیں اپنے شوہر فاروق سے محبت تو تھی، لیکن اس محبت کی خاطر بھی ان سے وابستہ رشتے نہ نبھا پائیں۔

دادی کو اکلوتی بیٹی کا غم دل ہی دل میں کھائے جاتا لیکن وہ لبوں پر چپ کے قفل چڑھائے کسی معجزے کی منتظر تھیں۔ کچھ کہہ سن کر انہیں خود سے بدظن نہیں کرنا چاہتی تھیں، کیونکہ بیٹی کی نازک مزاجی سے اچھی طرح واقف تھیں۔

"دل کیا! جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے تو چھ ماہ پہلے تک آپ اتنی اور ہرگز نہیں ہوا کرتی تھیں۔" وہ دونوں زارسی شکل بنائے اس کے سر پر پہنچ گئے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ باہر موسم دیکھیں۔ کتنا پیارا ہو رہا ہے اور آپ بور لوگوں کی طرح اندر پڑی سڑ رہی ہیں۔ چھت پر چل کر کچھ موج مستی کرتے ہیں۔" زین اس کا ہاتھ کھینچتا چھت پر لے گیا۔

"جانتی ہیں، یہ جو ساتھ والا راجہ ہے نا! اس نے ہماری کوئی پچاس گڈیاں لوٹی ہیں۔ آج آپ نے اس کے "گڈے" پر بوکاٹا مارنا ہے بس۔" حمزہ نے پتنگ کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ دل نے ذرا سی آنکھیں سکوڑ کر ساتھ والی چھت پر جلوہ افروز جامنی شرٹ والے "ساحر لودھی" کو دیکھا اور مقابلہ شروع ہوگیا۔

"یاہو! یہ ہوئی نا بات۔" پہلی کامیابی پر دونوں خوشی سے جھوم ہی تو اٹھے۔

"ارے! کوئی راجہ ہو یا مہاراجہ... ہمارے سامنے زیادہ دیر تک ٹک نہیں سکتا۔" وہ فخریہ کالر اکڑا کر بولی۔ اپنے جوش و خروش میں وہ خونخوار تیور لیے غزین کو اوپر آتا نہیں دیکھ پائے تھے۔

"کیا بے ہودگی ہے یہ؟ پورے محلے میں تم لوگوں کی آواز گونج رہی ہے۔ شرافت کے جامے میں رہنا اچھا نہیں لگتا؟"

نظریں برادران پر جمی ہوئی تھیں، لیکن در پردہ سنایا اسے جا رہا تھا۔ انہیں اچھی طرح بے عزت کرنے کے بعد وہ دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اتر گیا۔

"تم لوگ تو اپنے اس جنگ جو بھائی کے سامنے بالکل بھیگے بلے بن جاتے ہو۔" غزین کے جانے کے بعد وہ ان دونوں پر چڑھ دوڑی۔

"تو اس جنگ جو کے سامنے "جھانسی کی رانی" کی بولتی بھی تو بند ہو جاتی ہے۔" حمزہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تو وہ اسے بری طرح گھور کر رہ گئی۔

✲ ✲ ✲

دل نے کچن میں جاکر چائے کے دو کپ تیار کیے اور نور پھپھو کے کمرے میں چلی آئی۔ ان کے سامنے

"زوواجیات" کھلی ہوئی تھی، لیکن نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

"پتا ہے پھپھو! مجھے بیویوں پر ہاتھ اٹھانے والے مرد زہر لگتے ہیں۔" وہ کتاب کے صفحے الٹ پلٹ کرتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔

"اور جب میں سوچتی ہوں کہ فاروق انکل آپ کو کتنی بے دردی سے مارتے ہوں گے تو میرا دل چاہتا ہے کہ۔۔۔"

"لیکن دل! فاروق نے تو کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔" وہ جلدی سے بول پڑی تھیں۔

"خیر! جو ہاتھ نہیں اٹھاتے، وہ زبان کے جوہر دکھا کر یہ کمی پوری کرلیتے ہیں۔" وہ انہیں کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں! فاروق کو گالیاں دینے کی بالکل عادت نہیں ہے۔" اس بار بھی جواب اس کی توقع کے عین مطابق آیا تھا۔ ہونٹوں پر اٹھ آنے والی مسکراہٹ کو اس نے بہت مہارت سے چھپالیا۔ وہ ایم اے نفسیات تھی اور نور پھپھو کی نفسیاتی ڈور کو سلجھانے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

"بدمزاج شوہر کس طرح اپنی بیویوں کی زندگی اجیرن کرکے رکھ دیتے ہیں۔" اس پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد دل وہاں سے اٹھ گئی لیکن اس کی باتوں نے نور پھپھو کے ذہن میں سوچوں کا ایک نیا روزن کھول دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج چاچی راشدہ کے سپوت نمبر دو حیدر کو آنا تھا۔ وہ تعلیم کے سلسلہ میں مظفر گڑھ اپنی ننھیال ٹھہرا ہوا تھا۔ بی ایس سی کے پیپرز دینے کے بعد وہ چھٹیوں میں گھر آرہا تھا۔ چاچی مشین لگا کر میلے کپڑے دھونے کے ساتھ ساتھ بیٹے کی پسند کا کھانا بھی تیار کررہی تھیں۔ وقت کافی گزر چکا تھا اور ان کے دونوں کام "بوجہ ازلی سستی" پایہ تکمیل تک پہنچتے نظر نہیں آرہے تھے۔ دل کھانا پکانے میں تو ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ گیلے کپڑے چھت پر پھیلا... لیے ان کے کہے بغیر ٹوکری اٹھالی۔ جوں ہی وہ... کپڑا تار پر پھیلا کر سیدھی ہوئی ایک زوردار پتھر... کمر پر آلگا۔

"اف!" وہ جلبلا کر پیچھے مڑی۔ سامنے والی... پر "ساحر لودھی" بتیسی کی نمائش کرتا دکھائی دیا... نے جھک کر میں لپٹے رقعے کو کھولا۔

وے کے آواز مجھے پاس بلالو اپنے
اب مزادور کے خاموش اشاروں میں نہیں

انتہائی خراب رائٹنگ میں لکھا یہ شعر ... سرتاپا سلگ گیا۔ وہ خط مٹھی میں دبائے دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری اور دروازے کی طرف لپکی۔

"دل! کہاں جارہی ہو بیٹا؟" دادی نے تسبیح رو... اس سے پوچھا۔

"ابھی آئی دادی!" وہ چھپاک سے باہر نکل گئی۔

راجہ کی والدہ ماجدہ اپنی ساس کے ساتھ ہو... والے زبردست "معرکے" کے بعد اب ساگ... گھٹڑ سے نبرد آزما تھیں۔ ساگ پر چھری یوں... جارہی تھی گویا وہ ساگ نہیں، ساس کی گردن ہو۔

"خالہ جی! آپ کے بیٹے کی عمر کیا ہے؟"

چھری ایک طرف رکھ کر آستینیں چڑھائے... پائنچوں اور چہرے پر بکھری لٹوں والی اس نووارد... حیرت سے تکنے لگیں۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"مطلب یہ کہ اگر آپ کا کاکا خوب صورت لڑکی... کو رقعے لکھ لکھ کر بھیج رہا ہے تو اس کا مطلب یہ... کاکا اب خیر سے جوان ہوگیا ہے۔ اب اس کی شادی... دینی چاہیے۔ ورنہ کوئی عقل کی اندھی لے... اڑے گی۔ ایسی نوبت آنے سے پہلے اپنے ساحر لو... کو کسی مضبوط کھونٹے سے باندھ دیں۔" اس نے... سمیت رقعہ ان کی گود میں ڈال دیا۔

"بے غیرتے کی لکھائی تو اپنے باپ پر گئی ہے... کے رقعے بھی اکثر مجھے ایسے ہی "وخت" میں ڈا... دیتے تھے۔" والدہ ماجدہ کو یقیناً اپنا سنہری دو...

آرہا تھا۔

"اے لڑکی! تیری ہمت کیسے ہوئی میرے پوتے کو اس ڈرائیور کی شکل والے سے ملانے کی۔۔۔؟" چلبلی بانڈے "دکھتا ہے میرا پوتا اپنے دادے کی طرح۔" محترم کی دادی انتہائی جارحانہ تیور لیے کسی کمرے سے برآمد ہوئی تھیں۔ چہرے پر بہو سے ہونے والی جنگ میں شکست کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

"پڑوسی ملک کی فلم نگری سے ایسی باخبری۔" دل عش عش کر اٹھی۔ وقت نہیں تھا ورنہ ان کی پیٹھ پر ایک آدھ تھپکی تو ضرور ہی دیتی۔

"ارے آپا! آپ نے تو واقعی کمال کردیا۔ راجہ تو آج تک سیکڑوں رقعے یہاں وہاں کی چھتوں پر پھینک کر ضائع کرچکا ہے، لیکن کسی مائی کی لال پیلی نے اس کی ماں تک اس کے "دلی جذبات" پہنچانے کی ہمت نہیں کی اور آپ نے تو ایک ہی وار میں اس کا کام آسان کردیا۔"

وہ دونوں اس کے کارنامے پر سر دھن رہے تھے اور دل ان کے درمیان گردن اکڑائے اپنی تعریفیں وصول کررہی تھی۔ واش بیسن پر منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے غزین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں آئی ہوئی ہیں ورنہ آپ کے لیے بھی گفٹ ضرور لے کر آتا۔" حیدر کے معذرت خواہانہ لہجے پر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی میں گفٹ اپنی پسند کا لیتی ہوں۔ جب موقع ملے یہاں سے شاپنگ کروا کر قرض چکا دینا۔"

کچن کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھتی چاچی جز بز ہو کر رہ گئیں۔ دل اچھی طرح جانتی تھی کہ چاچی کو حمزہ اور زین کا یوں اس کے آگے پیچھے پھرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ لیکن وہ دونوں بھی اپنے نام کے ایک ہی تھے۔ ماں کے چہرے پر پھیلے غصہ اور ناگواری کے

تاثرات کو نظر انداز کر کے "دل آپا! یہ دل آپا! وہ" کی گردان کیے جاتے اور اب تو ان سے بڑا حیدر بھی اس کے "مستاثرین" میں سے لگ رہا تھا۔ چاچی سے جب برداشت نہ ہوا تو حیدر کو کسی کام کے بہانے وہاں سے اٹھا کے ہی دم لیا۔ نجانے وہ اپنے بیٹوں کو اپنی "پرایٹی" کیوں سمجھتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو اپنے بیٹوں سے چھو کر گزرنے والی ہوا سے بھی لڑ پڑتیں۔ کبھی کبھی دل کو لگتا' وہ اتنا پیار کرتی نہیں ہیں' جتنا جتاتی ہیں۔

"تمہاری چاچی صاحبہ تو مستقبل میں اپنی بہوؤں کے لیے انتہائی خطرناک ساس ثابت ہونے والی ہیں۔"

نور پھپھو باغ میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ وہ بھی اسی طرف چلی آئی۔

"تمہیں ایسا کیوں لگا؟" انہوں نے بکائن کے پیڑ میں چھپی بھوری چڑیاں گنتے ہوئے چونک کر اس سے پوچھا۔ کتنی دیر سے وہ ان چڑیوں کو گن رہی تھیں' جو کبھی تیرہ ہوتیں تو کبھی چودہ۔ دل کے آنے پر ان کی گنتی ادھوری رہ گئی۔

"اسی فی صد مائیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہر وقت یہی خطرہ ستاتا رہتا ہے کہ کوئی "پرائی لڑکی" ان سے ان کا بیٹا چھین کر دور نہ لے جائے۔ فاروق انکل کی ماں بھی تو ایسی ہی ہوں گی۔ ان پر اپنا تسلط جمانے والی اور پیٹھ پیچھے بیوی کے خلاف کان بھرنے والی.... ہے نا؟"

دل ان کی طرف دیکھتے ہوئے پریقین لہجے میں بولی۔ نور پھپھو کچھ بے چین سی ہو گئیں۔

"کہیں انہوں نے آپ کو جلانے یا سیڑھیوں سے دھکا دینے کی کوشش تو نہیں کی؟ مجھے پتا ہے انہوں نے ضرور کوئی ایسی گھٹیا حرکت کی ہوگی۔ آپ کو اپنے گھر سے نکالنے کے لیے نجانے کتنے جتن کیے ہوں گے۔ اللہ پوچھے گا ایسی ظالم...."

"دل پلیز! نفیسہ خالہ ایسی بالکل نہیں ہیں' جیسا تم سوچ رہی ہو' بلکہ.... تم انہیں کچھ مت کہو۔"

اور دل اپنی دوسری کامیابی پر ازحد خوش تھی۔ ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ صحیح جا رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

دادی اور چاچی دونوں آج کہیں عبادت کے لیے جا رہی تھیں۔ اسے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا' لیکن اس نے فوراً" انکار کر دیا اور اب پورے گھر میں بور ہوتی پھر رہی تھی۔ زین اور حمزہ لاؤنج میں کارڈز کھیل رہے تھے۔

"دل آپا! بور ہو رہی ہیں تو کوئی اچھی سی مووی لگا لیں۔" حمزہ کے مشورے کو شرف قبولیت بخشتے وہ ڈی وی ڈی آن کر کے صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

"میں اس وقت تمہاری فیورٹ فلم دیکھ رہی ہوں۔"

اس نے افشی کو ٹیکسٹ بھیج دیا۔ وہاں سے بھی فوراً" جواب موصول ہوا تھا۔ وہ دونوں بھی اپنا کھیل چھوڑ کر فلم کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ لیکن دل اسکرین سے نظریں ہٹائے افشی سے چیٹنگ میں مصروف ہو گئی' البتہ گانے کی دھن پر پاؤں برابر ہل رہا تھا۔ غزین نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹا اور کھٹاک سے ٹی وی بند کر دیا۔

"محترمہ! اپنے شوق کی تکمیل کرتے وقت اتنا تو دیکھ لیا کریں کہ اس سے بچوں پر برے اثرات تو مرتب نہیں ہو رہے؟"

دل اس افتاد پر اچھل ہی تو پڑی۔ وہ اس کے چہرے پر سجے ناقابل فہم تاثرات کو نظر انداز کرتا ریموٹ اس کی جانب اچھالتا باہر نکل گیا۔ "بچے" موقع سے فائدہ اٹھا کر پہلے ہی وہاں سے کھسک چکے تھے۔

"یہ ہٹلر کا جانشین اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے آخر؟"

حیرت کم ہوئی تو خاندانی غصہ عود آیا۔ چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو چکا تھا۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"ایک محترمہ کو شادی کے دو سال بعد اپنے شوہر سے اس بات کی شدید شکایت تھی کہ وہ اپنی ماں بہنوں کے مقابلے میں اسے کم اہمیت دیتا ہے اور اسی بات کو لے کر محترمہ اپنا بسا بسایا گھر اجاڑنے پر تلی تھیں۔ کسی ماہر نفسیات نے کہا۔ میرے نزدیک آپ دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہیں' جس کا شوہر اتنا فرض شناس اور باشعور ہے۔ اگر وہ آپ کی دو سالہ رفاقت کے لیے اپنی ماں' بہنوں کی پچھلی پچیس سالہ رفاقت چھوڑ سکتا ہے تو پھر ذرا سوچیے! کل کو کسی "اور" کی محبت کی چاہ میں آپ کی محبت اور قربانیوں کو صرف نظر کرنا اس کے لیے کون سا مشکل ہوگا؟ محترمہ کو یہ نکتہ سمجھ میں آگیا اور آج وہ اپنے گھر نہایت خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔"

دل نے بہت توجہ اور دھیان سے نور پھپھو کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ اضطراری انداز میں ہونٹ کاٹ رہی تھیں۔

"پلیز دل! مائنڈ مت کرنا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہوں۔"

دل کی پرسوچ نظروں نے دور تک ان کا تعاقب کیا تھا۔ دادی کی زبانی وہ ساری بات جان چکی تھی۔ صرف اور صرف نور پھپھو کی جذباتیت اور نازک مزاجی کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی تھی۔ ورنہ سسرال میں چھوٹے بڑے مسئلے تو ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دل جان چکی تھی کہ لوہا ابھی بھی گرم ہے اور اس پر پڑنے والی ہر چوٹ اس بات کی گواہ ہے۔ وہ جلد از جلد فاروق انکل سے ملنا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ اس نے پائپ لگا کر سارے گھر کا فرش رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ چاچی کی طبیعت ان دنوں کچھ ناساز تھی۔

"وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا۔"

وہ زور زور سے گاتے ہوئے' گیلے پائنچے چڑھائے' دوپٹا کندھے پر ایک طرف ڈالے' مگن سی ڈرائنگ روم میں چلی آئی تاکہ پردے وغیرہ اتارے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن غزین کو آڑا ترچھا لیٹا دیکھ کر پہلے تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے اور جب اس کی شعلے برساتی نظروں نے کچھ "گڑبڑ" ہونے کا اشارہ دیا تو وہ بوکھلا کر پیچھے پلٹی اور سرپٹ دوڑ کر دادی کے کمرے میں جا کر ہی دم لیا۔

"اف! یہ کیا ہو گیا؟ اب تو یہ ہلاکو خان مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" اسے ابھی سے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اب مجھے الہام تو نہیں ہوا تھا کہ اندر جناب کے لو فردوست آئے بیٹھے ہیں ایک تو پکا پکا "عمران ہاشمی" لگ رہا تھا۔ اگر میں نے غیرارادتاً" انہیں موج مستیاں اڑاتے دیکھ لیا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

وہ مختلف تسلیاں دیتی خود کو بہلاتی رہی اور منتظر رہی کہ اب ڈانٹ پڑی کہ تب۔ لیکن اپنی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھتے غزین نے اسے اچھا خاصا چڑا کر رکھ دیا۔ جب برداشت نہ ہوا تو وہ اس کے سامنے خود ہی پھٹ پڑی۔

"اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں اپنی اس دن والی حرکت پر شرمندہ ہوں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے اور نہ ہی مجھے پتا تھا۔"

"میں نے کچھ کہا تم سے؟" اس کی جذباتی تقریر کو نظر انداز کر کے ابرو اچکا کر پوچھا گیا۔

"تو اس طرح دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟"

"کس طرح دیکھنے کا؟" سینے پر بازو باندھ کر فرصت سے جواب کا انتظار کیا گیا۔

وہ کچھ ٹھٹک سی گئی اور پھر کوئی جواب نہ پا کر پاؤں پٹختی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

☆ ☆ ☆

اس بار حیدر واپس آیا تو اس کے ساتھ بڑی خالہ کی روزنہ بھی تھی۔ چاچی اپنی بھانجی کے سامنے بچھی

جارہی تھیں۔ انہوں نے غزین کے لیے روزینہ کا سوچا ہوا تھا اور اب اس کی یہاں آمد بھی اس مقصد کا شاخسانہ تھی۔ ماڈرن ازم کا چلتا پھرتا شاہکار۔ اپنے تراشیدہ بالوں کو ایک ادا سے جھٹکتی اور ناک چڑھا کر گفتگو کرتی روزی اسے بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

"فیری وِد آؤٹ فیدرز۔" حمزہ اور زین نے بے لاگ تبصرہ کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اوئے! خبردار جو اسے فیری کہا تو۔" پھر ہنسی روک کر انہیں تنبیہہ کی۔

"وِد آؤٹ فیدرز۔" دونوں ایک ساتھ ہاتھ اٹھا کر بولے تھے۔ دل کو ایک بار پھر ہنسی آنے لگی۔ مشرق کی طرف سے کالی گھنگھور گھٹائیں اونٹوں کی قطار کی مانند چلی آرہی تھیں۔ وہ باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں میں سے درمیانی کھڑکی کھول کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ نظر بلاارادہ خوش گپیوں میں مصروف غزین اور روزینہ پر اٹھی تھی۔ اس کی ساری حسیں ایک دم بیدار ہوگئیں۔

"پرکٹی کبوتری کی حرکتیں دیکھ کر تو یوں لگتا ہے' گویا حال ہی میں امریکا سے واپس آئی ہو اور محترم کی "ٹام کروز" کی طرح باچھیں تو یوں چری جارہی ہیں گویا پہلی بار کسی لڑکی سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ یا پھر سامنے کوئی "انجلینا جولی" ہی تو بیٹھی ہو...." کان لگا کر باتیں سننے کی کوشش کی' لیکن ایک لفظ بھی پلے نہ پڑا۔

"محترمہ سے یہ مٹھی بھر بال نہیں سنبھالے جارہے۔ ہونہہ! زلفوں کے جال میں پھنسانے کی چیپ حرکتیں۔"

روزی اپنے بالوں کو کیچر کی قید سے آزاد کر کے اب ایک ادا سے ان میں انگلیاں چلا رہی تھی اور دل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہاں جا کر اس کے بالوں کو اس طرح پونی میں کسے کہ سارے کس بل نکل جائیں۔

"چاچی صاحبہ ویسے تو ہر وقت ڈکٹیٹر بنی رہتی ہیں۔ جب پیاری بھانجی ہونہار سپوت کو اپنے ساتھ لے کر نو دو گیارہ ہوجائے گی تب پتا چلے گا۔" اس کا دل چاہ رہا تھا' اس روزی کی بچی کو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دے' پھر خوش اخلاقی کے ریکارڈ توڑتے غزین کو جادو کی چھڑی سے وہاں سے غائب کردے۔

ایک زوردار قہقہہ پڑا تھا اور دل کی برداشت کی حد ختم ہوگئی۔

"آپ کو دادی بلا رہی ہیں۔" دوسرے ہی پل وہ ان کے سامنے تھی۔ روزی کو یکسر نظرانداز کیے غزین سے مخاطب ہوئی۔

"کوئی کام ہے؟"

"یقیناً"۔" غزین کے ہونٹوں پر پھیلتی معنی خیز مسکراہٹ کو نظرانداز کر کے وہ ڈھیٹ بنی اس کے سر پر سوار کھڑی رہی اور غزین کے وہاں سے اٹھ کر جانے کے بعد اس نے روزینہ کے بگڑے تیوروں پر فاتحانہ نظر ڈالی اور خوشی خوشی واپس پلٹ گئی۔ البتہ وہ دیر تک اس کی وجہ جاننے سے قاصر رہی تھی۔

اور اگلے روز غزین نے بہت حیرت سے اسے "فاروق انڈسٹریز" سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

"یاخدا! کتنے روپ ہیں اس لڑکی کے۔" اس سے پہلے کہ وہ اسے آواز دیتا' وہ پہلے ہی رکشے کو روک کر اس کے اندر بیٹھ چکی تھی۔



آپا کا فون آیا تھا۔ وہ سب اس کے لیے بہت اداس ہورہی تھیں۔ خاص طور پر امی۔ جتنا اس کی حرکتوں سے چڑتی تھیں' اتنا ہی اس کے بغیر سارے گھر میں بولائی بولائی پھرتی رہتیں۔ آپا اور افشی کے رشتے بڑے ماموں کے بیٹوں سے طے تھے اور اب گھر میں ان کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہورہی تھیں۔ بہت جلد گھر واپس آنے کی یقین دہانی کروا کے اس نے فون بند کردیا۔ دادی تو اس کے جانے کا سن کر ہی اداس ہوگئی تھیں۔ انہیں اپنی اس نٹ کھٹ پوتی سے خاص لگاؤ تھا۔

"زیادہ افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب

بھی یاد کریں گی' اسی وقت حاضر ہو جاؤں گی' بلکہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہیں آپ کے پاس رہ جاؤں۔" دل ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے لاڈ سے بولی۔

"دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔" وہ ایک آہ بھر کر رہ گئیں۔ حمزہ اور زین نجانے کس بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

"اچھا دل آپا! آپ بتائیں' غزین بھائی کی آنکھیں کس سے ملتی ہیں؟"

"فواد عالم سے۔" سر اٹھائے بغیر سرعت سے جواب دیا تھا۔ روزینہ کے ساتھ باتوں میں مصروف غزین نے کچھ چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اب فیشن میگزین پر جھکی ہوئی تھی۔ غزین کی بے توجہی محسوس کرکے روزینہ منہ بناتی وہاں سے اٹھ گئی۔

چاچی کے لیے لاڈلی بھانجی کے تیور خاصی پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ایک دن اخبار کے مطالعہ میں مگن غزین کو جالیا۔

"غزین۔ بیٹا! روزینہ کو کہیں گھما کر لاؤ۔ بے چاری جب سے آئی ہے' گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔"

حمزہ اور زین کے کان کھڑے ہوگئے اور غزین کو جانے کے لیے آمادہ دیکھ کر چھت کی طرف دوڑے۔ جہاں دل منڈیر پر کبوتروں کے کٹورے پانی سے بھر رہی تھی۔

"دل آپا! جلدی سے نیچے آئیں۔ غزین بھائی ہم سب کو آؤٹنگ کے لیے لے جارہے ہیں۔" حمزہ نے پھولی ہوئی سانسوں سے کہا۔

"انہوں نے کہا ہے' اپنی دل آپا کو بھی بلا کر لاؤ۔" زین نے جلدی سے بات مکمل کی۔

"تمہارے بھائی کے پیروں میں مہندی لگی ہوئی ہے؟ خود کہنے نہیں آسکتے تھے؟" وہ ریلنگ پر قدرے جھک کر درشت لہجے میں بولی۔ سبز رنگ کے لباس میں نکھری نکھری روزینہ' غزین کے پہلو سے چپکی جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔

"ہائیں!" "پیروں میں مہندی والی" اصطلاح سن کر دونوں ہونق ہوگئے۔

"کچھ نہیں۔ تم لوگ جاؤ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اب کی بار لہجہ کچھ بہتر تھا۔

"اور خبردار! جو میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب کیا تو۔" انہیں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر وہ جلدی سے ڈپٹ کر بولی تھی۔ دونوں اترے چہروں کے ساتھ سیڑھیاں اتر گئے۔ دل آپا کے بغیر بھلا انہیں کہاں مزا آتا تھا۔

"بھانجی صاحبہ کا تو بہت خیال رکھا جارہا ہے اور میں جو اتنے دنوں سے آئی ہوئی ہوں۔" حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹک گیا۔

"اور مجھے اتنا افسوس کس خوشی میں ہو رہا ہے؟ میری طرف سے دونوں جائیں جہنم میں۔" وہ بری طرح خود سے چڑ گئی۔ ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں پر نظریں جمائے دیر تک وہ اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ غٹرغوں کرتے کبوتر ایک ایک کرکے منڈیر پر بیٹھنے لگے تو وہ سر جھٹک کر نیچے اتر آئی۔ اپنے دل کی کیفیت خود اس کے لیے خاصی پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی۔

"دادی! آپ کے سر میں مالش کردوں؟" وہ تیل کی کٹوری اٹھائے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم کیوں نہیں گئیں ان لوگوں کے ساتھ؟" انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"دل نہیں چاہ رہا تھا۔" آواز میں نمی گھل گئی۔ وہ دیر تک یوں ہی بے مقصد یہاں سے وہاں چکراتی رہی۔ آخر تنگ آکر دادی کے پلنگ پر ان سے لپٹ کر لیٹ گئی اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"دل آپا! سوگئیں کیا؟ ہم آپ کے لیے آئس کریم پیک کروا کے لائے تھے۔" دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔

"فریج میں رکھ دو۔ ابھی میرا کھانے کا موڈ نہیں ہے۔" بغیر بازو ہٹائے بولی۔

"نہیں نا! ابھی کھالیں۔ بعد میں خراب ہوجائے گی۔" وہ جاتے جاتے تاکید کرنا نہیں بھولے اور ان کے جانے کے بعد اس نے ساری آئس کریم ڈسٹ

بن میں پھینک دی۔

"تمہاری لائی ہوئی آئس کریم میں کھاؤں گی؟ ہونہہ۔" اس نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

☼ ☼ ☼

"میں فاروق انکل سے ملی تھی۔" نور پھپھو نے ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا۔

"کب؟ کہاں؟" وہ پوری کی پوری اس کی طرف گھوم گئیں۔

"آج۔ ان کے آفس میں۔" دل انہیں بے سکون کرکے خود بہت سکون سے بولی۔

"کیا کہا ہے انہوں نے؟" وہ سراسیمہ ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں کیا کہنا تھا۔ الٹا میں نے ان کی طبیعت صاف کر ڈالی۔"

"خدا کے لیے دل! مجھے بتاؤ' تم نے ان سے کیا کہا ہے؟" وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے چیخ اٹھی تھیں۔

"میں نے ان سے کہا ہے' اگر انہیں آپ کو اپنے گھر میں بسانا نہیں تھا تو آپ سے شادی کیوں کی؟ وہ اور ان کے گھر والے اگر آپ کو خوش نہیں رکھ سکتے تو آپ کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ آپ کو طلاق۔۔۔"

چٹاخ۔۔۔ ایک زور کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟ کس نے تمہیں اجازت دی تھی میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی؟ کوئی غلطی نہیں ہے ان لوگوں کی۔ سارا قصور میرا ہے۔ صرف میرا۔۔۔ اور تم نے تو میرا سب کچھ ختم کر ڈالا۔۔۔ سب کچھ۔" وہ روتے روتے بے دم سی ہو کر بستر پر بیٹھ گئیں اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ دل نے اپنے جلتے ہوئے رخسار کو سہلایا اور دروازے میں ایستادہ فاروق کو اندر آنے کا اشارہ کرتی خود باہر نکل گئی۔

"نور!" انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا تھا۔

"پلیز! بس کرو۔ چلو! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" وہ نرمی سے بولتے اندر آگئے تھے۔

"فاروق! مجھے معاف کردیں پلیز۔ میں بہت بری ہوں۔۔۔ بہت بری۔" وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑیں۔ فاروق نے بہت نرمی سے ان کے سارے آنسو اپنی پوروں پر چن لیے۔

"شکریہ! اچھی لڑکی۔" انہوں نے جاتے ہوئے گرم جوشی سے دل کا ہاتھ دبایا تھا۔

"شاید میں زندگی میں کبھی تمہارا یہ احسان نہیں چکا پاؤں گی۔" نور پھپھو نے بے ساختہ اس کے سرخ رخسار پر پیار کیا تھا' جس پر ابھی تک ان کی انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔

بعض اوقات بڑوں کو راہ دکھانے کے لیے چھوٹوں کو آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ دادی کی بوڑھی آنکھیں تشکر اور خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے' لیکن دل نے ان کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ چاچی نے آج اسے بہت الگ انداز میں دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

راشدہ چاچی کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہنا محال ہوگیا تھا۔ وہ دم بخود سی ریسیور سے ابھرتی آواز سنتی رہیں اور بغیر کچھ کہے بے جان ہاتھوں سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ ایسا تو انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

روزینہ واپس چلی گئی تھی۔ اس نے غزین کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کردیا تھا۔ وجہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اس کا کہنا تھا وہ کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کرسکتی' جس کی ماں اس کے لیے حد سے زیادہ "ٹچی" ہو۔ وہ اپنے بیٹے کی توجہ اور محبت میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کرسکتیں۔ تو پھر وہ شادی کے بعد اسے اپنی بیوی کا کیسے ہونے دیں گی؟

ان کی سگی بھانجی نے جو آئینہ ان کے سامنے رکھا تو اپنی صورت دیکھنا بہت مشکل ہوگیا۔ ہمارا غیر متوازن

رویہ دوسروں کی زندگیوں پر اثر انداز ہو کر کس طرح ان کے سوچنے کے انداز کو بدل دیتا ہے۔ ہم یہ سب سوچنے کا عموماً" تردد نہیں کرتے' بلکہ اپنی فطرت اور عادات پر محمول کر کے خود کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب وہ سگی بھانجی ہو کر ایسا سوچ سکتی ہے تو کوئی دوسری کیونکر نبھا کر پائے گی؟ آج وہ پہلی بار خود احتسابی کے عمل سے گزر رہی تھیں اور ان کی سوچ کا جگنو انہیں نئی راہ دکھا رہا تھا جو بہت روشن اور صاف تھی۔

☼ ☼ ☼

دل کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور آج اسے اپنے گھر چلے جانا تھا۔ وہ بہت بجھے دل کے ساتھ اپنا سامان بیگ میں ٹھونستی جا رہی تھی۔ آنکھیں برس جانے کو بے تاب تھیں' لیکن وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو راز اس پر عیاں ہوا تھا' وہ اس کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ اس بار دادی اس کے واپس جانے پر نہ تو افسردہ تھیں اور نہ ہی اداس' بلکہ ایک مبہم سی مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا اور یہ بات دل کے لیے نہایت اچنبھے کا باعث تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اتنی صبح سویرے خالی پیٹ روانہ ہونے کی۔ میں نے غزین سے کہہ دیا ہے دوپہر کا کھانا کھا کر جانا تم لوگ۔"

اور جہاں چاچی کی اچانک امڈ آنے والی محبت نے اسے حیران پریشان کر دیا تھا' وہاں حمزہ اور زین کی معنی خیز باتیں اور اشارے اسے کسی گڑبڑ کا سگنل دے رہے تھے۔ لیکن وہ کوئی بھی سرا پکڑنے میں ناکام رہی تھی۔

وہ بہت بوجھل دل کے ساتھ غزین کی جیپ میں آ بیٹھی۔ دادی' چاچی' حمزہ اور زین دیر تک دروازے پر کھڑے اسے ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتے رہے۔

"یہ سب میرے جانے پر اتنا خوش کیوں ہو رہے ہیں؟ شاید تنگ آ گئے تھے مجھ سے۔" وہ آنسو روکنے کی کوشش میں سرخ چہرہ لیے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھ رہی تھی۔

"سنو! میں ہر چھ ماہ بعد انجام دی جانے والی اس "پک اینڈ ڈراپ" ڈیوٹی سے تنگ آ گیا ہوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ...." وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"بس یہی تیر رہتا تھا ابھی ترکش میں۔ ایک میں ہوں جو پاگلوں کی طرح بھاگ بھاگ کر ان کے پاس جاتی ہوں اور یہ سب مجھ سے پیچھا چھڑوانے کے چکروں میں ہیں۔" کب کے رکے آنسو اچانک راستہ پا کے بہہ نکلے تھے۔

"ارے! تم نے تو ابھی سے رونا شروع کر دیا۔ پہلے فیصلہ تو سن لو۔"

وہ ناراضی کے اظہار کے طور پر رخ موڑے جوں کی توں بیٹھی رہی۔

"تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے ہاں لے آنے کا فیصلہ۔"

وہ پوری کی پوری اس کی طرف گھوم گئی۔ غزین کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ لیکن آنکھیں تو کچھ اور ہی کہانیاں سنا رہی تھیں۔

"اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو؟ اس دن خود ہی تو کہہ رہی تھیں' میرا دل چاہتا ہے' ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤں۔"

"وہ میں نے دادی کے لیے کہا تھا۔"

"لیکن دادی تو اپنے لیے نہیں کہہ رہی تھیں۔"

"دو گھنٹے کے سفر میں اتنی باتیں سنا ڈالی تھیں۔ اختیار مل گیا تو پھانسی پر چڑھانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔" سوں سوں کرتے ہوئی بولی۔ نظر اٹھا کر دیکھنے سے ابھی بھی گریز کیا تھا۔

"کیا.... اتنا ظالم سمجھتی ہو مجھے؟" وہ مصنوعی صدمے کے زیر اثر بولا۔ گاڑی کی رفتار بہت آہستہ کر دی تھی۔

"خبطی' جذباتی' بے وقوف اور سرپھری آپ مجھے سمجھتے ہیں۔" وہ انگلی اٹھا کر یاد دہانی کروانے لگی۔

"اچھا! تو پھر "مسٹو" "کڑو" "جنگ جو" "ہلاکو خان اور سال میں ایک بار مسکرانے والا" کس نے کہا تھا؟ ہاں!" وہ بھی اسی کے انداز میں انگلیوں پر ایک ایک کر کے گنواتے ہوئے بولا۔ شرمندگی کے مارے اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔

"سب سے پہلے تو ان حمزہ اور زین کے بچوں کی چٹنی بناؤں گی۔ غدار کہیں کے۔" اس کے انتقامی جذبات بیدار ہونے لگے تھے۔

"آپ نے حمزہ اور زین کے سامنے میری دو بار بے عزتی کی تھی۔" شکووں کی پٹاری میں سے ایک اور شکوہ برآمد ہوا تھا۔

"اتنا کچھ نظر آ گیا' بس "فواد عالم" جیسی آنکھوں میں اپنے لیے مچلتے جذبات نظر نہیں آئے۔"

"اف! اس شخص کو تو سی آئی ڈی میں ہونا چاہیے تھا۔"

"بس یا کچھ اور؟" غزین نے اس کے جھکے سر کو بغور دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔

"ہاں یاد آیا۔ آپ اس دن اس پر کٹی کبوتری کے ساتھ اتنا ہنس ہنس کر باتیں کیوں کر رہے تھے؟" غزین کراہ کر رہ گیا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس دن "ہنسنا" میرے شیڈول میں نہیں تھا۔"

"جی نہیں! کھڑکی سے میں نے خود دیکھا تھا۔ آپ دونوں پورے چالیس منٹ اور پچیس سیکنڈ باتیں کرتے رہے تھے اور کچھ خطرناک قسم کے قہقہے بھی لگائے تھے۔"

غزین اپنے بے ساختہ قہقہے کو روک نہ پایا اور دل لبابی کو ہمیشہ کی طرح بولنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ حماقت کا ایک اور عظیم الشان مظاہرہ کر چکی ہے۔

"جس وقت مجھے کچھ جلنے کی بو تو آ رہی تھی' لیکن خدا قسم مجھے نہیں جانتا تھا کہ "دل" جل رہا ہے۔ ورنہ اسی وقت اس "پر کٹی کبوتری" کا ہاتھ پکڑ کر چلتا کر دیتا کہ بی بی! جاؤ یہاں سے۔ میرے "دل" کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

"اچھا! گاڑی ذرا تیز چلائیں نا! اب تو وہ گدھا گاڑی والا بھی ہم سے آگے نکل گیا ہے۔" دل اس کی نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر جلدی سے بول پڑی تو غزین قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

اور دل کے آس پاس خوشیاں گھنگھرو بن کر بجنے لگی تھیں۔

☼

سائرہ رضا

محبت کا ماحصل بندگی ہے

اس کمرے کی ہر شے سے بوسیدگی نمایاں ہو رہی تھی۔ چھتوں کے کونے میں جالے، لکڑی کے پرانی طرز کے دوپٹ دروازے اور کھڑکیاں، دروازوں کا ہلکا براؤن رنگ کہیں کہیں ہی دکھائی دے رہا تھا۔ دیواروں پر یاسیت بھرا زرد رنگ۔

دروازہ کھلتے ہی عجیب سے ناگوار بھبکے نے استقبال کیا تھا۔ دھول اور مٹی نے اسے کھانسنے اور متواتر چھینکوں پر مجبور کر دیا تھا، اس کے رہنما اور میزبان نے روشنی کے لیے بلب کا پرانا کالا ٹک بٹن دبایا تو پیلی روشنی نے کمرے کی پراسراریت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

"میں نے دس دن کی محنت سے یہ چند فائلز نکالی ہیں۔ اتفاق سے ان سب میں تصاویر ہیں۔ ان میں ایک لڑکی تھی۔ اور دوسرا لڑکا عمر وہ آٹھ برس تک کی عمر کا ہے۔ یہ یعنی چودہ پندرہ سے بہت کم، آپ خود پر توجہ فرمائیں۔"

اس کا میزبان، کلرک کم نگران کم چوکیدار الماریاں ٹٹول کر دھول مٹی سے بے نیاز گھومنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ جس کا فوم ادھڑا ہوا تھا۔

اس نے فقط سر ہلایا۔ وہ مضطرب تھا اس نے جبڑے سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ آنے والا پل۔ وہ کئی سالوں سے مسلسل تلاش میں تھا۔ مسلسل سفر۔ اس کی

مکمل ناول





مستقل مزاجی قابل ستائش تھی یا جنون۔

وہ نہیں جانتا تھا اور نہ اس نے کبھی سوچا تھا کہ۔ جس تلاش میں وہ اپنا وقت، پیسہ، ذہانت، دھیان اور تمام تر صلاحیتیں استعمال کر رہا تھا۔ وہ اس کا کرے گا کیا؟ اسے بس ڈھونڈنا تھا۔ ایک بار بس۔

"آپ اتنی محنت سے نجانے کب سے تلاش کر رہے ہیں تو جانتے ہی ہوں گے۔ میرا بتانا فضول ہے۔ مگر میرا نہیں خیال کہ وہ ..." نگران ذرا سا اٹکا۔ "کہ وہ زندہ ہوگا۔"

ورق پلٹتے اس کے ہاتھ رک گئے اس نے بے ساختہ نگران کا چہرہ دیکھا اور اس کی آنکھوں میں درشتی ناگواری اور شدید ترین غصہ عود کر آیا تھا۔

"دراصل۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ جتنے سال پرانی بات بتا رہے ہیں۔ ایسے ... یہ لوگ زیادہ عمر نہیں پاتے۔ بارہ چودہ حد ہوئی تو بیس ..."

"اگر وہ مر گیا ہے تو بھی مجھے معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں دفنایا گیا؟ کب مرا؟ کیسے مرا؟ اور جب تک زندہ رہا کہاں رہا؟ کیسے رہا؟" اس کی بات کاٹ کر وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

"آپ جمع کروانے والے شخص کا نام بھی نہیں بتاتے۔ ورنہ اس سے بھی بڑی مدد ملتی۔"

"اس شخص نے خود نہیں جمع کروایا تھا۔" اس نے آخری فائل بند کر دی۔ "اس نے یقیناً" کسی اور سے یہ کام لیا تھا۔ اور میں اس شخص کے بارے میں نہیں جانتا۔ اور جو جانتا تھا، وہ بھی مر چکا ہے۔" اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

"آپ اگر صرف اس جگہ کا صحیح نام بتا دیتے کہ کس شہر کے کس ادارے میں بچہ بھیجا گیا تو سو فیصد چانس تھا کہ آپ کامیاب رہتے۔ مگر ایسے۔" نگران نے بہت تفصیل سے اسے پہلے کی بتائی باتیں دوبارہ بتائیں۔

وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر اب آنکھیں اور ناک صاف کر رہا تھا اس کی خوب صورت سنہری آنکھیں، سرخی مائل تھیں اور کھڑی ناک کی نوک سرخ ہو چکی تھی۔

اس کا دراز قد، چہرے کی خوبصورتی اور وقار اور مغرور ابرو مقابل کو زیر کرتے تھے۔

اسے یونہی خیال آیا کہ وہ مرد ہو کر اس قدر متاثر ہو رہا ہے تو صنف نازک کیا محسوس کرتی ہوں گی۔ اپنے خیال کو جھٹک کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا جواب رخصت کو تیار تھا۔

"میں نے آپ کو لکھ کر تو دیا تھا۔ شاہ گوٹھ میں کوئی یتیم خانہ یا ایدھی سینٹر یا اس طرح کی دوسری چیز نہیں تھی۔ حیدر آباد میں تھی۔ مگر وہ بہت دور پڑتا ہے شاہ گوٹھ سے، وہ اسے صبح صبح لے گئے تھے اور دوپہر کا کھانا واپس آکر کھایا تھا۔ ان کی گاڑی چار بجے شام کو پہنچی تھی، اس سے ثابت ہوا کہ وہ اسی سرکل میں کہیں چھوڑا گیا تھا۔"

"آپ کچھ پوائنٹس تو دیں بچے کی ماں اگر کوئی نشانی یا۔"

گفتگو کے وقت اس کی آنکھوں میں تاثرات بھر گئے تھے۔ لفظ "ماں" پر زخمی سی لہر آرکی۔ اس نے تیزی سے کہا۔

"وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں نے بتایا تھا آپ کو۔" اس کے لہجے میں درشتی سی آئی۔

"اوہ۔!"

"اجازت۔"

نگران اسے دروازے تک چھوڑنے آگیا تھا۔ اب اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ اسے لمبا سفر کر کے واپس لوٹنا تھا۔

آنکھوں پر گاگلز چڑھاتے ہوئے وہ دروازہ کھول چکا تھا۔ جب نگران نے اسے نام سے پکارا۔ وہ مڑا نہیں مگر رک گیا۔ نگران خود سامنے آگیا۔

"اتنے سال سے اس ویرانے میں رجسٹروں میں اندراج کرتا ہوں۔ یہاں بہت لوگ آتے ہیں۔ طرح طرح کی وجوہات سے۔ مطلب سے۔ مگر میرا اندازہ ہے۔ آپ غرض مند تو ہیں مگر یہاں تک مشکل اور لمبا سفر آپ نے غرض سے نہیں درد سے کیا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا۔"

نگران کا لہجہ سچائی کا مظہر تھا اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے بھی گرمجوشی سے اپنا ہاتھ آگے کیا اور شکر کیا وہ آنکھوں کو گاگلز میں چھپا چکا تھا ورنہ۔ غرض۔ اور۔ ہاں۔

☼ ☼ ☼

شہر کے اس پوش علاقے کی اس سڑک پر آمنے سامنے بنے بنگلوں کی قطاریں اپنے مکینوں کی خوش ذوقی اور حیثیت کا تعین کرتی تھیں۔ قیمتی پتھر۔ ٹائلز، بالکونی اور ان میں سجے آرائشی پھول بوٹے، قیمتی لکڑی کے منقش دروازے اور سیاہ شیشے والی کھڑکیاں۔

سب ایک سے بڑھ کر ایک۔ مگر دائیں جانب کا وہ تیسرا گھر۔ سب سے نمایاں اور خوبصورت تھا۔

عمارت کی اہم چیز جو اسے سب سے ممتاز کرتی تھی وہ اس کا ہر جانب سے سبزے میں ڈھکا ہونا تھا۔ لمبے سیدھے درخت ایک قطار میں کھڑے تھے اور ایک ہی قامت کے تھے۔ ہلکی انگوری دیواروں پر گہرے سبز رنگ کی بیلیں لدی پڑی تھیں۔ باقاعدہ ایک شکل اور ان گہرے اور ہلکے سبز رنگ کے تناسب کو مجروح نہیں ہونے دیا گیا۔ بیلوں پر لٹکے پھولوں کے گچھے ایک مستقل خوشبو۔

اور اگر براؤن مین گیٹ سے جھک کر اندر نگاہ دوڑائی جاتی تو اندر سارا سال بہار اپنے جوبن پر رہتی۔ تراشیدہ گھاس، جیسے کسی نے سبز چادر پھیلا رکھی ہو اور اس پر دنیا جہان کے پھولوں کے پودے، قیمتی اور نایاب رنگ چھوٹے پھول پتے اور ان سے پھوٹتی انوکھی خوشبوئیں۔

جھکی کمر والا مالی کیاریوں سے ٹوٹے مسلے پتے اکٹھا کر رہا تھا تب ہی گھر کا مرکزی منقش لکڑی کا دروازہ کھلا اور ماتکر۔ باہر آئی۔

ہاں اس گھر کے مکین کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، شاید کوئی دوسرا۔ اتنا سج نہ سکتا۔ کبھی نہیں۔

وہ کافی براؤن رنگ کے ٹراؤزر پر گہرے بسکٹی رنگ کی لمبی سیدھی قمیص میں ملبوس تھی۔ ان ہی دو رنگوں کے امتزاج سے بنی پھولوں والی شال دائیں کندھے پر ٹکی تھی۔ اس نے لمبی سانسیں کھینچ کر بارش کے بعد کی خوشبو اور تازہ دھوپ کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ ایک آسودگی، طمانیت اور خوشی خوبصورت چہرے پر ناچنے لگی۔

اس کی نگاہیں چار جانب گھومنے لگیں۔ سب کچھ اپنے معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔

سامنے کھڑی ایک گاڑی۔ ہاں۔ اس کا شوہر وقت کا پابند تھا۔ وہ جا چکا تھا اور وہ۔ گزری رات عجب تھی۔ وہ کمبل میں چھپی نجانے کیا کیا سوچتی رہی بارش کا شور اور بادلوں کی گھن گرج۔ اس کا دل سہما سہما رہا۔ اس نے

اپنے شوہر کی سمت دیکھا۔ وہ مکمل طور پر کمبل میں چھپا ہوا تھا' صرف ذرا سا ماتھا اور ابرو دکھائی دیتی تھیں۔ ابرو کے کمان۔ مغرور۔ مقابل کو احساس کمتری میں مبتلا کردینے والے۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اور اس سوچ نے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑادی۔ (کوئی شخص اتنی بے فکری سے کیسے سو سکتا ہے) اس نے خود سے سوال کیا۔ بادل بہت زور سے گرجے تو ایک فوری خیال کے تحت وہ سرعت سے مگر چاپ پیدا کیے بنا کمبل سرکا کر کھڑی ہوگئی۔

اس نے کمرے سے نکلنے سے پہلے سوچا جب وہ صبح اس کو کمرے میں نہیں پائے گا تو بہت خفا ہوگا۔ وہ اسے ضرور ڈانٹے گا کہ وہ پھر بیٹے کے کمرے میں سوئی ہے جب وہاں ایک آیا موجود ہے تو وہ کیوں بھاگ بھاگ مامتا جتانے جاتی ہے۔ "بس تھوڑی دیر کے لیے" اس نے سوچا۔

وہ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں دبے قدموں مگر کسی قدر تیزی سے بیٹے کے کمرے میں داخل ہوئی۔

خدشات سے پرے اس کا بیٹا' بارش' بادلوں کی گھن گرج سے بے نیاز گہری پرسکون نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔

اس کی باپ جیسی کمان ابرو۔ مگر اس کے چہرے پر باپ جیسی بے نیازی اور تنفر نہیں تھا۔ معصومیت بھول پن اور بے تحاشا خوبصورت چہرہ۔

اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اس کے پھولے گالوں کو چوم ڈالے مگر نیند خراب ہونے کا اندیشہ۔

آیا کمرے میں گیند بنی سو رہی تھی۔ اس نے چہار اطراف نظر دوڑائی۔ اس کمرے میں دنیا کے ہر خطے سے لائی گئی اشیا موجود تھیں۔ بے حد قیمتی اشیا اونہہ! اس کے بیٹے سے بڑھ کر تو نہیں۔

اس کی نگاہ ایک بار پھر بیٹے پر ٹکی اور اس بار وہ خود کو روک نہیں پائی' بہت غیر محسوس طریقے سے اس کے کمبل کا کونہ اٹھا کر وہ چپکے سے اندر گھس گئی۔ اس نے آہستگی سے اس کے گرد بازو رکھ دیا۔

بچہ بہت گہری نیند میں تھا مگر اس نے اسی عالم میں اپنا بازو اس کے چہرے سے مس کرکے غالبا" اسے محسوس کیا۔ یہ بے ساختہ التفات۔ اس نے بچے کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بے آواز بوسہ لیا۔ گھڑی سوا تین بجا رہی تھی۔ جب وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

اور اب صبح دس بجے آنکھ کھلی۔ ایسی بے خبری کی گہری پرسکون نیند۔ وہ ہلکی پھلکی سی بے حد فریش ایک اجلی صبح سے لطف اندوز ہوتے لان میں آگئی۔ اسے ابھی نہا کر کپڑے بدلنے تھے مگر بچے کو بھوک لگی تھی۔ آیا اسے تیار کروا کر لارہی تھی۔ وہ خانساماں کو ناشتہ باہر ہی لانے کا کہہ آئی تھی۔

منقش دروازہ وا ہوا۔ آیا اس کے بیٹے کی چیئر گھسیٹتی باہر نکل رہی تھی۔

"تم جاؤ' فریش ہوکر ناشتہ وغیرہ کرو اور یہ گیلے کپڑے چینج کرو' ٹھنڈ لگ جائے گی۔ اسے میں خود ناشتہ کروادوں گی۔" اس نے چیئر تھام لی۔

آیا اس کے بیٹے کو نہلانے اور کپڑے بدلوانے میں خوب ہلکان ہوتی تھی اور بھیگ جاتی تھی' اس کے حکم پر متشکر مسکراتی نگاہوں سے پلٹ گئی۔

خانساماں نے تپائی پر ناشتہ چن دیا۔ آملیٹ' شہد بریڈ اور چائے۔ گرم گرم دھواں اڑاتا نوڈلز کا پیالہ۔ ابلے انڈے اور چکن اسپریڈ۔ دودھ کا گلاس اور جوس۔ اس کا بیٹا کچھ بھی مانگ سکتا تھا۔

"اور بوائل ایگ بھی۔" اس نے پلیٹ آگے کی۔ انڈے صفائی سے کٹے تھے اور ان پر غیر محسوس سا نمک کالی مرچ چھڑکا ہوا تھا۔

"اوہ۔ ہوں۔ ناں۔ ناں۔" اس کے بیٹے کو بوائل ایگ پسند تھا مگر وہ چیئر پر ہاتھ مارتا اپنی ناگواری بتا رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ "ارے" اسے دھیان آیا۔ "انڈے کاٹ کیوں دیے کوئی ثابت بوائل ایگ ہے تو فورا" لاؤ۔ اور یہ لے جاؤ اور ثابت گرم مسالے کا ڈبہ بھی لانا۔ یہ بگڑ گیا تو کچھ بھی نہیں کھائے گا۔ ساری محنت اکارت۔ جلدی۔"

ملازمہ عندیہ سمجھ گئی۔ سرپٹ دوڑی۔

"ہاں ہاں بابا! ابھی بس دو منٹ ابھی ہمٹی ڈمٹی بنائیں گے۔"

بچہ سر ہلا ہلا کر اپنی خوشی بتانے لگا۔ پھر یکدم رک کر آنے والی ملازمہ کو دیکھنے لگا۔ ہاتھ میں ثابت ابلے انڈے تھے۔ وہ نظم گانا چھوڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی اس نے انڈے کو لمبائی رخ درمیان سے کاٹا۔ گرم مسالے کے ڈبے سے دو کالی مرچ نکال کر آنکھیں بنائیں لونگ ناک کی جگہ۔ لمبی سی گاڑ دی۔ کیچ اپ میں الٹا چمچ ڈبو کر نکالا اور ہونٹوں کا نشان بنادیا۔ ہمٹی ڈمٹی کی گول مٹول بونے سر والی شکل تیار تھی۔ اس کے بیٹے نے سرشار ہوکر تالی پیٹی۔ وہ خوشی سے لوٹ پوٹ ہوگیا تھا۔

اسے کھانا کھلانا مشکل کام تھا۔ اس کام کے لیے آیا تھی۔ مگر وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ایک وقت کا کھانا اسے اپنے ہاتھ سے ضرور کھلاتی تھی۔

اپنے بچے کو کھاتا دیکھنا' بڑھتا دیکھنا کتنا خوب صورت ہوتا ہے ناں۔

اس کا ناشتہ ٹھنڈا ہوچکا تھا مگر وہ مگن تھی۔

وہ ایک چمچ بیٹے کے منہ میں دیتی۔ ایک ہمٹی ڈمٹی کے ہونٹوں سے لگاتی۔ بعض اوقات بیٹے کے اشارے پر اسے اپنے منہ میں ہی ایک چمچ ڈالنا پڑتا تھا۔ ایسی منصفانہ تقسیم پر بچہ خوشی سے ہنستا تو وہ سحر زدہ سی اسے دیکھتی رہ جاتی۔

مائیں بچوں کو ایسے ہی لاڈ پچکار اور بہانوں سے کھلاتی پلاتی ہیں۔

لیکن اگر بچہ عون جیسا ہو۔ تو۔ ؟؟؟۔

گورا چٹا۔ تندرست و توانا۔ مغرور ابرو۔ اٹھی ناک کے ساتھ خوبصورت معصوم بے ریا آنکھیں ہلکی نیلی جینز اور پیروں میں جوگرز۔

وہ اپنی عمر کے بچوں سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ مگر پھر بھی ماں کے ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا۔ وہ سات برس کا تھا۔ پھر ایسے کیوں؟ ہاں وہ چیئر پر بیٹھا تھا۔

مگر وہ وہیل چیئر تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں پر اتنے موٹے شیشے کا چشمہ تھا کہ ان سے آنکھیں یوں جھلکتیں گویا ابلی پڑی ہوں۔

اس کی ساری صحت۔ بس گوشت کے ڈھیر کی صورت تھی ورنہ اگر بات توانائی کی کرتے تو وہ اپنا ہاتھ اپنے سر تک بھی بلند نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی گردن عام طور پر دائیں بائیں ڈھلکی رہتی ہاں کھانا کھلاتے وقت اسے وہیل چیئر کے بنائے ہوئے ہیڈ سپورٹ میں ٹھہرا دیا جاتا۔ یہ وہیل چیئر اس کی ضروریات کے حساب سے آرڈر پر ڈالرز میں رقم ادا کرکے امریکہ سے بنوائی گئی ہے۔ اس کی آنکھوں سے اکثر پانی بہتا ہے اور منہ سے رال۔ اس کے کانوں میں آلہ سماعت لگا ہے۔ وہ چند لفظوں کے علاوہ بولنا نہیں جانتا۔ اوں نہ' ناں' ہاں' چہرے پہچانتا ہے۔ آیا کا چہرہ۔ باپ کا چہرہ۔ مگر وہ باپ سے گھبراتا ہے اور اس کی موجودگی میں سراسیمہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنی مچھلیوں میں خوش رہتا ہے اور پرندوں کے پنجروں کے پاس اور خرگوش اور بطخیں اور ہرن کا بچہ۔

اور سب سے پسندیدہ۔ ماں کا چہرہ۔

اس نے یکدم اپنے ٹیڑھے میڑھے دانت سختی سے بھینچ کر ہونٹ آپس میں پیوست کرلیے اور آنکھیں موندلیں۔

ماں کے ہاتھ رک گئے۔ اس کا پیٹ بھر گیا اب وہ اور کچھ نہ کھائے گا۔

"یہ سب لے جاؤ۔" وہ ملازمہ سے مخاطب ہوئی۔

"آپ نے ناشتہ نہیں کیا بی بی!" ملازمہ نے یاد دلایا۔

"میں کرلوں گی۔ تم دیکھ رہی ہو ناں اب عون پرندے دیکھنے پیچھے جائے گا۔ تم بس میرے لیے ایک گرم کپ چائے لے آؤ۔ ہم پیچھے ہیں۔" وہ گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ ٹشو پیپر سے اپنے ہاتھ پونچھے اور عون کا چہرہ تولیے سے رگڑنے کے بعد چوم لیا۔ پھر اپنا گال اس کے ہونٹوں سے جوڑا کہ وہ بھی چوم۔

"بہت مزہ آیا۔" اس نے بیٹے کو بتایا۔

برتن سمیٹتی ملازمہ نے پل بھر کو رک کر بہترین ناشتے کے لوازمات کو دیکھا۔ اس کی مالکن اکثر بیٹے کو کھلانے کے چکر میں بھوکی ہی رہ جاتی تھی۔

"سفینہ! میڈم کہاں ہیں؟ سر کا فون آرہا ہے۔" آیا پھولے سانسوں کے ساتھ باہر آئی۔ "وہ شاید آدھے گھنٹے سے کال کر رہے ہیں یہ دیکھو سترہ مسڈ کال۔"

"تو تم اٹینڈ کرلیتیں۔" سفینہ نے کہا۔

"کرلیا اٹینڈ۔ کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہونے کا کہہ رہے ہیں۔"

"تم نے یہ تو نہ کہا کہ وہ عون بابا کو ناشتہ کروا رہی ہیں" سفینہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"لو! میں کوئی پاگل ہوں۔ کہہ دیا' نہا رہی ہیں۔" آیا بھی بیچ کی بات سے خوب واقف تھی۔

ملازمہ سفینہ چہرے پر تاسف اور کسی قدر غصے کے تاثرات لیے تپائی سے برتن اٹھا اٹھا کر ٹرالی میں رکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سفینہ! کیا بیگم صاحبہ تیار ہیں؟" کپڑوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرتی سفینہ آواز پر بری طرح چونکی۔

"ہاں۔ نو۔ یس سر۔" وہ گڑبڑائی۔

"میرے لیے ایک کپ چائے منگوادیں اور اپنی میم سے کہیں ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔"

سفینہ تیزی سے کامن روم سے نکلی۔ کچن میں خانساماں کو چائے کا کہا اور پھر گومگو کیفیت میں وہیں کھڑی رہی۔

"کیا ہوا سفینہ! ایسے کیوں کھڑی ہیں؟"

بہت بڑا مسئلہ ہوگیا ہے عبدالسلام!" وہ اپنی ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔

"میڈم کو آج سر کے ساتھ ایک بڑی پارٹی میں جانا تھا۔ صبح ہی ڈرائیور سب کپڑے وغیرہ دے گیا۔ میڈم نماز جمعہ کے بعد نماز حاجت پڑھ کے وظیفہ پڑھنے لگیں مجھے بھی دھیان نہ رہا اور سر آگئے ہیں انھیں لینے۔ اب میں کیا کروں۔" وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔

"تو تم میڈم کو آواز دے دو' چائے پینے تک وہ ریڈی ہوجائیں گی۔"

"ایسے کیسے آواز دے دوں۔ وظیفے بڑے جلالی ہوتے ہیں۔ بیچ میں چھوڑے نہیں جاسکتے اور نہ ہی درمیان میں پکارنا چاہیے' الٹا اثر ہوجاتا ہے۔" سہمے ہوئے لہجے میں جھرجھری لے کر بولی۔

"میں پانچ منٹ میں تیار ہوجاؤں گی سفینہ! تم اتنی پریشان مت ہو۔" نرمی سے اس کے شانے کو چھوتے ہوئے میڈم نے ملائم لہجے میں کہا۔

وہ چونک کر مڑی پھر شرمندہ ہوگئی۔

"آئی ایم سوری میم!" اس نے پلکیں اٹھائیں اور اس بار بری طرح اچھلی۔ میڈم پانچ منٹ میں تیار ہوجاتیں مگر اتنے سوجے پپوٹے' سرخ ناک مسلسل رونے سے چہرہ تک سوجا سوجا تھا اور آواز بھاری

"آپ کا چہرہ میم۔"

"میک اپ سے سب چھپ جاتا ہے۔" اس نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری کہ سب چھپ جائے گا۔" عقب سے ابھرتی غراتی آواز۔ سفینہ بلا ارادہ کچھ پیچھے سرکی۔ "میں دس روز سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں آج جانا ہے۔ ہمیں مسٹر اینڈ مسز۔" صاحب نے درشتی سے میم کا بازو پکڑا اور جھٹکا دے کر جملہ اور بازو ایک ساتھ چھوڑ دیے' میم بری طرح لہرا گئیں۔ پھر وہ سفینہ کی سمت گھوما۔ "ایسا نہیں ہے کہ آپ کی میڈم کوئی جاہل' کم عقل عورت ہیں اور انہیں اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لیے میں نے ایک اسٹائلسٹ کو نوکری دی ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے رکھا تھا کہ آپ انہیں یاد رکھوائیں کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔" وہ غرایا۔

"سر! میں نے کہا تھا۔ سر! وہ میم وظیفہ۔ آئی ایم سوری۔" وہ کانپ رہی تھی۔

"وظیفہ۔" وہ چلایا۔ "تم کرتی رہو اپنے وظیفے۔" اس نے تیزی سے نمبر گھمایا۔

سفینہ نے ٹھنڈی سانس لی اور جان گئی کہ صاحب کہاں کا نمبر ملا رہے ہیں۔

"ہاں! میں بول رہا ہوں۔ کیا تم دس منٹ میں تیار ہوسکتی ہو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔" وہ کسی کو تفصیل

کہتے ہوئے پیر پٹختا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"جب سب کہہ کہہ تھک گئے۔ کیا اپنے کیا پرائے' دوست دشمن سب' تب مانا نہیں اور جب سب پیچھے ہٹ گئے تو موصوف گھوڑی چڑھ گئے۔ خیر عمر کو کون دیکھتا ہے' وہ تو پھر چالیس کا ہی تھا مگر اس کی بیوی پندرہ برس کی ہوگئی تھی۔ میں تو بھیا گئی نہیں مگر جانے والوں نے بتایا۔ وہ معصوم باوا کی بارات میں یوں شریک' ننھی جیسے لاڈوں پالے بھیا کی گھوڑی کی باگ تھامے چلتی ہو۔ اب کراچی' لاہور' کا فاصلہ تم دیکھو۔ پھر بھانجے کی دوسری شادی۔ لیکن میرے دل کو ارمان ہی چڑھ گیا۔ کہ دیکھوں تو سجاد میاں کس کارن مانے۔ اور دوسرے سوتیلی اماں بیٹا کے ساتھ کیسی ہیں؟ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ تم بتاؤ' آج کل تو راوی کے ملتے ہیں۔ ہے کہ نہیں؟"

رابعہ خاتون پلاسٹک کے ڈونگے میں مٹر نکال نکال کر ڈالتی جا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ اور زبان تواتر سے چل رہے تھے۔ پل بھر کو ہاتھ اور زبان روک کر اپنی سامع شمسہ بیگم سے تصدیق چاہی۔ شمسہ بیگم مہارت سے کروشیا سے کچھ بن رہی تھیں۔ وہ سارا سال کچھ نہ کچھ بنتی ہی رہتی تھیں۔

اب ان کی بولنے کی باری تھی۔

"بالکل ملتے ہیں۔ آپ صحیح کہہ رہی ہیں اور بھئی وہ دیکھیں گے ناں جو دکھایا جائے گا یاد ہے مجھے۔ آپ تو آکر خوش ہی تھیں اچھی عورت مل گئی سجاد کو۔ اور بچی کے ساتھ بھی بہت اچھی ہے۔ میں نے تو کبھی دیکھا نہیں۔ مگر آپ سے سن سن کر دل میں بچی کے لیے دعا کرتی رہی۔ سگی مرجائے اور ابا سوتیلی لے آئے تو ابا بھی سوتیلا ہی بن جاتا ہے۔ حق ہا۔"

ٹھنڈی سانس بھر کے انہوں نے انگلی پر دھاگہ لپیٹنے کا توقف کیا۔ سفید نکلی لڑھک کر زمین بوس ہو چکی تھی۔

رابعہ بیگم ابھی تک ہاتھ روکے انہیں سن رہی تھیں۔ باری ملنے پر دوبارہ مٹروں کی جانب متوجہ ہوئیں اور ساتھ ہی سلسلہ کلام جوڑا۔

"سجاد کے کسی دوست کی سالی تھی۔ راحیلہ نام ہے اللہ جانے حقیقت حال مگر شوہر چھوڑ چکا تھا۔ اس نے تو یہی بتایا۔ کردار کا کچا اور ہتھ چھٹ تھا۔ ایک بیٹا تھا کبھی ماں کے پاس کبھی باپ کے' جو تیس پینتیس کی عمر ہوگی۔ اس کے اماں باوا کہنے لگے۔ بیٹا باپ کے حوالے کردو خوب پیسے والا ہے' اٹھائے ذمہ داری اور تمہاری تو ہم شادی کریں گے۔ بچہ باپ کے پاس رہا اور راحیلہ بی بی سجاد سے بیاہی گئیں سال بعد بیٹی ہوگئی پھر ایک بیٹا بھی۔ لیکن اس بچی سے بھی رویہ اچھا تھا۔ اتفاق سے دو چار بار جانا ہوا۔ دھلے دھلائے کپڑے۔ کتابیں پڑھتی پائی گئی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو بڑے لاڈ سے سنبھالتی۔ منہ سر چوم کر رکھتی۔ بچن تو ماں کے نہ ہونے سے بچپن ہی سے دیکھنا آگیا تھا۔ ہمیں تو سب بھیا اچھا ہی لگا۔ خوش حال گھرانہ ہاں۔"

مٹر چھل گئے تھے۔ وہ چھلکے تھیلے میں بھرنے لگیں۔

"تو اچانک سب کے سب منہ اٹھائے کینیڈا کیسے بھاگے۔ اس کا بھی ٹکٹ کٹوالیتے۔ جوان بچی۔" شمسہ بی بی نے ٹوکا۔

"یا تو جوان کہیے یا بچی۔ جوان ہے تو بچی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اور بچی ہے تو جوان کیوں کہا؟"

عدینہ ڈوئی ہاتھ میں لئے کچن سے برآمد ہوئی۔ ڈوئی میں مسالہ تھا۔ وہ رابعہ خاتون کو نمک چکھانا چاہتی تھی۔ اس کا چہرہ کچن کی گرمی کے باعث' کچھ خفگی کے باعث اور کچھ حسب عادت سرخ اور سوجا سوجا روٹھا سا تھا۔

"دعوت کا کھانا بننا ہے صاحبزادی۔ اسپتال نہیں بھیجنی بریانی۔ ایک چمچ مرچ اور آدھا نمک کا ڈال اور گرم مسالہ کٹا ہوا بھی ڈال دینا۔ بس جملے پکڑنے ہی آتے ہیں۔ اپنی ہانڈی کے نقص پکڑنے نہ آئے۔ سسرال میں ساس کی ناک کے آگے بھی ڈوئی لگا دینا۔ کہ اماں چکھو۔ ہونہہ۔"

رابعہ خاتون نے خفگی سے کہا۔
میں ایسی کسی سسرال میں جانے والی ہی نہیں جہاں مجھے ڈوئی پکڑا دی جائے ہونہہ!" عدینہ نے ان ہی کے انداز میں کہہ کر پیر پٹخے۔
"اے بی بی! سسرال اور ڈوئی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تمہارے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ تو ساس کے ہاتھ میں ہوگی۔ مگر اس نے بھی اس وقت اسے ہنڈیا میں نہیں گھمانا۔ تمہارے پیروں ہی میں توڑے گی۔ نکمی بہو کو کون بٹھا کر کھلاتا ہے۔ اماں باوا تو ہیں نہیں عدم سدھارے۔ تم دادا دادی کے چونڈے میں راکھ ڈلوانا۔ہاں۔"
رابعہ بیگم کو غصہ اپنے بھانجے سجاد اور اس کی دوسری بیوی راحیلہ پر تھا جو مسلسل بول بول کر ہلکا کر رہی تھیں۔ عدینہ کے بھی لتے لے لیے۔ عدینہ کا مانو دماغ گھوما مگر اس کے کھلتے لبوں پر رابعہ بیگم کی نگاہ تھی۔ سو فوراً "ٹوک دیا۔
"اب خبردار جو کوئی الٹا سیدھا بولیں تو۔ جاکر مسالہ ڈال دو ورنہ پھر کچا ندرہے گی۔ صبح سے ایک کھانا تیار نہیں کر سکیں۔ ہاں باتیں کروالو آنے والے تو بھوک کا شور مچاتے آئیں گے ناں۔"
"جہاز میں بھی تو کھانا ملتا ہے۔ لاہور کون سا دور ہے جہاز میں اپنے گھر سے ناشتہ کرکے ہی نکلی ہوگی۔ آپ بچی کو بولائے دے رہی ہیں۔ آجائے گا سب وقت رہے۔"
شمسہ بیگم نے کچن کی کھڑکی سے نظر آتے عدینہ کے چہرے کو دیکھا۔ جھنجلاہٹ غصہ اور ناراضی کے گہرے تاثر نے بھی خوبصورتی پر اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ اس روپ میں بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ لادیتی تھی۔ حسن ہر عالم میں حسن۔
"وہ تو کھالی کر آئے گی۔ مجھے کب ہو رہی ہے اس کی فکر۔ آپ کے بھائی صاحب۔ بھول گئیں انہیں۔ دو گھنٹے میں تو ایئرپورٹ پہنچے ہوں گے۔ پھر جہاز آنے اور وہ نکلے گی پھر واپسی کے دو گھنٹے اور اگر شومئی قسمت ٹریفک جام۔ تو بس اللہ ہی حافظ۔ مجھے تو بس ان کی فکر ہے۔"
رابعہ بیگم کی حقیقت بیانی پر شمسہ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
رابعہ خاتون مٹر فریج میں اور چھلکے کوڑے دان میں ڈالنے کو کھڑی ہوئیں۔ ساتھ ہی کچن کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ دوسرے چولہے پر یخنی میں گاجریں ٹماٹر ہری پیاز اور شملہ مرچ دم پر رکھی تھیں۔
"اب یہ کس لیے؟" وہ اچنبھے سے عدینہ کی صورت دیکھنے لگیں۔
"میرے لیے۔ کیا میں کچھ نہ کھاؤں گی؟" وہ بھرپور ناراضی سے بولی۔
"تو یہ اتنا سب جو بن رہا ہے اس میں کچھ نہیں تمہارے لیے؟ بریانی، چکن کڑاہی، گاجر کا حلوہ، نان اور سلاد وغیرہ۔"
"میں نہیں کھاتی اتنی آئلی ہیوی چیزیں۔ ساری اسکن سے تیل کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور دانے الگ۔"
"ارے میرے مالک۔" رابعہ خاتون کے پاس کوئی جواب نہ رہا۔ ڈھکن اٹھا اٹھا کر خود چیک کرنے لگیں۔ عدینہ انہیں مگن پا کر دبے قدموں باہر نکل آئی۔ رابعہ خاتون اب کام مکمل کرکے ہی باہر آتیں۔

☼ ☼ ☼

"عدینہ۔ ارے عدینہ بچی! سنتی ہو۔ ذرا جلدی سے آؤ تو دو روٹیاں ڈال دو۔ فون آیا ہے تمہارے دادا کا۔ پندرہ بیس منٹ میں پہنچنے کو ہیں۔" رابعہ خاتون نے ریسور رکھتے ہی ہانک لگائی۔
"اب روٹی کس لیے، نان منگوائے تو ہیں ناں؟" وہ انکار آمیز اچنبھے سے چلائی۔
"ارے بی بی خدا کی بندی انجانے کو تو کتھا سناؤں اور جان بوجھ کر مزہ لینے والے کے لیے کیا کروں۔ چاول سے بھوک نہیں اترے گی۔ اوپر سے شوگر اور نان ہضم کب ہوتے ہیں تمہارے دادا کو۔ خود سے تو خیال کیا آئے گا، بتانے پر بھی حجت۔" رابعہ خاتون کی بات ہی جل گئی۔
"اتنی تمہید اف۔" عدینہ نے نزاکت سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "تو پہلے ہی کہہ دیتیں۔ میں ڈال دیتی اب تو میں تیار ہو کر آگئی ہوں۔"
"تو جو تیار ہو کر آتے ہیں، کام سے رخصت لے لیتے ہیں۔ کھاتے پیتے نہیں۔ دو روٹیاں ڈالنے میں کتنا وقت لگے گا؟ بوڑھی دادی پر رحم کرلے بچی۔"
رابعہ خاتون عاجز آگئیں۔ عدینہ کے لیے کوئی راہ نہیں تھی۔ منہ تو پکار رکھا مگر دل میں خود کو کوسا۔ پتا تو تھا دادا کے لیے روٹی ڈلے گی تو خود سے ہی پاٹ پاٹ میں جل کر رہی مگر اس وقت اسے اپنے بناؤ سنگھار کی فکر تھی۔ کہ کہیں مہمان کی آمد پر ایسی ویسی نظر نہ آئے۔ سو بھاگی اور جی جان سے تیار ہو کر آئی۔ اس نے تو آ کے ہوئے اپنا ناقدانہ جائزہ لیا۔ لہریے دار بالوں کو ہاف کیپ میں جکڑ آدھا کھلا چھوڑا، وہ بے فکر تھی اس براؤن بالوں میں سنہری اسٹریکنگ کی دھاریاں تھیں۔ گلابی بے حد گداز سراپے پر آدھے بازو کی تنگ لمبی قمیص کے ہمراہ بوتل کٹ شلوار سفید گرے سرخ رنگ کی تھی۔ پیروں میں سرخ اونی سلیپر سردی سے بچاؤ کے لیے اس نے کانوں میں بہت بڑی بڑی سرخ بالیاں ڈال رکھی تھیں اور مکھن کے پیڑے جیسے ہاتھوں پر بھی بڑی دل جمعی سے سرخ نیل پالش لگا کر ہاتھوں پر لوشن مل کر آئی تھی اور اب روٹیاں۔ہاں۔
"فیشن لاہور سے شروع ہوتا ہے اور کنیرڈ کی بڑھی لڑکی۔ ہونہہ اس نے بہت احتیاط سے پیڑا بناتے سوچا اور گردن جھٹک کر خود کو دیکھا۔ دادا جان کی موجودگی کا لحاظ نہ ہوتا تو ہونٹ اور گال بھی رنگ لیتی۔ ابھی بھی خود کو بمشکل روکا تھا۔ مگر آنکھوں میں کاجل کی لکیر اور پلکوں کو مسکارے سے آراستہ کرلیا تھا۔ شیمپو کی خوشبو، صابن، باڈی اسپرے اور لوشن کی مہک چار جانب چکرا رہی تھی۔
وہ روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھ رہی تھی۔ جب گاڑی رکنے کی آواز آئی اس نے سرعت سے چولہا بند کیا اور ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی سردی کے موسم میں اس نے آدھی آستینیں شوق میں چڑھا رکھی تھیں۔ سردی لگے گی تو شال لپیٹ لے گی۔ سامنے سے دادا جان نظر آگئے۔ وہ وہیں رک کر جائزہ لینے لگی۔ ایک بیگ۔ ایک چھوٹا بیگ۔
"پتا نہیں کتنے عرصے رہے گی۔" ناشتہ دادی جان بناتی تھیں۔ دوپہر کی چپاتیاں کام والی بھولی ڈال دیتی مگر رات کا دسترخوان تمام کا تمام اس کے ذمہ تھا جسے وہ طوعاً "کرہاً" پورا کرتی۔ اب مزید ذمہ داری۔ پہلے ہی روٹی ڈالنا اتنا مشکل ہے۔ اب اور روٹیاں۔ اور یہ پنجاب کے لوگ روٹی بھی زیادہ کھاتے ہیں۔ سامان اتنا زیادہ ہے۔ کیا ہمیشہ کے لیے رہنے آگئی۔ ہائے اللہ نہ کرے۔
اس نے دہل کر سوچا اب نظر بھی آجائے کہاں رہ گئی۔ اف۔
دادا جان تخت پر ڈھے سے گئے۔
"تھک گیا بیگم۔" بیگم چونکہ متوجہ نہیں تھیں۔ سو اونچی آواز میں عظیم خان بولے۔
"ہاں جی۔ جہاز کے آگے چلتے ہوں گے۔" رابعہ خاتون کی ساری توجہ دروازے پر تھی۔
"پانی۔" دادا جان نے پکارا تھا۔ وہ جگ لیے تیزی سے نکلی اور تب ہی مہمان اندر داخل ہوئی۔
عدینہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا مگر سب الٹ ہو گیا۔ بن ماں کی بچی۔ سوتیلی ماں۔ اور اب باپ بھی اپنے بیوی بچوں کے پیچھے کینیڈا چلا گیا۔ وہ اسے بلوائے گا۔ سوتیلی ماں کو اس کے والد نے اسپانسر کیا تھا۔
وہ آدھا کا ناقصہ خوب غصے سے اتنی بار سنا چکی تھیں کہ ہر ایک کو ازبر ہو گیا۔
"سجاد وہاں جائے گا سیٹ ہوگا پھر بیٹی کو بلوائے گا اب یہ سب اتنی جلدی تو ہوگا نہیں۔"
وہ رابعہ خاتون کا اکلوتا بھانجا تھا اور اس کی بیٹی سے انہیں بہت ہمدردی تھی۔ سال چھ ماہ کے لیے رابعہ خاتون کے گھر سے اچھا ٹھکانہ کون سے ہو سکتا ہے؟ سجاد کی سوچ سے قطع نظر رابعہ خاتون خود "بچی" کو

آغوش میں بھرنے کو بے قرار تھیں۔

اتنے دن کے قصے سے عدینہ کے دماغ میں ایک شکل سی بن گئی۔

سوتیلی ماں کے ظلم و جبر اور مکر کو سہتی معصوم بچی اجڑی پجڑی ہراساں قابل رحم ہائے ہائے۔

مگر اب جو ہائے اس کے منہ سے نکلی وہ بڑی ہی عجیب تھی۔

اونچے سیاہ ڈھیلے کرتے پر پورے آستینوں اور گلے پر سی گرین رنگ کی بہت باریک نفیس کڑھائی' سیاہ پٹیالہ نما گھیر والی شلوار' دوپٹا شانے پر گرا تھا لیکن کے اس سوٹ کے اندر سراپا۔ نازک نازک عدینہ کو بہت دیر تک دوسری کوئی نہ سوجھی۔ کیا اس نے بہت اونچی ہیل پہن رکھی ہے؟ عدینہ نے ذرا گردن نکال کر دیکھا۔ نہیں۔ وہ بالکل زمین سے چپکی جوتی میں تھی اتنا خوبصورت دراز قد۔

نزاکت سراپا۔ دادی کہتی تھیں حوریں پانی پئیں گی توان کی جلد اتنی شفاف آرپار سی ہوگی کہ گزرتا پانی نظر آئے گا۔

عدینہ نے سوچا کہ وہ جب وہ پانی پیے گی تو وہ ضرور دیکھے گی اتنی شفاف کھال۔ یا اللہ۔

سب سے حیران کن نووارد کا ہیئر اسٹائل تھا یہ شاید ڈائنا کٹ تھا۔ یا تنہائیاں کی زویا کے جیسے بال۔ مگر ان کا رنگ شہد جیسا تھا۔ اور آڑی مانگ کے ساتھ پف بہت گھنا تھا گدی تقریباً" خالی۔ یہ بالکل تازہ کٹنگ تھی۔

وہ رابعہ خاتون سے گلے ملنے کو جھکی تو پف کا چھجا ڈھلک کر بے ترتیب سا ماتھے پر گرا جسے اس نے انگلیاں پھنسا کر اوپر چڑھایا۔ جو انگلیاں نکلتے ہی دوبارہ کنپٹی پر دائیں جانب۔

"آؤ عدینہ! بہن سے ملو۔" رابعہ خاتون جب خوب جی بھر منہ چوم چکیں تو دھیان آیا۔

عدینہ سحر زدہ سی آگے بڑھ آئی۔ گلے لگ گئی۔ بہت بھینی سی خوشبو اس کی ساری خوشبوؤں پر حاوی ہوگئی۔ اس کے گداز مکھن جیسے سرخ رنگ میں رنگے ہاتھ پتلے لمبے تراشیدہ گلابی ناخنوں والے ہاتھوں سے اندر دبے تھے۔ گرم جوشی اور محبت کا مظاہرہ۔

اخروٹی آنکھوں میں اپنائیت محبت خلوص تھا۔

☼ ☼ ☼

"بالکل صحیح کہہ رہی ہیں اماں بی۔ تم کوئی سولہ برس کی کنواری دوشیزہ تو تھیں نہیں کہ تمہیں پتا نہیں چلا۔ مائی گاڈ پانچ مہینے۔ اف۔"

اس کا شوہر ٹہل ٹہل کر اپنی ٹینشن ختم کر رہا تھا اور اس کی بڑھا چکا تھا۔ اس کا کمزور دل کانپ رہا تھا۔ وہ بیڈ کی پائنتی پر پاؤں لٹکائے مجرموں کی طرح ہراساں بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں بہت دیر سے زمین پر گڑی تھیں اور شوہر کے دائیں بائیں چلتے قدموں کو تک رہی تھیں۔ رفتار کی تیزی۔ مسلسل بولتے جھکتے ہوئے رک جانا۔ پھر زمین پر پاؤں مار کر چلنا۔ دھم۔ پٹخنا۔

اگر اس کے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا جاتا کہ وہ کچھ نہ سن پاتی تب بھی وہ صرف پیروں کی حرکت سے شوہر کے غصے' ضبط' ناپسندیدگی کو جان لیتی اس کی آنکھیں بری پڑی تھیں۔

"اب رونا کس بات کا۔ بہو رانی رونے کے دن تو ہمارے ہوئے ناں۔" اس کی ساس بھی کمرے میں صوفے پر پیر اوپر چڑھا کر بیٹھی تھیں۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں اماں بی! مجھے نہیں پتا تھا۔ اور۔ اور جب اندازہ ہوا تو میں۔ میں ڈر گئی۔ میں ڈر گئی تھی اماں بی!" اس کی آواز میں حجاب اور کپکپاہٹ تھی۔

"اونہہ۔ میں تو خیر مان ہی نہیں سکتی کہ اسے خبر نہ ہوئی ہوگی۔ پانچ سال کی بیاہتا ہے۔ عورت تو اپنے اندر کی ساری خبریں رکھتی ہے۔ ان کا دھیان نجانے کہاں رہتا ہے۔"

اس نے سر گردن کی ہڈی سے چپکا کر ہونٹ کچلے (سب لوگ۔ سب جانتے ہیں مگر حجاب کا پردہ۔ بندی) اسے اتنی ذاتی بات۔ شوہر سے اور وہ بھی ساس کی موجودگی میں یوں ڈسکس ہونا عرق عرق کر رہا تھا۔

سرتاج شاید ٹہل ٹہل کر تھک گیا اس کے عین سامنے پڑے صوفے پر دھم سے بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ اسے گھور رہا تھا۔ اس نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر دیکھا اور سہم کر نگاہیں اپنی نم ہتھیلیوں پر جادیں۔ اسے بخوبی محسوس ہو رہا تھا اس کے سامنے بیٹھا شوہر اور دائیں جانب بیٹھی ساس اسے گھور رہی ہیں۔

ایک خاموشی۔ طوفان سے پہلے خاموشی۔ جنازہ اٹھ جانے کے بعد کا سناٹا۔ پرہول۔ تمام۔ انجام جیسا۔ نہیں نہیں۔

ہاں اس پر فرد جرم عائد کرنے والے کسی حد تک درست تھے۔ اسے تین ماہ تک واقعی پتا نہیں چلا کہ اس کے وجود میں ایک اور روح سانس لینے لگی ہے اور تین ماہ۔ تب اس کا بیٹا' اس کا اکلوتا چار سالہ بیٹا۔ کتنا شدید بیمار ہوگیا تھا۔ جیسے اس کی جان کے لالے پڑ گئے اسے لگا کہ وہ بس۔ اللہ نہ کرے تب اسے کب ہوش تھا کسی بھی چیز کا۔ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے' بات چیت کا۔ بچہ بیمار ہوا تو۔ وہ ہر شے فراموش کر کے بس اس میں مگن ہوگئی۔ تب بھی مورد الزام ٹھہرائی گئی۔ کہ اسے تو بس اس ناکارہ وجود ہی کی فکر ہے پر وہ کیا کرتی۔ وہ ماں تھی اور ماں محبت کے معاملے میں بہت مجبور ہوتی ہے۔

کیا ہوا کہ وہ ایک معذور و مفلوج بچہ تھا۔

کیا ہوا کہ وہ پیدائش کے پل سے لے کر اب تک بستر نشیں تھا۔

کیا ہوا کہ وہ بے کار تھا۔ ہر حوالے سے ناکارہ۔

مگر وہ اس کے جگر کی آگ تھا۔ جس کی لو سے اس کی زندگی روشن تھی۔

اور دو ماہ پہلے جب اس پر انکشاف ہوا کہ ہاں کچھ ہے۔ تو وہ پوروں پر دن گنتی رہی کہ کب۔ کیسے۔ مانع حمل ادویات کھا کھا کر اسے لگتا اس کے اندر آپ کچھ بھی نہیں رہا۔ بار آوری۔ کونپل کا پھوٹنا اور نمو پانا۔ وہ سب کچھ کھو چکی ہے۔

اور پھر نو ماہ پیشتر دو ماہ کا حمل ضائع کروایا گیا۔ اس کا شوہر کمشنر تھا اس چھوٹے سے علاقے کا مائی باپ۔ اگر اس کی بیوی یہ غیر قانونی کام کروانے کسی بڑے اسپتال جاتی تو سب جگہ چرچا ہو جاتا۔ نہیں نہیں۔

سو ایک سو برس کی بڑھیا دائی نے یہ فریضہ بہت سارے پیسوں کے عوض خاموشی سے انجام دیا۔

اور موت تکلیف دہ ہے مگر ایک بار ظہور پذیر ہوگی تو پھر۔ بس آپ مر گئے ہیں۔ قصہ ختم۔ بے جان۔ سب احساسات سے عاری۔ لیکن آپ مرنے کی ساری تکلیف اذیت سہیں۔ کڑواہٹ کا ذائقہ چکھیں اور پھر بھی زندہ رہیں۔ اف۔ اس نے جھرجھری لی۔

اسے یقین تھا وہ جیسے ہی ذکر کرے گی وہ سب لوگ اس سو برس کی کالی جھریوں بھرے چہرے اور سخت بڑیوں گانٹھوں والی انگلیوں کی مالکہ دائی کو بلا لائیں گے۔ اس نے تین ماہ بے خبری کے عالم میں مزے سے گزار دیے تھے اور دو ماہ کشمکش میں۔ مگر یہ چیز چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔

اور اس کے خدشات مجسم ہو کر سامنے آگئے۔ بھونچال ہی آگیا ناں۔

"میں نے کیا بے گار کیمپ کھول رکھا ہے۔ یا میں معذوروں فقیروں کا ٹھیکے دار ہوں اور لولے لنگڑے سپلائی کرتا ہوں۔" اس کے شوہر کے لہجے میں فرعونیت تھی۔ بڑے جاہ و جلال والا فرعون غرق آب ہوگیا۔ مگر یہ چھوٹے موٹے گلی کوچے کے فرعون۔ نہ سامنے آتے ہیں نہ دعوا کرتے ہیں اور نہ ہی غرق ہوتے ہیں۔

"استغفراللہ۔" اس نے توبہ کی۔ وہ اگلا جملہ سوچ چکی تھی کہ کیا ہوگا۔

"آپ بلوائیں۔ بچی دائی کو۔ فوراً"۔" وہ حتمی فیصلہ کر کے کھڑا ہو چکا تھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ سہم کر کھڑے ہوتے ہوئے لڑکھڑا کر گری۔

"میں نے بہت دعائیں کی ہیں۔" وہ شوہر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"یقین کریں اماں بی! نفلی روزے رکھے ہیں اور منتیں مانی ہیں ان شاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اماں! اسے نہ بلوائیں اماں۔" وہ ساس کے پیروں کے پاس بیٹھی پھر تڑپ کر دوبارہ شوہر کے قریب پہنچی۔

"فیصلہ وہی ہے مریم۔ جو میں چار سال پہلے کر چکا ہوں۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں۔ تمہیں چھوڑوں گا بھی نہیں۔ تم پالتی رہو اپنے سپوت کو۔ مگر تم سے کم از کم میں۔ اور۔ بچے۔ (بچے کہتے ہوئے اس کا چہرہ بگڑا) نہیں رہنا تو آزاد ہو۔ اپنا بیٹا لے کر جا سکتی ہو۔ مجھے جب بچہ کی خواہش ہوگی تب میں نئے فیصلے بھی کرلوں گا۔ ابھی تو وہی ہوگا جو میں طے کر چکا ہوں۔"

اس کے شوہر نے اس کے شانے پر اپنے دونوں ہاتھ جما کر قطعیت سے کہا۔

اس کا شوہر باہر نکل گیا اور ساس پیچھے پیچھے۔ اسے سنے بغیر۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ موت کے مترادف اس پل کو نہیں سہار سکتی۔ وہ اپنا بچہ نہیں کھو سکتی۔

اسے یقین ہے اللہ تعالیٰ اسے مایوس نہیں کرے گا۔ اس نے اللہ کی دی پچھلی نعمت پر بھی ناشکری اور کیوں کا لفظ نہیں کہا تھا وہ پوری تن دہی سے اس ذمہ داری کو نبھانے لگی تھی۔ جو اللہ نے اسے دی۔ اللہ کو اطاعت اور شکر گزاری پسند ہے اور وہ اس کا بدل دیتا ہے اور اس نے بدل میں ایک صحت مند بچہ مانگا تھا۔

اور اس کا دل کہتا تھا کہ اللہ اسے ضرور دے گا۔

اس کا پانچ ماہ کا بچہ۔ چار ماہ اور گزرتے تو تندرست و توانا گل گوتھنا ان شاء اللہ اس کی گود میں ہوتا۔ دعا کی مستجابی اس کے دل پر وحی کی طرح اتر چکی تھی۔ تو پھر۔ یہ کریہہ صورت بڑھیا۔

"اے اللہ تو نے اسے اس لیے اتنی عمر دی کہ یہ۔" وہ اپنی ساس کی ہمراہی میں اندر داخل ہوتی دائی کو دیکھ کر سسک اٹھی۔

وہ گویا خود کو موت کے لیے تیار کر چکی تھی اس نے سربسجود ہو کر صرف اپنے بیٹے کے لیے رب سے خیر مانگی تھی۔

وہ جسمانی اعتبار سے جھکڑ کی زد میں آئی بیل جیسی کمزور عورت تھی۔ مگر اس کا یقین۔ اس کا ایمان پہاڑوں کو شرمسار کرتا تھا۔ وہ سر اٹھا کے کوئے دار چلی تھی۔

"معاف کرو بڑی بیگم صاحب۔ بہت دیر ہوگئی۔ اب کچھ نہ ہو سکتا۔ پورا ہی کرنا ہوگا۔ ٹائم زیادہ ہوگیا۔ اس کی جان کی کوئی گارنٹی نہیں۔ بچہ گیا تو ماں کو ساتھ لے کر ۔۔۔ ہی جائے گا۔"

بچی دائی کی متاسف اور نفی میں قطعیت سے ہلتا سر۔

"ارے مائی کوشش تو کرو۔ تمہارا اتنا تجربہ۔" ساس نے بڑھاوا دیا۔

"تجربہ ہے جب ہی تو بولوں ہوں کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ ابھی سال بھی نہ گزرا۔ یہی سب کیا۔ وہ آسان تھا۔ اب تو بچہ ہاتھ پیر مارنے لگا ہے۔"

"لیکن مائی۔" ساس حواس باختہ ہوگئی۔ وہ دائی کو شانوں سے تھام کر ذرا دور لے گئی۔ اب وہ سر جوڑے تیز انداز میں کچھ بول رہی تھی۔ مگر دائی کا مسلسل نفی میں ہلتا سر۔

مریم بے دم تھی۔ اسے لگتا' وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہے۔ وہ کیا سن رہی ہے کیا سمجھ رہی ہے۔

"ارے مالکن۔ پھر تم کسی بھی جگہ لے جاؤ۔ سو سال کی عمر ہے تو مانو تجربہ دو سو سال کا۔ اب تو وہ بات ہوگئی کہ ماں بچہ نے قسم کھالی۔ جئیں گے تو اکٹھے۔ مریں گے اکٹھے۔ ہاں۔"

وہ کڑوے پن سے کہہ کر اپنا برقعہ سر پر جمانے لگی۔ اس کے بے یقین چہرے پر نگاہ پڑی تو مسکرائی۔ اس کے نزدیک آگئی۔

"خوب کھا اور پی اور اللہ سائیں سے دعا مانگ۔ میں نے سارے داؤ آزمانے کا سوچ رکھا تھا۔ مگر وہ بھی پکے پیر جما کر بیٹھا ہے۔ ان شاء اللہ یہ دروازے جتنے قد کا لمبا ہوگا۔ کبڈی کے پہلوان جیسا۔ میں نے یہ بال کوئی دھوپ میں چٹے نہیں کیے۔ ہاں۔"

ساس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ ایک اور معذور؟ ہاں مریم پر شادی مرگ طاری ہوگئی۔ اس کا بچہ اس کے پاس تھا۔ اس نے اپنے پیٹ پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ "ہاتھ پیر مارنے لگا ہے۔ پکے پیر جما کر بیٹھا ہے" اس کے کانوں میں ان ہی دو جملوں کی گردان

"ہاں اللہ اس بار اسے مکمل صحت مند بچہ دے گا۔"

اس نے باہر نکلتی بچی دائی کو دیکھا۔ اسے ہمیشہ اس کا چہرہ کہانیوں کی جادوگرنی جیسا لگتا تھا۔ جھاڑو پر سواری کرتی اڑتی ڈائن جیسا۔

مگر چہرے کبھی برے نہیں ہوتے سیاہ یا بدشکل۔ اعمال ان کو روشن اور تاریک بناتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"میں وہی ہوں جس کے اچھا نکل آنے کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔"

وہ بڑے مزے سے کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا تھا۔ وہ خاک نہ سمجھی اور عدینہ نے تو پہلے ہی اسے آتے دیکھ کر برا سا منہ بنالیا تھا۔ وہ کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتے کھولتے رک گئی۔

"سوچیں۔ سوچیں۔ خوب سوچیں۔" اس نے بڑھاوا دیا۔

"نہیں۔ میں نے ہار مانی۔" اس نے اخبار تہہ کیا اور وہ پوری طرح اس بے حد شریر نظر آتے نوجوان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میں کچھ ہیلپ کروں؟" عدینہ کا انداز جارحانہ تھا۔

"اے خبردار۔ تم بیچ میں مت بولنا۔" وہ بھی اچھی طرح سے واقف تھا عدینہ کی فطرت سے۔ لہٰذا اچھل کر روکا۔

"نہیں واقعی' میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کیا ہیں اور کس چیز کے اچھا نکلنے کی دعا کرتے ہیں۔"

"ارے یار! اس نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ "خربوزہ۔ ہم خربوزے کے اچھا نکلنے کی دعا کرتے ہیں کہ اللہ میٹھا نکل آئے۔" عدینہ نے تیزی دکھائی۔

"تم کم عقل ہو عدینہ!" وہ چلایا۔ "میں بخت ہوں بخت شاہ!"

"اور قطعاً۔ اچھے نہیں نکلے۔ نام کا بھی اثر نہیں آیا" عدینہ نے چڑایا۔

بخت نے باقاعدہ منہ موڑ لیا اب بولتی رہے۔

"اور آپ اپنا تعارف کروائیے۔ غائبانہ تو سب کچھ ہی سن رکھا ہے۔ مگر آپ بولیے۔" وہ اس کی جانب مڑا۔

"میں بشائر ہوں بشائر سجاد۔ رابعہ دادی جان۔ میرے ابو کی خالہ ہیں اور وہ۔"

"بس۔" بخت نے ہاتھ اٹھایا آگے کا قصہ دادی جان کی زبانی ہمیں ازبر ہے۔ ویسے آپ کا نام بہت خوبصورت ہے کیا مطلب ہے اس کا؟" بخت دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"خوش خبری۔ بشارت سے نکلا ہے۔ بشریٰ' بشیر' بشائر۔" وہ اپنے نام کے معنی بچپن سے بتانے کی عادی تھی۔

"بہت خوب۔ بہت اعلا۔" بخت نے سراہا "آپ خوش خبری ہی کی طرح لگتی ہیں مگر اگر آپ کو ایک لفظ میں ڈیفائن کرنا ہو۔ یا چلیے دو الفاظ" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "نزاکت اور وقار۔ ڈیسنٹ چال ڈھال۔ قد' آواز لباس اور مسکراہٹ۔ ہر شے۔ وقار اور نزاکت سے بھرپور۔"

"زیادہ فلرٹ کرنے کی ضرورت نہیں لوفر! یہ تم سے بڑی ہیں۔ پورے ستائیس برس کی ہیں۔ سمجھے۔" عدینہ نے بھنا کر کہا وہ نجانے کس بات سے چڑ رہی تھی۔

"تم نے حسب عادت سب سے پہلے عمر پوچھی ہوگی؟" وہ بھی پھاڑ کھانے والے انداز میں جھپٹا "سطحی عورت!"

"اے بخت۔ بدبخت! خبردار جو مجھے عورت کہا تو۔" عدینہ نے اخبار اٹھا کر اس کے سر پر برسایا۔

"ارے بچاؤ۔" وہ اچھل کر دور ہوا "تو کیا بھائی نذیر کہوں یا باجی نذیراں ۔۔۔؟"

بخت نے فوری انتقام لیا۔ عدینہ کو کوئی چیز مارنے کو نہ نظر آئی تو کرسی سے اٹھ گئی اور اسے ہاتھ میں سر تک اٹھالیا۔

"او پلیز۔" بشائر ہراساں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شرم کرو عدینہ۔ نگینہ!" وہ اسے باقاعدہ منہ چڑاتا بھاگ نکلا۔ عدینہ نے پٹاخ کی آواز سے کرسی زمین پر رکھی۔

"یہ بہت کمینہ ہے۔ آپ کو نہیں پتا۔"

"اے عدینہ۔ کمینہ بھی تو عدینہ کے ہم قافیہ ہے ناں؟" وہ گیٹ سے منہ اندر کرکے آگ لگا گیا۔

"دادی جان۔ دادی جان!" وہ دھڑ دھڑ کرتی اندر بھاگی۔

بشائر عجب ناسمجھی کے عالم میں کھڑی رہ گئی پھر اس نے کرسیاں درست کیں اور اندر کی جانب بڑھی۔

اسے خیال سا آیا۔ کل دادی جان اسی بخت کا ذکر کررہی تھیں شاید پڑوسی لڑکا۔ اچھا لگا اسے۔ ہلکی داڑھی۔ بدرنگی جینز پر چیک کی قمیص انداز بے فکرا سا تھا مگر آنکھوں میں ذہانت اور گہرائی تھی۔ عدینہ کا ہی ہم عمر تھا۔

اسے یاد آیا۔

خالہ دادی کا کمرے میں سامان سیٹ کرنے کا حکم سن کر وہ دیے گئے کمرے میں چلی گئی تو پیچھے عدینہ بھی آگئی تھی۔ اسے خالہ دادی نے اس کے مددگار کے طور پر بھیجا تھا۔ مگر وہ نروٹھے پن سے کرسی پر ٹک گئی اور کھلتے بند ہوتے بیگ اور دیگر اشیا کو دیکھتی رہی۔

وہ اپنے کپڑے، جوتے کتابیں، ڈائریاں دیگر سامان رکھتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھتی رہی جو سراسر ناقدانہ جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی کسی شے کو اٹھا کر دیکھ لیتی۔ پسندیدگی ناپسندیدگی کا تاثر آنے نہیں دیتی تھی بس اٹھایا دیکھا اور رکھا۔

کیا آپ کی سوتیلی امی آپ پر ظلم و ستم کرتی تھیں؟" اس نے اچانک بہت ہی عجیب و غریب سوال کردیا۔

وہ بری طرح چونکی "نہیں۔ نہیں بالکل نہیں۔ تمہیں ایسا خیال کیوں آیا؟" وہ پوری طرح متوجہ ہوگئی۔

"نہیں وہ دادی جان ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ یعنی آپ کی سوتیلی امی نے بظاہر اچھا بن کر اندر ہی اندر بھاگنے کا پلان طے کررکھا تھا۔ میٹھی چھری سی۔"

بشائر کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"ایسا نہیں ہے' دراصل ان کی ساری فیملی آئی مین بہن بھائی اور والدین سب وہاں شفٹ ہوگئے سو وہ بھی بچوں کے مستقبل کے لیے یقیناً۔"

"میں نہیں کہہ رہی۔ دادی جان ہی ہر وقت کہتی ہیں۔ ہمیں لگا آپ۔ آپ بہت بے چاری سی ہوں گی۔ اجڑی بچھڑی سی۔ مگر آپ تو۔" وہ کپڑوں کے ڈھیر اور دیگر اعلا چیزوں کو ایک نظر دیکھ کر جیسے کچھ جتا کر خاموش ہوگئی۔ بشائر ہولے سے مسکرا کر دوبارہ سامان اکٹھا کرنے لگی۔

"ویسے آپ کتنے سال کی ہیں؟" بہت دیر کی خاموشی کے بعد عدینہ کی آواز گونجی۔

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مڑی "ستائیس واں برس لگا ہے ابھی لاسٹ منتھ۔"

عدینہ کے لبوں پر مسکراہٹ کا کوندا لپکا۔

"میں اکیس کی ہوں۔" اس نے نجانے کیا جتانے کے انداز میں کمر سیدھی کی تھی (کچھ بچپن کچھ سطحیت)

بشائر باوقار انداز میں مسکرائی۔ "اچھا! مجھے لگا تم اٹھارہ برس تک ہوگی۔"

"واقعی!" عدینہ کے چہرے پر خوشی ابھری۔

"ہاں بالکل سچ' اگر تم نہ بتاتیں تو۔" عدینہ کا چہرہ بجھا (ہائے چپ ہی رہتی۔ مگر خیر میں نہ بتاتی تو دادی جان سن' دن' تاریخ' ٹائم تک بتانے سے نہیں چوکتی تھیں) بشائر نے دل میں آئے خیال کو زبان تک آنے سے روکا کہ اگر وہ اتنا تیار نہ ہو اور صرف منہ دھو کر رکھے تو شاید سولہ برس کی دکھائی دینے لگے۔ مگر وہ کام میں لگ گئی۔

وہ اس کے مزاج کا اندازہ نہیں کرپائی تھی۔ کچھ عجیب سے تاثر کے ساتھ۔ روٹھی ناک چڑھی' خود پسند

سی دکھائی دیتی لڑکی۔

"بخت اور میں ایک ہی روز پیدا ہوئے۔ وہ صبح میں شام کو۔ نکما ہے۔ بس پڑھتا ہی رہتا ہے۔ کام وام کچھ نہیں۔ وہ دادا جان کے دوست کا چھوٹا بیٹا ہے۔ پتا ہے اس کے ابا دادا کے ہم عمر ہیں۔ دادا جان دادا بن رہے تھے اور وہ اسی دن ابا۔ ہاہاہا۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر ہنسی۔

بشائر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا بس وہ مسکرا دی۔

"اچھا تو یہ وہی بخت تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ بڑا معصوم سا شریر مگر اپنائیت دیتا ہوا۔"

☼ ☼ ☼

"میرے ابا اس شہر کے چنیدہ لوگوں میں سے ہیں حیرت ہے آپ انہیں نہیں جانتیں؟" بخت بولا "اور آپ نے انہیں ابھی تک دیکھا نہیں' افسوس۔"

"آئی ایم سوری۔ میں اتنا باہر نہیں نکلی ابھی" بشائر شرمندہ ہوگئی۔ وہ آج بخت کی امی شمسہ بیگم کی چائے کی دعوت پر جارہی تھی۔ بخت لینے آیا تھا۔ عدینہ بھی ساتھ تھی مگر وہ ان سے چند قدم پیچھے تھی۔ دونوں کے گھر گلی کے آخری گھر تھے۔ ایک گلی کا پہلا گھر دوسرا اسی لائن کا آخری گھر۔ عدینہ گھروں کے باہر لگے پودوں سے پھول پتے چنتے نروٹھے پن سے چلتی تھی۔

میٹرک تک دونوں ایک ہی اسکول میں تھے اور جیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔

"کیوں میں نے آپ کو اس دن بک ورلڈ میں دیکھا تھا ناں۔"

"ہاں تو میں میگزین لینے گئی تھی ناں!" بشائر بولی۔

"تو بک ورلڈ میرے ابا ہی کی تو ہے۔" بخت نے زور دے کر کہا۔

"بک ورلڈ تمہارے ابو کی ہے۔ مجھے تو بہت اچھی لگی وہ جگہ۔" بشائر متاثر نظر آئی۔

"ہے ناں۔ دراصل میرے ابا!" بخت شروع ہوا چاہتا تھا۔ "میرے ابا کو دور ہی سے شناخت کیا جاسکتا ہے کیونکہ جیسے کہا ناں وہ اس شہر کے۔"

"ہاں جی۔ وہ۔ وہ واحد آدمی ہیں جو ابھی تک شیروانی کے ساتھ جناح کیپ پہنتے ہیں۔ اب تو میوزیم میں بھی یہ ڈریس نہیں ملتا۔"

بخت کا جملہ حلق میں دبارہ گیا۔ پیچھے سے عدینہ نے کمانڈ سنبھال لی۔

"اے عدینہ کی بچی! میرے ابا کے بارے میں کچھ اگر تم بولیں تو۔" بخت نے مکا تان کر دکھایا بشائر گھبرا کر پیچھے ہوئی۔

"لو بلاوجہ' میں نے تمہارے ابا کو کب کچھ کہا۔ جو کہا شیروانی کو کہا۔ کیوں بشائر؟"

عدینہ کب رعب میں آتی تھی۔

"ارے ارے ایک منٹ۔ تم بولو بخت! میں سن رہی ہوں اور تم چپ رہو عدینہ۔" اس نے دونوں کو دیکھا۔

"ہاں تو میرے ابا ایک عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ سے ملنے والے سارے پیسوں سے کتابوں کی دکان کھول لی حالانکہ لوگوں نے کہا بے وقوفی کررہے ہیں۔ پیسے کہیں انویسٹ کردیں مگر وہ نہیں مانے۔ کون کون سی کتابیں ہیں جو انہوں نے نہ رکھی ہوں۔ نئی پرانی' نایاب سی نایاب۔ ہر سنڈے فٹ پاتھوں سے کتابیں چھانٹتے ہیں۔ دراصل میرے ابا!"

"سارے پیسے اس لیے لگادیے کہ بڑا بیٹا امریکہ سے ڈالر بھیجتا ہے پھر ایسے آلتو فالتو کے کاموں میں تو دل لگنا ہی ہے ناں۔" عدینہ نے گویا پیچھے سے بخت کی پسلی میں چھرا گھونپا۔

"عدینہ کی بچی پیسے کی میت۔ آج عظیم انکل کو سب بتا کر تمہاری شامت نہ بلوائی تو کہنا بلکہ رابعہ آنٹی سے تمہارا حشر کرواؤں گا۔" بخت کا غصہ سے برا حال ہوگیا۔

عدینہ "ہونہہ" کہہ کر خاموش ہوگئی۔ لیکن دراصل اسے اندر ہی اندر احساس ہوا بخت کو چڑانے کے چکر میں غلط جملہ بول دیا ہے۔ شمسہ آنٹی اپنے

میاں کے مشغلے کو اگر ناپسند کرتی تھیں یا کہتی تھیں کہ گھر امریکہ والے بیٹے کے پیسے پر چلتا ہے ان کی بک ورلڈ کچھ خاص آمدنی نہیں دیتی تھی۔ تو بہرحال یہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ اور نوک جھونک تھی۔ عدینہ کے کانوں پڑی۔ اسے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لہٰذا وہ ہونٹ سکوڑے خود میں مگن چلی جارہی تھی۔

بخت بشائر کو اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ اپنے ماضی کا شاندار اکیڈمک ریکارڈ، مستقبل کے خواب۔ ڈگری سے زیادہ اہم علم ہے اسے علم حاصل کرنا ہے بس وہ دولت کی اہمیت سے تو واقف ہے مگر اس کے ناگزیر ہونے پر اسے اعتراض تھا۔ عدینہ اس کے خوابوں سے خیالوں سے بخوبی واقف تھی۔ بخت کی ساری خواہشیں اور خواب اس کے برے منہ کی "اونہہ!" تھے۔

وہ خود پسند تھی۔ نخریلی، مزاج دار، اپنی ذات سے پیار کرنے والی، میں کا کلمہ پڑھتی ہر سو "میں" دیکھنے والی اپنی خوشی حاصل کرنے والی ہر اچھی شے پر اپنا حق جتانے والی۔ بلکہ حق کیا جتانا۔ فیصلہ۔ یہ چیز اچھی ہے ہاں تو بس اس کی ہے اور۔

"میں جانتا ہوں میری عمر کے لڑکے بہت بڑے خواب دیکھتے ہیں۔ میں بھی دیکھتا ہوں مگر خواب ہمیشہ انفرادی فائدے کی تعبیر نہیں بننے چاہئیں۔ خواب تو اقبال نے بھی دیکھا تھا۔ اپنے دل کو اتنی وسعت دینے کی ضرورت ہے کہ اس میں سارے عالم کی بہتری کا گمان جگہ بنالے۔ جاگتے میں سوچی گئی اچھی باتیں اور ارادے خوش کن خواب بن کر رات کو پلکوں میں ستاروں کی طرح ٹک جاتے ہیں۔ ہم اجتماعیت سے دور ہٹ گئے ہیں۔ مجھے اپنی زندگی بہتر کرنی ہے۔ اتنی بہتر کہ پھر ہر سو بہتری پیدا ہو۔ مجھے اپنے خوابوں سے عشق ہے اور اس کے علاوہ۔"

بہت خوشی سے بولتا بخت شاید بھول گیا، وہ کہاں ہے۔ کیا کہہ رہا ہے۔ کس سے کہہ رہا ہے۔ بولتے بولتے جیسے کہیں دور چلا گیا تھا۔ نجانے کیا کہتے کہتے رکا۔ پھر دھیرے سے ہنس دیا۔

"تم کتنی اعلا سوچ رکھتے ہو بخت۔ میرے پاس تو جیسے الفاظ ختم ہوگئے۔"

بشائر ساکت رہ گئی۔ وہ حرف حرف کو امرت کی طرح حلق سے اتار رہی تھی جیسے۔

"میں نے بہت عرصے بعد بلکہ شاید پہلی بار روبرو ایسے گہرے لفظ سنے ہیں۔ اور اپنے خوابوں کے علاوہ کس سے عشق ہے؟ جملہ مکمل کرو۔ تم نے کہاں سے سیکھیں ایسی باتیں بخت۔" وہ شاید بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیتی۔

"ہاں اور تو کوئی آتا جاتا ہے نہیں۔ خود ہی اپنی "بک ورلڈ" میں بیٹھا کتابیں گھول گھول کر پیتا رہتا ہے۔" عدینہ سے بخت کی اتنی تعریف اور بشائر کا سحر زدہ رہنا زیادہ دیر برداشت نہ ہوا۔

(تم تو جلتی رہنا) بخت نے بے پروائی سے چہرے پر تاثرات سجائے۔

"میں جانتا ہوں۔ میری عمر کے لڑکے بڑے بڑے عہدوں، گھروں گاڑیوں کے خواب دیکھتے ہیں اسٹیبلش ہوجانے کی لگن میں کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ آج میرے پاس ایک سائیکل ہے مگر کل۔"

"کل اس پر غبارے اور پھینیاں ہوں گی۔ اور میں گلی گلی آواز لگاؤں گا بچوں کے کھلونے لے جاؤ۔ پھونک کے پگانے، ٹک ٹک کا بندر۔" بخت کا جملہ کاٹ کر عدینہ نے جل کر پیشن گوئی کی۔ بشائر حق دق رہ گئی اس نے گھبرا کر بخت کو دیکھا جو پہلے حیران ہوا اور پھر زوردار آواز سے ہنس دیا۔

بشائر کو اس کی بے ساختگی پر ہنسی آگئی تو عدینہ بھی ہنس پڑی۔

"ایسے لڑکے اب پوری دنیا میں دو چار ہی ہوں گے باقیوں کو گدو بندر بھیجا جاچکا ہے اس کے بارے میں اگلوں کو ابھی پتا نہیں ہے۔"

عدینہ نے ہنسی روک کر اسے صاف پاگل کہا۔ بشائر

کی رکی ہنسی پھر شروع ہوئی۔ بخت نے غصے کے بجائے بہت دلچسپی سے عدینہ کے ہنستے چہرے کو دیکھا۔

☆ ☆ ☆

بشائر کے آنے سے پہلے عدینہ کے بہت سے اعتراضات تھے جنہیں اس نے اونچی آواز سے بھی اور بڑبڑ کرتے ہوئے بھی رابعہ خاتون کے کانوں انڈیلا تھا۔

"اب ایک آدھ دن کی مہمان داری تو بندہ کرلے یہ نجانے کب تک رہے گی۔"

"تو تم کیا نوالے بنا کر ڈالوگی۔ اللہ نہ کرے جلتے ہاتھ کی لڑکی۔ او بی بی کچھ ایسا ہوتا بھی خدانخواستہ تو تمہارے چلن سے کون واقف نہیں۔ تمہیں کوئی نہ کہتا۔" رابعہ خاتون نے جل کر آئینہ دکھایا۔ "مہمان تو اللہ کی رحمت۔ پتا نہیں کیسے بس اکیلے اکیلے جی کر لطف اٹھاتی ہو بنّی۔ نہا دھولیا، کپڑے بدل، بس شیشہ میں منہ دیکھ لیا۔ کبھی گھوم گھوم کر اپنا سراپا ہی دیکھ کر خوش ہولیں۔ کبھی جل کر بلاوجہ منہ دھونے، کپڑے بدلنے چلی گئیں۔ اپنے ہی فیصلے، ارے لوگوں میں گھلو ملو، دیکھو کوئی اچھا ہے تو کیوں؟ برا معلوم ہوتا ہے تو وجہ کھوجو، اپنی شخصیت کا تجزیہ کرو، سیکھو۔ یہ کیا بس میں ہی میں۔"

رابعہ خاتون کو اپنی پوتی عدینہ سے بہت سی شکایتیں تھیں اس کی تربیت میں انھوں نے اپنے سارے ہنر لگائے تھے۔ مگر وہ اپنی ہی فطرت کی تھی۔ اپنی پرستش کرتی۔ خود پر نثار ہوتی تھی یا پھر۔

رابعہ خاتون کی گہری نگاہ جانتی تھی۔ وہ سب دیکھتی تھیں اور سمجھتی تھیں وہ اس کے اخلاق و کردار کو فطری، لچک دار اور وسعت سے بھرپور دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اس کے مصنوعی پن اور خود ساختہ اطوار سے ناگواری محسوس کرتی تھیں۔ وہ خود کو نمک کا بنا پیش کرتی تھی۔ پانی کے چھینٹے سے گھل جانے والی سوائے بخت سینت کر رکھا جائے۔ وہ سوچتیں وہ تو سنبھال کر رکھ رہی ہیں۔ بخوشی بہ رضا مگر زندگی ہر انسان پر جب تک اپنے سارے پہلو آشکار نہ کردے۔ اختتام پذیر نہیں ہوتی۔

رابعہ خاتون عدینہ کے حوالے سے ڈرا کرتی تھیں اسے گرم ہوا بھی نہ لگے۔ وہ سب پالے۔ وہ مسکرائے، گنگنائے، اپنے دل کی نرمی کو نصیحت، پیام، پیش بندی بنا کر اسے سدھارنے کے جتن کرتیں۔ وہ اپنی زندگی کے حوالے سے شکر گزار تھیں۔ غم اور خوشی دونوں زندگی کے لازمی جزو ہیں مگر وہ اپنے بوڑھے لاچار دل کو مزید کسی صدمے کا متحمل نہیں پاتی تھیں۔

عدینہ کے والدین کی حادثاتی موت۔ بیٹا، بہو اور پوتا پل بھر میں دم توڑ گئے، زخمی پوتی کو دعاؤں کے بل پر وہ جیسے موت کے شکنجے سے کھینچ لائیں۔

پوتی کی زندگی کی خواہش نے جانے والوں کا ماتم منانے کی بھی اجازت نہ دی۔ وہ اس میں مگن ہوگئیں۔

اور پھر اکلوتی بیٹی مریم کی زندگی کا دکھ۔ آہ! وہ جیسے ہر پل گھلتی تھیں۔

بیٹی کی مسرت و شادمانی، کاملیت کی دعا۔ ایک روز بخشش کی دعا میں بدل گئی۔ وہ اجڑی، بکھری روئی پیٹی اور واپس پلٹ گئی۔ جہاں پلٹنے کا وعدہ ہر ذی روح نے کر رکھا ہے۔ مگر جاتے جاتے ایک بار تو گردن گھما کر پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہاتھ ہلایا جاسکتا ہے ایسے ایک دم تو کوئی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

"بس اس کی خبر آگئی۔ کہ وہ اب نہیں ہے۔ مجھے ہمیشہ لگتا تھا۔ وہ اتنا جبر سہہ نہیں پائے گی مرجائے گی۔ یہ خدشہ مجھے ڈراتا تھا۔ اور جب خدشہ حقیقت کا روپ دھار گیا تو۔ پوچھو مت۔ ہم کس طرح پہنچے کہیں اندرون سندھ میں پوسٹنگ تھی داماد صاحب کی۔ پہلے ٹرین پھر کار پھر گھوڑا گاڑی۔ وہاں ان کا سارا خاندان جمع تھا۔ بس ہمارا ہی انتظار تھا۔ سفید کفن میں وہ سفید دکھائی دیتی تھی۔ نیل لگائے کپڑے جیسی ساکت۔ میں تو اسے رو بھی نہ سکی نہ میں نے اسے چھوا۔ وہ تو ٹھنڈی مٹی کا ڈھیر تھی۔ میری بیٹی تو نہیں

تھی۔ گلابی عارض' لمبی پلکیں' پنکھڑی جیسے لب۔ میں نے تو گلاب کا پھول داماد صاحب کے کوٹ میں لگایا تھا۔ وہ مجھے کیا لوٹا رہے تھے۔ کیا دکھا رہے تھے جیسے میں کچھ جانتی نہیں تھی' مجھے سب خبر تھی۔

مگر وہ ایسے اچانک میدان چھوڑ دے گی۔ اس کا میں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔"

بشائر بہترین سامع تھی وہ رابعہ خاتون کو سنتے وقت چہرے کے تاثرات سے انہیں بڑھاوا دیتی تھی۔ مزید بولنے پر اکساتی تھی۔

رابعہ خاتون ہر وقت دکھ رونے پر آمادہ نہیں رہتی تھیں۔

مگر ان کے دل کے اندر گھاؤ تھے۔ آج بشائر کے ہاتھ مرہم دیکھا تو سسک اٹھیں۔

"وہاں شور تھا' آوازیں' شکایتیں' صفائیاں۔ سب خود کو مظلوم اور مر جانے والی ہی کو قصوروار کہتے تھے۔ دیکھو تو قصوروار مر گیا۔ اور باقی سب زندہ۔" رابعہ خاتون نے جھریوں بھرے گال پر دوپٹے کا پلو رگڑا۔

"اس کے کپڑے۔ اس کے زیور جو میں نے اسے دیے تھے۔ سب وہ میرے حوالے کر رہے تھے۔ وہ مجھے بس بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے بیٹی دیکھ لی تھی۔ میرے سامنے دفنا دی گئی تھی۔ اب مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں اس کے کمرے سے جو مرضی اٹھا لیتی۔"

وہ روتی جا رہی تھیں۔ بشائر منہ سے کچھ نہ بولی بس صوفے سے کھسک کر ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے گھٹنے پر دونوں ہاتھ رکھ دیے وہ چہرہ اٹھائے ان کے بھیگے چہرے کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کے گال پونچھے۔

"نہ روئیں دادی۔ ورنہ میں بھی رو دوں گی۔" اس نے کارگر جملہ کہا۔

"اسی لیے میں کبھی انہیں کندھا دیتی نہیں پھر یہ اپنی حالت خراب کر لیتی ہیں۔" عدینہ نے بشائر کو تادیب کی ڈھکے چھپے لہجے میں سمجھایا۔

"نہیں روتی۔" انہوں نے عدینہ کا گال سہلایا۔

پھر وہ بشائر کی جانب دیکھنے لگیں۔ "کہنے سننے والی اگر ایک ہی بات کہوں تو۔" وہ پل بھر کو رکیں۔

"ماؤں سے کہوں۔ بیٹیوں کو بس کوکھ ہی میں رکھو وہیں پالو۔" وہ بس وہیں محفوظ ہوتی ہیں۔ پیٹ سے نکل گئیں تو بس۔ پٹتی رہتی ہیں۔ ہاتھوں سے۔ جملوں سے اور تقدیر کے فیصلوں سے۔ بیٹیاں تو بس کوکھ ہی میں محفوظ۔"

ان کا رونا بند ہو گیا۔ مگر بشائر یکدم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ہر شخص کا ایک دکھ۔

"میں نے اس کے کمرے کی کسی چیز پر نگاہ نہ ڈالی بس مانگا تو اس کی جیتی نشانی۔ اس کے بیٹے کو۔ اور وہ انہوں نے منع کر دیا۔ وہ کیوں دیتے۔ ملنے بھی نہ دیا۔"



"تو بیٹی! کیا ہی اچھا ہوتا کہ تمہارے ابو تمہاری شادی ہی کر کے چلے جاتے۔" شمسہ بیگم نے بہت دنوں سے روکے جملے کو کہہ ہی ڈالا۔ بشائر شانے اچکا کر رہ گئی۔ اب وہ کیا کہتی۔

"کوئی رشتہ وشتہ دیکھتی تھیں تمہاری راحیلہ امی؟"

بشائر نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ بدگمانی نہیں پالتی تھی مگر اب سوچا تو ان گزرے ڈیڑھ دو سال میں امی کی جانب سے رشتوں کی قطاریں لگ گئی تھیں۔ کئی لوگوں سے ملوایا اور کئی لڑکے بھی اس نے دیکھے اور اسے بھی دکھایا گیا۔

یہ ایک عجیب و غریب معاملہ تھا۔

ابو ذات برادری اور زبان کے حوالے سے قطعی تھے۔ نو کمپرومائز۔

امی رکھ رکھاؤ' انداز' معاشی حالت کا ذکر کرتی تھیں سماجی مقام میچ ہونا اس کی اپنی خواہش۔ اس نے پہلے کبھی گہرائی سے سوچا نہیں تھا۔ مگر بعد میں ایک روز اس روز روز کے دیکھنے دکھانے سے اکتا کر اس نے سوچا۔ وہ خود کیا چاہتی ہے؟ ہاں اس کی اپنی خواہش۔

کیوں منع کر دیتی ہے؟ آخر کیوں؟

مینٹل لیول' اعلا تعلیم' اخلاق و کردار اس کے بل بوتے پر کوئی بھی شخص درخور اعتنا نہ لگتا۔

اس نے بہت دن تک اس الجھن میں رہنے کے بعد اپنا تجزیہ کیا۔

وہ خطرناک حد تک حسن پرست واقع ہوئی تھی۔ منہ کھلنے سے پہلے ہی شخصیت کا تاثر مکمل ہونا چاہیے۔

اس نے اپنے من کے اندر بسی شبیہہ کو پزل بکس کے ٹکڑوں کی طرح دھیرے دھیرے ترتیب وار لگایا۔ نتیجہ۔ ہاں حقیقت میں اسے دور دور تک کوئی شخص بھی خیالی صورت کے قریب نہ لگا۔

تو پھر کیا ضروری ہے کہ سمجھوتا کیا جائے۔ "قصداً" اور "جبراً" خود کو بتلایا جائے کہ بس یہ ٹھیک ہے۔ وہ اپنی شخصیت میں مکمل تھی۔ خاندان' ذات' تعلیم اور شکل و صورت وہ پرفیکٹ تھی تو پھر وہ کیوں ... مارکس دے کر بمشکل کامیاب بندے کو ایوارڈ ... اندھوں میں کانا راجہ' ڈھونڈنے کی کیا تک ... اچھا ملے گا تو ٹھیک ہے اور اگر نہ ملا۔ تو بھی ٹھیک ہے۔

اور اب سال چھ ماہ کے لیے وہ جیسے ہر شے سے آزاد تھی۔ ٹی وی پر نیوز دیکھنا۔ ٹاک شوز کے گھنٹوں میں ارد گرد سے بے گانہ ہونا ورنہ اخبار و رسائل اور کتب بینی۔ اور زندگی کتنی حسین ہے۔

مگر اسے یہاں آکر اچھا لگا تھا۔ بہت اچھا۔ رابعہ خاتون کی محبت' لگاوٹ' فکرمندی' خیال۔ عظیم خان کا بے حد پرشفقت' دوستانہ محبت سے بھرپور شریر انداز۔

شمسہ بیگم بھی گویا اسی گھر کا حصہ تھیں۔ وہ روز صبح نو بجے آتیں اور ساڑھے بارہ تک اپنی اور رابعہ بیگم کی کہانیاں سنا کر دنیا جہان کے قصے کر کے لوٹتیں۔

شام میں دل گھبرانے کا خیال کر کے رابعہ خاتون چلی جاتیں۔

سہ پہر اور رات میں بخت کے چکر لگتے۔ اسے بخت اچھا لگا تھا۔ آج کے نوجوانوں سے بہت مختلف۔ الگ سا۔ خوابوں میں رہنے والا مگر تعمیری خواب۔ اجتماعیت کے خواب' فکرمندی' گرد و پیش کی بہتری کے خیالات۔ شمسہ بیگم کو اپنی اس بڑھاپے کی اولاد سے بہت پیار تھا۔ وہ اپنے ابا کا پوتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تین اور بچے آج کے زمانے کے حساب سے ترقی کے دوڑ میں تن من کے ساتھ دھن کی فکر میں مگن تھے۔ بڑا صاحبزادہ اور بڑی بیٹی امریکہ میں تھے۔ چھوٹی دو بیٹیاں ایک ہی گھر میں بیاہی تھیں اور کوئٹہ میں رہتی تھیں۔ سال کے سال آتیں۔

عدینہ جی بھر کے بخت کا مذاق بناتی۔ اسے بڈھی روح اٹھارہ سو بارہ کا نوجوان کہتی۔ کبھی کہتی "یہی سوچ رہی تو وہ مزاروں پر جھاڑو پھیرا کرے گا۔" اسے چڑاتی۔

مگر۔

اس تمام کارروائی سے پرے بشائر نے دیکھا اور محسوس کیا۔ بخت اسے چڑاتا تھا۔ جان بوجھ کر۔ وہ اتنا بھی نان پریکٹیکل نہیں تھا مگر عدینہ کے سامنے بالکل ہی درویش منش بن کر آتا۔ شمسہ بیگم کو تو وہ بہت پیاری تھی بلکہ وہ اکثر شمسہ بیگم کے آگے رابعہ خاتون کی شکایتیں لگاتی پائی جاتی تھی۔

بشائر نے قطعیت سے سوچا بخت کے خیالات سے پرے۔ عدینہ۔ نہیں۔ وہ مادہ پرست تھی۔ ظاہری شوشا کی کسوٹی میں پرکھنے والی۔ نہیں وہ بخت کے لیے کوئی بھی خیال نہیں رکھتی تھی۔ مگر بخت بہت اچھا تھا۔ ایسا نوجوان جسے دیکھ کر پاکیزگی' ذمہ داری' خوشی کا خیال آتا۔ یونہی بلاوجہ پیار آجائے۔ اس سے منہ موڑنا بدبختی ہوتا۔ یقیناً۔

مگر نہیں۔ عدینہ۔ بشائر جانتی نہیں تھی۔ وہ دیکھتی تھی۔ بہت پیار سے مگر کسی اور کو۔



"تمہاری کزن بہت اسمارٹ ہے عدینہ!" عدینہ کی کوئی پکی سہیلی نہیں تھی۔ مگر آئی ہوئی تینوں لڑکیاں

بچپن سے ہم جماعت تھیں اور ایک اپنے بھائی کی شادی کا کارڈ دینے آئی تھی۔ بشائر پر ڈالی جانے والی سرسری نگاہ بھی بڑا گہرا تاثر قائم کرتی تھی۔

"اور ان کی ہائٹ۔ اف' اب کہاں نظر آتی ہے ایسی نزاکت۔ کسی ماڈل کے جیسی ہیں۔" دوسری نے بھی مدح سرائی کی۔

"بہت ڈیسینٹ سی ہیں۔" تیسری نے بھی حق ادا کیا۔

عدینہ کچھ حیرت اور کچھ ناگواری سے۔ مصنوعی مسکراہٹ سے سرہلاتی رہی۔ ایسا شاید پہلی بار ہوا تھا کہ اسے موضوع بنانے کے بجائے اس کی موجودگی میں کسی اور کو سراہا جارہا تھا جبکہ۔ گولڈن ویلوٹ کے سوٹ میں گولڈن بالوں کے ساتھ وہ سنہری گڑیا دکھائی دے رہی تھی۔ سرخ اونی سلیپر۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے نزاکت سے بیٹھی اپنے لہراتے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلاتی محو گفتگو تھی۔

بشائر بہت محبت سے ان تینوں سے ملی اور فریج ٹٹولتی عدینہ سے بہت محبت سے کہا کہ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھے' وہ کچن دیکھ لیتی ہے۔ عدینہ نے اگلے منٹ ہی ہاتھ ڈھیلے کردیے اس کا ذہن واضح تھا۔

"ہاں وہ ان کے گھر میں گھر کا فرد بن کر رہنے آئی ہے تو گھر کا بندہ ہی بنے ناں۔" اس نے رابعہ خاتون کے ایک آدھ بار جتانے پر قطعیت سے کہا۔

رات کا کھانا جو وہ مارے باندھے سو احسانات کے بعد بناتی تھی بشائر کے آنے سے اس سے بھی پیچھے ہٹ گئی۔

رات کی ہنڈیا جو عدینہ کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ بشائر پلک جھپکتے ہی بہت سلیقے اور ذائقے سے بنادیتی۔ عدینہ پوچھ پوچھ کر روٹیاں ڈالتی تھی۔ آٹا گوندھنے سے ناخن ٹوٹنے کا ماتم۔ چولہے کے پاس کھڑے ہونے سے اسے رنگ جلنے کا اندیشہ جلاتا۔ برتن دھونے کے لیے دستانے چڑھالیتی۔ اور کبھی کبھی کوڑے دان میں کچرا ڈالنا دنیا کا مشکل ترین کام۔ وہ باقاعدہ الٹیاں کرتی۔ دن بھر کے لیے ماسی آتی تھی۔

لیکن کیا شام کو گندے ڈھیر پر بیٹھے رہیں۔ سرابو خاتون بہت نارمل رویے سے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتیں۔ لڑکیاں ہر کام کرنے کی عادی ہونی چاہئیں۔ اور کسی کام میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ گندگی سمیٹنے ہی سے صفائی و پاکیزگی ملتی ہے۔

عدینہ کی نزاکت و لطافت' اداؤں میں مصنوعی پن تھا۔ یا ارادی کوشش مگر اب عادت بن چکی تھی کہ نخریلی۔

جبکہ بشائر سراسر فطرت تھی۔ پانی کے بہاؤ جیسی بے ساختہ۔

وہ ڈارک گرے شلوار قمیص کے ساتھ ہلدی رنگ کی شال کندھے پر ڈالے سیدھی کھڑی تھی۔ گردن میں بڑی نازک سی چین باریک تھی اور گردن کے گرد یوں لپٹی تھی۔ جیسے گرن کی موٹائی کا ناپ دے کر بنوائی ہو۔ چپکی ہوئی۔

"میں ذرا بک ورلڈ تک جارہی ہوں' وہ ان سے معذرت کرتی عدینہ کو مطلع کرکے نکلی۔ اس نے عدینہ کی طرح نکلنے سے پہلے نہ تو پرفیوم اسپرے کیا تھا نہ ہی آئینے میں خود کو گھوم گھوم کر دیکھا تھا نہ تیز تیز برش کیا۔ وہ سر پر دوپٹا نہیں لپیٹتی تھی۔ شال ایک کندھے پر ٹکی تھی اسے الٹا کر دوسرے پر چڑھادیا۔ وی سی بن گئی۔ بالوں میں انگلیاں۔ بس تیار۔

عدینہ کے دماغ میں کلک سا ہوا۔ ہاں۔

☼ ☼ ☼

"دادا جان' اچھا لگتا ہے کیا۔ عظیم خان کے گھر سے دوپٹا گلے میں پٹے کی طرح ڈالے لڑکی نکلے اور اخبار ہاتھ میں لیے ارد گرد سے بے گانہ پڑھتے پڑھتے بک ورلڈ جائے' واپسی میں کتاب پڑھتی آئے۔ لوگ سوچتے نہیں ہوں گے عظیم خان اتنے ماڈرن کب سے ہوگئے۔"

"آں ہاں۔" عظیم خان اصل ایشو کو پکڑنے میں ناکام ہوگئے۔

"بولیے دادا جان! مجھے تو کہتے ہیں سر ڈھک کر نکلو۔

پر جھکا کر جاؤ' تیز قدموں سے چلو تاکہ کم سے کم وقت راستے میں رہو اور۔"

"تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟" عظیم خان اکیلے بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔

"تو آپ کو یہی پتا نہیں چل رہا۔" وہ بھنائی "آپ مجھے سن ہی نہیں رہے۔" وہ رو ٹھی۔

"نہیں نہیں سن رہا ہوں۔ تم اخبار' کتاب کا ذکر کررہی تھیں۔ ایسا ہے پوتی! کہ جاتے ہوئے وہ اخبار پڑھ رہی ہوتی ہے۔ ہے ناں' ابھی تم نے بتایا۔" پوتی کو اعتراض نہیں کرسکتے تھے۔

"تو واپسی میں اخبار ختم ہوجاتا ہوگا۔ اس لئے کتاب شروع کردیتی ہوگی۔"

عظیم خان نے معصومیت سے جواب دے کر اس کا چہرہ دیکھا اب اور آگے بولو کوئی اور مسئلہ۔

عدینہ نے چند پل ٹھہر کر انہیں دیکھا پھر پیر پٹختی باہر کو ...

اگلا ٹارگٹ رابعہ خاتون تھیں۔

"لگتا ہی نہیں لڑکی ہیں کہ لڑکا یہ گدی خالی۔ مجھے تو وحشت ہوتی ہے۔"

"بھئی۔ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی تیسری جماعت کی بچی ہے۔ جو میں آگے بٹھا کر پونیاں کسنے لگوں۔"

"مجھ پر تو آج تک فیصلے صادر کرتی ہیں آپ۔ یوں کرو۔ یوں نہ کرو۔" وہ جل کر بولی۔

"تم کیا چاہتی ہو' صاف بات کرو۔" رابعہ خاتون اسے بخوبی جانتی تھیں۔

"مجھے کیا کہنا ہے بس الجھن سی ہوتی ہے۔ وہ ایسی لگتی ہے۔ ایسا ہی منڈا سا کچھ۔"

"کرنے والی بات کیا کرو۔" رابعہ خاتون نے صفا جواب دیا۔ "خود کو دیکھنا نہیں بس دوسروں کے عیب تلاشو۔ ہمیں بھی برے لگتے ہیں تمہارے یہ مرغی کے پنجے۔" انہوں نے اس کے بڑھے ہوئے ناخنوں کو ناگواری سے دیکھا۔

"اچھے خاصے بالوں کو جوکروں کی طرح رنگ کر گھومتی ہو۔ چلو سنہری تو سمجھ میں آئے۔ یہ لال' سرخ اور نیلی لٹیں کیوں چہرے پر گرا رکھی ہیں؟ یہ ٹی وی فلموں والوں ہی کے کرنے کے فیشن ہیں۔ چار چار کان چھدوا کر بیٹھی ہو۔ بیٹی تم لڑکی ہو یا بکری۔ جھومتی بجتی۔ اتنا بھی کیا سنگھار کا شوق۔ ہونہہ! مجھے تو ڈر لگتا ہے کسی دن ناک کے درمیان سوراخ کروا کر نتھلی پہنے نہ آجاؤ' دادی جان کیسی لگ رہی ہوں ہونہہ۔"

"دادی!" وہ حلق کے بل چلائی۔ دادی نے ذرا بھی لفٹ نہ دی۔ وہ اون کے گولے کو تیار کررہی تھیں۔ منہ موڑ کر تن دہی سے لگی رہیں۔

پورے دو دن تک سب سے منہ بسورنے کے بعد وہ خود ہی من گئی۔ دادی تو ہمیشہ سے ایسے ہی تھیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ بشائر باہر جاتے وقت اپنے گرد بڑے اچھے طریقے سے چادر لپیٹ کر نکل رہی تھی۔ اور بجائے خوش ہونے کے عدینہ کا منہ بن گیا۔ دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ زیادہ نمایاں ہو کر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کے وقار اور رعب میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا گویا۔ اور رابعہ خاتون نے بالوں پر بھی گفتگو کرلی تھی۔ اسے ماسی ہی سے پتا چلا۔

بشائر گیارہ برس کی تھی لمبی چوٹی۔

وہ چولہے کے پاس کھڑی تھی۔ رخ موڑ کر اپنے ابو سے بات کرنے لگی۔ آگے پڑی چوٹی کو پیچھے پھینکا تو وہ جلتے چولہے سے ٹکرا گئی۔ منٹ کے اندر بال جلنے کی خوشبو۔ سجاد صاحب نے تیر کی سی تیزی سے چوٹی گدی سے کاٹ دور اچھال دی۔

بشائر کی خوف زدگی سے زیادہ سجاد صاحب کا حال برا ہوا۔ فوری طور پر گلی کے نائی کے پاس لے کر گئے اور یہ ہیئر اسٹائل دیا پھر ہر ماہ جب اپنی حجامت بنواتے تو بشائر ساتھ ہوتی۔

بعد میں راحیلہ آنٹی اسے پارلر لے جانے لگیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بشائر کا خوف تو غائب ہوگیا۔ مگر سجاد صاحب کسی طور نہ مانے۔ بشائر کی چھوٹی بہن کو بھی اجازت نہ ملی بلکہ وہ راحیلہ کو بھی اوپر جوڑا بنواتے

تھے۔
اور اب تو بشائر۔ اس ہیئر اسٹائل کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے اب یہی پسند تھا۔
عدینہ کو دونوں جگہ خفت اٹھانا پڑی۔



"کسی بھی انسان سے پہلی بار ملنے پر سب سے پہلے اس کی کس چیز سے متاثر ہوا جاسکتا ہے؟"
بشائر نے خود سے نجانے کتنی بار یہ سوال کیا؟ اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں مختلف جواب گردش کرنے لگے۔
"نہیں انسان نہیں۔ مرد کی کیا چیز سب سے پہلے متوجہ کر سکتی ہے؟" اس نے بہت دیر بعد تصحیح کر کے سوچ کی درست سمت کا تعین کیا۔
"چہرہ۔ آنکھیں ہاں آنکھیں۔ اف! اس نے بھرجھری لی کران سنہری آنکھوں کو سوچا۔ آج بارش کے بعد سردی میں شدت تھی اس نے خود کو کمبل میں سموتے ہوئے آنکھیں موندیں۔
"ناک۔ شاید یونانی دیوتاؤں جیسی تھی۔ اتنی تیکھی، سیدھی نوکیلی۔ پتا نہیں کیسی۔
اور اس کا ہیئر اسٹائل۔ جب بشائر نے پہلی نگاہ سے اسے دیکھا وہ برآمدے کی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ اس نے گرے ہائی نیک پہن رکھی تھی۔ سیاہ کوٹ۔ اس کا دراز قد بشائر کی نگاہیں بلاارادہ اوپر سے نیچے سفر کرتی گویا لمبائی ناپ رہی تھیں۔ وہ کون تھا؟
آنے والا اندر داخل ہونے سے پہلے سگریٹ کا آخری کش لینا چاہتا تھا۔ شاید وہ اندر آ کر سگریٹ نوشی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے طویل کش کا دھواں نیم وا ہونٹوں سے باہر کی سمت نکالا اور دونوں ہاتھ ہوا میں چلا کر جیسے دھوئیں کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ منہ کھول کر بھاپ سی باہر نکال رہا تھا۔
ایک اجنبی مین گیٹ سے لان اور لان سے برآمدہ کراس کرتے گول کمرے کے دروازے میں یعنی اندر آیا ہی چاہتا ہے۔ وہ کچن ونڈو سے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ دھیان آنے پر آنچ دھیمی کرتی باہر آئی تب تک وہ اندر داخل ہو کر صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے جھکا ہوا تھا۔
"آں ہاں۔ ہیلو!" وہ کھنکھاری "آپ کون؟"
آنے والے نے جھکے سر کے ساتھ فقط نگاہیں اٹھائیں۔ گہری۔ اداس کھوئی کھوئی سی فراز نے سونے والوں کی طرح، جاگنے والوں جیسی کی تشبیہ یقیناً کسی عورت کی آنکھوں کے لیے استعمال کی تھی۔ کاش وہ ان آنکھوں کو ہی دیکھ پاتے۔ اچھا چلو ذرا بھر کو سوچو۔ فراز نے ان آنکھوں کو دیکھا۔ تو پھر کیا ہوگا؟
"ہشت بشائر!" وہ اپنے خیالات پر گڑبڑائی۔ "کوئی سنے تو کیا کہے۔ ایک مرد کی آنکھوں کی اتنی مدح سرائی۔ آں ہاں۔ اف!"
وہ جوتا اتارنا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بشائر کو لگا وہ پل بھر کو حیرت زدہ رہنے کے بعد مسکرایا۔ پلک جھپکنے کی ساعت برابر کی مسکراہٹ۔ اس نے اوپر نگاہ کر کے جیسے کسی اور ذی روح کو کھوجا۔
"مجھے چھوڑیے۔ آپ یقیناً" بشائر ہیں بشائر سجاد۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال بڑے آرام سے بولا۔
"ارے!" بشائر کی آنکھیں پھیلیں۔
"میں مامون ہوں۔ مامون ابصار۔ نانو کہاں ہیں اور عدی، ناناسب۔"
بشائر نے سمجھ جانے کے انداز میں سرہلایا تو موصوف خالہ دادی کے نواسے تھے۔
"وہ ذرا مارکیٹ تک۔ اور دادا جان شاید نماز کے لیے۔" اس نے گردن گھما کر گھڑی دیکھی۔
"اس کا مطلب ہے کھانے میں وقت لگے گا۔" یہ شاید خود کلامی تھی۔ وہ دوبارہ جوتے اتارنے کو جھک گیا تھا۔
وہ اب شاید اوپر جانے کا قصد کر رہا تھا۔ بشائر کو دھیان آیا۔
"اگر آپ کو بھوک لگ رہی ہے تو میں کھانا لگا سکتی ہوں"۔

"آپ لگالیں گی؟" وہ عدینہ کے نخروں اور انکار کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

"جی ہاں!" بشائر نے حیرت کا اظہار کیا "یہ کون سا بڑا کام ہے" جواب کے لیے کھلتے ماموں ابصار کے ہونٹ فون بیل کی آواز نے سکیڑ دیے نمبر دیکھ کر وہ بہت آرام دہ حالت میں صوفے پر ٹک گیا۔

صوفے کی بیک سے سر ٹکائے وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے محو گفتگو تھا۔ پھر اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ اب وہ اپنے ہاتھ کو دھیرے دھیرے اپنے پیر پر پھیر رہا تھا۔

سالن نکالتے ٹرالی سجاتے بشائر کا حلق خشک سا تھا اور ہاتھوں میں کپکپاہٹ اس کے لیے باعث حیرت تھی۔

اگر خالی شکل دیکھ کر نمبر دیے جاتے تو وہ سو میں سے دو سو حاصل کر چکا تھا مگر باقی سب چیزیں۔ پہلی نظر میں محبت ہو سکتی ہے۔ نہیں ناں۔

۔ماجرا دراصل یوں تھا کہ

وہ شخص اپنے ظاہری حلیے کے ہر پہلو سے اس شخص اس آئیڈیل مرد کے تصور پر پورا اترا تھا جسے اس نے اپنے خیالوں میں تراش رکھا تھا۔

طے یہ ہوا کہ یہ سب پہلے سے طے تھا۔ میرا یہاں آنا۔ اس شخص کو دیکھنا۔ اس سے ملنا اور کیا۔ پانا ؟

ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ ضروری ہے اہم ترین۔ کردار گفتار اشعار اور ...... اور کیا اور اظہار۔

۞ ۞ ۞

خوشی کے پل۔ پلک جھپکنے جیسے۔
محبت کی عمر۔ اتنی مختصر۔
زندگی میں محبت آئی تھی۔ مگر اتنے چھوٹے سے وقفے کے لیے۔

فقط چوبیس گھنٹے کی طمانیت، خوشی، معطر احساس۔ بے ترتیب دھڑکن۔ ایک جوار بھاٹا۔ محبت طوفان کی طرح آئی۔ ہر شے کو تہس نہس کر گئی۔ شور چنگھاڑیں اٹھاتا سب بہالے جانے طوفان۔ اور اب طوفان کے بعد کا سناٹا سناٹا اور بس۔ اس نقصان کا تخمینہ کیسے لگایا جائے۔

چوبیس گھنٹے پر محیط محبت کا ماتم باقی کی ساری زندگی منایا جائے ..... کہاں کی عقل مندی ہے بشائر سجاد۔ کون بھلا وہ شخص ماموں ابصار اور ...... اور عدینہ ہاں۔

پچھلی رات اس کے وجود کے گرد محبت کی گرما گرمی لپٹی تھی۔ اس کے سکون کے کیا کہنے اور آج کی رات محبت نہیں تھی۔ کمبل کے اندر گلیشیئر جیسی ٹھنڈک تھی۔ وہ کروٹیں بدل بدل تھک گئی۔

بعض دفعہ ڈسپلے کیے گئے سوٹ پر بک چکا ہے کا ٹیگ لگا ہوتا ہے ہم ہی اپنے جوش میں دیکھ نہیں پاتے۔ اس میں دکان دار یا خریدار کا کیا دوش۔ ہمارے ہوش کہاں تھے؟

ہر اچھی چیز ہماری نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنی نم پلکوں پر خود کو سرزنش کی۔ ایسا بھی کیا بچپن۔ ایسا بھی کیا اتاؤلا پن۔ ایسی سطحیت۔

عظیم خان کھڑکی کے نزدیک کرسی گھسیٹ کر نیم دراز تھے۔ ٹانگیں سیدھی لمبی موڑھے پر ٹکی تھیں چہرے پر آج کا اخبار اوندھا پڑا تھا اور رانوں پر ان کا زمانوں پرانا ٹیپ ریکارڈ پڑا تھا۔

کھڑکی پر سفید جالی کا پردہ تھا اور چھن کر آتی دھوپ ان کے پورے جسم پر پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی پسندیدہ غزلیں اور گیت سن رہے تھے۔

بشائر کچن کی سامنے والی کھڑکی سے انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کس قدر سکون آفرین مکمل منظر تھا۔ سرما کی دھوپ۔ سرما کی خاموشی۔ سرما کا فسوں سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ رابعہ خاتون کی بتائی ترکیب سے نرگسی کوفتے بنا رہی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے ہانڈی کے اندر ہرا دھنیا چھڑکا۔ اس کے اپنے بنائے کوفتوں میں قیمہ اکڑ جاتا تھا اور انڈا نظر آنے لگتا تھا۔ اس نے احتیاط سے ڈوئی میں کوفتہ اٹھایا وہ فل کور تھا۔ واؤ۔ اس نے شہادت کی انگلی سے اسے ہلکا سا گھمایا کامیابی کی مسکراہٹ ابھری مگر اگلے ہی لمحے

معدوم ہو گئی ٹیپ سے ابھرتی آواز۔

شام فراق اب نہ پوچھ آئی اور آئی کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
شام فراق۔

وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ ذہن جیسے یکدم خالی ہو گیا۔

"کیا واقعی شام فراق اتنی آسانی سے ٹل جاتی ہے۔" ایک بے حد ٹہری مگر چبھتی آواز۔ وہ بری طرح چونکی۔ بخت ٹرے میں کچھ لایا تھا۔ بصد احتیاط رکھتے ہوئے اس کی مخاطب وہی تھی۔ اس نے اس کے جملے کو دل ہی دل میں دہرایا۔

"کیا کہہ رہے ہو بخت! میں سمجھ نہیں سکی؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ کیا واقعی شام فراق ٹل جاتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ رک جاتی ہے۔ ہمیشہ کے لیے جیسے ڈوبتے جہاز کی گھڑیاں بند ہو جاتی ہیں۔ شام فراق بھی ساکت حالت رکھتی ہے۔ اور جن دو آسان الفاظ میں شاعر کہہ رہا ہے دل بہل گیا۔ جان سنبھل گئی۔ حقیقت میں دل کب سنبھلتا ہے۔ دل لڑکھڑا جائے تو بندہ منہ کے بل یوں گرتا ہے جیسے دلدل میں جا گرا ہو۔ دھیرے دھیرے اندر دھنستا۔ سب آپ کو دلدل میں غرق ہوتا دیکھتے ہیں۔ سہارے کے لیے ہاتھ کوئی نہیں بڑھاتا۔

دل غریب کی جھونپڑی کی چھت بن جاتا ہے۔ محض خدشے پر بھی ٹپکنے لگتا ہے۔ اور شاعر کہتا ہے۔ دل سنبھل گیا۔ ہونہہ!"

بخت کے ہاتھ ابھی تک لائی ہوئی ٹرے پر ٹکے تھے۔ بشائر نے دوسری جانب سے ٹرے پر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ چونکا اور پھر اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

"کیا ہو گیا۔ تمہیں کیا اس غزل کی تشریح لکھنی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو بس اس ساری شاعری پر بہت اعتراض ہے۔ سراسر بکواس۔ اس سب کو کہنا گانا سننا آسان ہے مگر عمل۔ ناممکن۔"

بشائر کے ہاتھ ابھی تک ڈھلی ٹرے پر تھے۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر ڈھکن اٹھایا کھلے کھلے سفید چاولوں کا مٹر پلاؤ کونے پر دھرا سلاد اور رائتہ، خوشبو۔ واہ اس کی نظریں پلاؤ پر جم سی گئیں۔

"اتنا ناممکن بھی نہیں ہے۔ دل اور جان عقل کے مطیع ہوتے ہیں۔ انہیں سیدھا کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ کو شاعر پر یقین ہے؟" وہ آواز دبا کر چلایا تھا۔

"ہاں!" بشائر نے آہ کی صورت اثبات دکھائی "مجھے اس پر یقین ہے۔"

وہ چاول ڈش میں پلٹنے کے بعد برتن دھونے سنک کی جانب مڑی۔ بخت کا انداز کس قدر اچنبھے میں ڈالنے والا تھا۔ ہاں مگر اسے عقل پر یقین تھا

سنک کے سامنے والی بڑی کھڑکی پچھواڑے کی جانب کھلتی تھی۔ یہاں کپڑے دھلتے تھے اور عدینہ کے طوطوں کے پنجرے تھے۔ کچھ آرائشی بیلیں اور پودے۔

وہ زیادہ سے زیادہ دھوپ حاصل کرنے کے لیے دیوار کے ساتھ کرسیاں جوڑے ماموں کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ پیلے رنگ کے سوٹ پر سبز شال چہرے کے گرد لپٹی تھی اس کے ناخنوں پر سرخ پالش تھی اور زمین پر اس کے سرخ گرم سلیپر پڑے تھے۔ وہ کرسی پر پاؤں اوپر رکھ کے بیٹھی تھی۔ گود میں کینو کی پلیٹ تھی۔ وہ کینو چھیل کر پھانکیں جھاڑ جھاڑ خود بھی کھا رہی تھی اور ماموں کو بھی دے رہی تھی۔ اس کی ناک کی لونگ پر دھوپ پڑ رہی تھی اور لشکارا مقابل کے چہرے پر پڑتا تھا۔ یا کبھی طوطے کے سیاہ پنجرے پر جھلمل سی ہوتی۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔ دھیما اور اونچا مگر دونوں صورتوں میں آواز کچن کے اندر تک نہیں آ رہی تھی۔

ماموں کرسی پر بے حد ڈھیلا سا نیم دراز تھا۔ وہ بہت گھریلو سے حلیے میں تھا۔ بے حد گورے صاف پیروں میں نیلی ہوائی چپل۔ جینز کے پائنچے ایک بل سے مڑے تھے۔ ٹی شرٹ کے بٹن کھلے تھے۔ مگر اس نے شرٹ پیچھے کی جانب گرا رکھی تھی۔

عدینہ ارد گرد سے بے گانہ تھی۔ نجانے کون کون سے قصے تھے۔ کون سی باتیں کیسی باتیں۔ جو چلتی ہی رہتی تھیں۔

نجانے اس وقت کیا قصہ تھا۔ عدینہ جوش سے بولتی پھر بھنویں چڑھاتی پھر سکیڑتی۔ ماموں کی ساری دلچسپی عدینہ ہی کی جانب تھی۔ وہ ہمہ تن گوش تھا مسلسل مسکراہٹ اور طمانیت تو چہرے پر چھائی ہی تھی۔ قصے کے موڑ کبھی ہنسی لے آتے کبھی حیرت و بے یقینی۔ کبھی وہ بند آنکھیں کھول کوئی سوال پوچھ لیتا۔ وہ دونوں جیسے ایک دوسرے میں گم تھے۔ وہاں تیسرا کوئی نہیں تھا۔

اور اگر ہوتا بھی تو انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی۔

"عدینہ آسٹریلوی طوطا لگ رہی ہے۔" اس نے بخت سے یونہی کہا جھینپ مٹانے کو۔

"ہوں!" بخت نے ذرا سا آگے ہو کر کھلا پٹ بند کر دیا۔ "طوطا چشم بھی کہیے۔"

"ارے۔" اس کی ہنسی نکل گئی۔

"ٹھنڈی ہوا آرہی تھی" بخت نے پٹ بند کرنے کی توجیہہ پیش کی بشائر کا دھیان پلٹا۔ ٹھنڈی نہیں۔ گرم صحرا کے گرم تھپیڑے بگولے اور دھول جو آنکھوں میں مرچیں بھرتی ہے۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔

"عظیم انکل کی آج کی پسند ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے شام فراق کا نوحہ۔ اب محبت کے انجام کی اطلاع۔ پوتی زخم لگاتی ہے۔ دادا نمک مرچ لے کر بیٹھا ہے۔ آپ نے ایسی کیمسٹری کبھی دیکھی؟"

وہ ناسمجھی کے عالم میں بخت کی بات سن رہی تھی۔ اس نے گردن نکال کر عظیم خان کو دیکھا وہ اے محبت پر گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے گویا سردھن رہے تھے۔

"ایسے سر تو مجھے پٹخنا چاہیے۔ ہے ناں۔ مگر ہم تو وہ ہیں کہ۔

"میں نے صبر کیا۔ صبر بھی قیامت کا۔"

وہ بے چارگی سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"آں!" بشائر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "بخت۔ بخت اور عدینہ۔ ارے!"

"آج تو ان نرگسی کوفتوں کی نرگسی کٹار بھی زخموں پر پھاہا نہیں رکھ سکے گی۔ میں چلا۔"

وہ یکدم تیزی سے باہر نکل گیا۔

بشائر نے دونوں ہاتھ ڈھیلے پن سے سلیب پر ٹکا دیے۔ انکشاف۔

اے محبت تیرے انجام۔ مغنیہ کی گردان۔ آہ۔



رابعہ خاتون اور شمسہ بیگم اپنے مخصوص تخت پر براجمان تھیں۔ حسب معمول رابعہ خاتون سبزی بنا رہی تھیں جبکہ شمسہ بیگم کروشیہ سے کچھ بن رہی تھیں۔ تبدیلی یہ تھی کہ بشائر شمسہ بیگم سے چپکی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی قمیضوں کے دامن پر کروشیہ کی باریک بنائی چاہتی تھی۔

شمسہ بیگم نے اس کے گال پر دھیرے سے ہاتھ پھیر کے پچکارا "میں تمہیں بنا دوں گی بیٹا۔"

"وہ تو آپ ابھی بنائیں گی ہی۔ مگر مجھے سیکھنا ہے۔ آپ بس سکھا دیں۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"تو سیکھ لو۔ میں کیا اپنا فن قبر میں لے کر جاؤں گی۔"

وہ راضی تھیں مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنے بہت سے دن بعد بھی اسے کروشیہ ہی پکڑنا نہیں آیا اور پھر دھاگہ لپیٹنا۔ مصیبت۔ دھاگہ لپٹ گیا تو کروشیہ پھسل جاتا اور اگر کروشیہ سنبھال لیتی تو۔

وہ اس وقت بھی جی جان سے ان سے لگی بیٹھی تھی، تب عدینہ کی ہیل کی ٹک ٹک پر وہ باقی دو خواتین کی طرح چونکی۔ سیاہ و سفید کاٹن کا جدید تراش کا سوٹ پہنے سیڑھیاں اتر کر آرہی تھی۔ اس نے سیاہ باریک ہیئر کلپ ماتھے سے گزار ذرا سا پف دے کر کس رکھا تھا۔ پیچھے لمبے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ بالوں میں ہلکی سی نمی باقی تھی۔ اس کے پیروں میں لمبی ہیل کی

بنی تھی۔ بشائر کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔ اس نے مسکرا کر اشارہ دیا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔

عدینہ شان بے نیازی سے مسکرائی۔ اس نے تعریف کو حق سمجھ کر وصول کیا تھا۔ کہ وہ اتنی اچھی ہے کہ اسے سراہا جائے اور اس نے کتنی محنت بھی تو کی ہے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" جیسا سوال شمسہ بیگم کی جانب سے آیا۔ تب ہی بشائر کی قوت شامہ نے اسے الرٹ کیا۔ اسے بخوبی اندازہ ہوا پیچھے ماموں ہے جو نزدیک آتا جا رہا ہے چابی کی آواز۔ اوہ تو وہ دونوں کہیں باہر جا رہے تھے۔ جب ایک چیز آپ کی ہے ہی نہیں تو بلاوجہ ندیدوں کی طرح حسرت۔ پرائی شے کو دیکھنا۔ یہ تمہاری تربیت تو نہیں تھی کبھی بھی کہ تم دوسروں کے مال۔ بشائر نے خود کو سمجھایا۔ لفظ مال پر اسے ہنسی آگئی۔ ماموں الصار۔ مال ہی ہی۔ بی میچور بشائر سجاد۔

"دیکھیں شمسہ آنٹی! دھاگہ پھر کھل گیا۔" اس نے مصنوعی عجلت اور پریشانی سے کہا۔

"ارے بیٹا۔" شمسہ بیگم اس کی سمت مڑیں۔ اس نے سر نیچے جھکا لیا۔ وہ نہ اس طرف دیکھے گی۔ نہ فساد برپا ہوگا۔

"ماموں مجھے گھر دکھانے لے جا رہے ہیں۔ وائرنگ کے بعد فانوس وغیرہ لگے ہیں اور کچن کے لیے آئیڈیا سلیکٹ کرنا ہے۔ کیبنٹ کلر اور۔" عدینہ، رابعہ خاتون کو جواب دے رہی تھی۔

"او اچھا چلو، ہو آؤ۔" رابعہ خاتون نے سر اثبات میں ہلایا۔

عدینہ کی ہیل کی ٹک ٹک تخت کے پاس سے گزری اور دروازے تک۔ ٹک ٹک کی آواز چلنے والے کی دلی کیفیت کی ترجمان تھی گویا۔ فخر بے فکری، سکون، غرور۔

"اے سنو ماموں! عدینہ! رکو۔" رابعہ خاتون کو نجانے کیا خیال آیا۔ "یہ اپنی بشائر کو بھی لے جاؤ۔ جب سے آئی ہے، کہیں گھومنے پھرنے نہیں نکلی۔

اب ہم بڈھا بڑھیا کہاں لے کر گھومیں۔ سمندر تک نہ دکھلایا۔ تم ہی ساتھ لے لو۔ ذرا سی سیر بھی ہو گی اور دل بھی بہلے گا۔ یہاں ہم دو بڑھیوں میں بیٹھتی ہے۔ یا تمہارے دادا کے پرانے ریکارڈ سنتی ہے۔"

"میں ارے نہیں!" بشائر نے چونک کر سر اٹھایا۔ ساتھ ہی نگاہ سیدھی ماموں پر گئی۔ وہ غور سے سننے کے بعد اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

"نہیں میں کروشیا سیکھ رہی ہوں۔ میں کیسے جا سکتی ہوں۔"

اس نے عدینہ کا چہرہ دیکھا جہاں حیرانی ناگواری تھی اور اس کی آنکھیں انکار سننے کی متمنی تھیں۔ بشائر اتنی چہرہ شناسی کا دعوا تو کر سکتی تھی۔

"نہیں دادو! ان کا اپنا پروگرام ہے۔ میں کیسے۔ میں پھر کسی دن دیکھ لوں گی ابھی تو یہیں ہوں۔"

نہیں بشائر! آپ پلیز چلیے۔ بلکہ مجھے پہلے ہی کہنا چاہیے تھا۔ مجھے لگا آپ بہت مصروف رہتی ہیں۔ لیکن پلیز اگر آپ فرصت سے ہیں تو۔ جوائن از۔"

"ہاں۔ ہاں جاؤ" رابعہ خاتون کا سر بھی زور سے ہل رہا تھا۔

"میرے کپڑے۔" اس نے کل کے کپڑے پہنے تھے جو اب مسلے مسلے تھے۔ ویسے وہ کپڑوں کی فکر پالنے والی نہیں تھی۔ مگر بہانے کے طور۔

"اب آجائیں۔ کیا کپڑے بدلیں گی۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے" عدینہ کی آواز میں اکتاہٹ، جھلاہٹ اور ناپسندیدگی تھی۔

اس نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر ماموں کو دیکھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہ ملنے پر اشارے سے جلدی کا کہا۔

اس نے فوری فیصلہ کیا گلابی شلوار دوپٹے کے بیچ دودھیا کرتا تھا۔ اس نے گلابی دوپٹی پیروں میں پھنسائی۔ تین چار بار بالوں کے گچھے میں انگلیوں پھیریں تو بال بالکل تازہ دم سے ہو کر ماتھے پر گر گئے۔ اس نے تخت کی جانب سے گھوم کر آتے ہوئے قمیص

کی شکنیں ہاتھ سے درست کیں۔

ماموں کی گاڑی میں جانا تھا۔ عدینہ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوپٹا شانے پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس نے عظیم خان کی ہدایت موجب اپنے گرد گلابی دوپٹا لپیٹ لیا۔

"مجھے اچھا لگے گا کہ اگر اچھی بیٹی باہر نکلتے وقت خود کو اچھی طرح لپیٹ لپاٹ لے۔ یہاں بڑے بڑے لوگ بھی تو رہتے ہیں ناں۔" بچوں کو ڈرانے کے لیے بنایا جانے والا پراسرار سا لہجہ۔ مگر وہ بچی نہیں تھی۔ وہ دوبارہ کبھی کھلے سر نہیں نکلی۔

وہ سارا راستہ اردگرد کے منظر سے لطف لیتی رہی۔ اس نے قصداً ایک بار بھی ماموں ابصار کو نہ دیکھا۔ ہاں عدینہ ریموٹ سے گانے بدل بدل نجانے کون سی جھلاہٹ اتارتی رہی۔



اس کی گود میں نور تھا۔ روشنی، چاند، چاند کا ہالہ۔ خوشبو احساس۔

مکمل۔ یقین دعا۔ اس کا گڑگڑانا۔ رونا تڑپنا۔

اس کے سجدے۔ اور سجدے کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتے۔ ان کا صلہ دنیا میں ملتا ہے ورنہ آخرت میں۔ اس نے دنیا میں مانگا تھا۔

اور۔

اور اسے مل گیا تھا۔

جون کی تپتی گرم دوپہر جب چیل انڈا چھوڑ دے۔ اس کے لیے ٹھنڈی وادیوں سے آتی نم دار خوشبو سے بوجھل ہوا بن گئی تھی۔

ایک تکلیف۔ انتہائی۔

ایک انتظار۔ قیامت کا۔

ایک نظر۔ ترسی ہوئی۔

اس نے ابھی ابھی نہلایا ہوا تولیے میں لپٹا بچہ تھاما۔ وہ دنوں سے بے جان تھی اور تولیے کو کھولتے ہوئے اس کی توانائی چوکڑیاں بھرتی ہرنی جیسے ہو گئی تھی۔

اس نے تولیے کی گٹھڑی کھول دی۔ وہ ٹانگیں مارتے مٹھیاں بند کرکے بیچ بیچ کر روتے بچے کو بے یقینی سے تکتی جاتی تھی۔ اس کے رونے کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ مگر اسے اس رونے سے کوئی تکلیف نہ تھی۔ اسے یاد تھا۔

اس کا پہلا بچہ۔ وہ اس نا سمجھ میں آتے انسانی وجود سے مشابہ بچے کو خوف کے عالم میں تکتی رہی تھی۔ وہ بچہ مردہ تھا۔ بہت بڑا سر مگر اس کی کھوپڑی بہت پتلی تھی اور بازو۔ جیسے شانے سے دو پتلی چھڑیاں چپکا دی ہوں۔ توبہ استغفار۔ اس نے ایسے بچے کو جنم دیا۔ ہائے وہ غش کھا کر گر گئی۔

"اللہ اپنے پیارے بندوں کو آزماتا ہے۔" اس کی ماں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔

"بس اللہ سے معافی طلب کرنی ہے اور توبہ کرنی ہے بس۔" اس کے باپ نے کہا۔

"میں اللہ کو اتنی پیاری ہوں ای!" اس نے معصومیت سے ماں کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں بہت پیاری۔" اس کی امی نے اس کا بھیگا چہرہ چوما۔

بہت جلدی ــ اس بچے کی تدفین کی گئی۔ اس کی ساس نندیں توبہ توبہ کرتی تھیں۔ مگر اللہ کے آگے نہیں۔ اسے سنانے کو۔ دکھانے کو۔ اس کا شوہر نا سمجھی کے عالم میں کچھ کترایا سا پھرتا تھا۔ مگر پھر ماں بہن کے سمجھانے پر اس کا سینہ تن گیا۔ یہ عورت ہی ایسی ہوگی۔ جس نے ایسا بچہ۔ (توبہ استغفار) بچے ماں پر جاتے ہیں۔ (باپ کا پرتو بھی ہوتے ہیں) اور ماں۔ وہ انیس برس کی نازک حور جیسی۔ جس کا چہرہ دیکھ دیکھ دل نہیں بھرتا تھا۔ اس کا بچہ۔ اور۔ ایسا؟

"امی! میرے لیے دعا کرنا۔" وہ ماں کے آگے گڑاتی۔

اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو دیکھا تھا۔ جو بہت تندرست اور مکمل دکھائی دیتا تھا مگر وہ پیدائش کے وقت رویا نہیں تھا۔ اور چند گھنٹوں میں پتا لگا۔ اس کا سر معمول سے کچھ زیادہ بڑا ہے۔

چند دنوں میں کچھ اور انکشافات۔

چند مہینوں میں سب کچھ واضح۔

اور چند سالوں میں زبان زدعام ہو گیا۔ مریم کا بیٹا ایک ایب نارمل بچہ تھا۔ اس کی نظر ٹھہری نہیں۔ اس نے سر بھی نہیں ٹھہرایا۔

وہ روتی، تڑپی، مچلی اور شکوہ کناں۔

اور سب سے بڑھ کر سارا دوش اس کا نکلا۔

پھر اس کی زندگی کا، خوشیوں، خواہشوں کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ چلا گیا۔

"بس اور بچے نہیں۔"

اور پھر ان پانچ سالوں میں اس نے اپنا تجزیہ کیا۔ پہلے بچے کی دفعہ وہ مطمئن تھی۔ ہاں وہ ماں بننے والی ہے۔ بیٹا یا بیٹی۔ بچوں جیسا بچہ۔ بلکہ اسے بچے کی خوبصورتی کا یقین تھا۔ وہ گوری گلابی تھی اور شوہر کا رنگ بھی صاف۔ ان دونوں کے نقش دل نشین تھے۔ دونوں اپنی جگہ جاذب نظر تھے۔ بچہ ماں باپ یا خاندان ہی کے نقش لے گا۔ مگر۔ ایسا نہیں ہوا۔

دوسری بار وہ دعاؤں اور استغفار پر آگئی۔ منتیں مرادیں۔ مگر ان سب پر حاوی خدشات تھے اور خدشات مجسم ہو کر سامنے آتے ہیں۔

ایک ایب نارمل بچہ۔ ہا۔ اللہ۔

"اللہ کی انصاف پسند نگاہ تمہارے اوزان پر تھی۔ تمہارا ایک پلڑا دعاؤں سے لدا پڑا تھا۔ مگر جب تولا گیا تو دوسرے پلڑے میں موجود خدشات بھاری نکلے۔ جو دعا کرتا ہے۔ وہ خدشہ نہیں پالتا۔ ہم دعا نہ بھی کریں مگر یقین کر لیں تو کامیابی دم چومتی ہے۔ تم سے غلطی ہوئی بیٹا۔" ابو کے دوست نے اس کے بلک بلک کر رونے پر سارا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ لمبی مثالیں یا الزامات کے بجائے صاف بات کہہ۔ یہ جا وہ جا۔

اور پھر اس نے اس بات کو سوچا اور بہت سوچا۔

اور تیسری بار اس نے بے فکری، لاپروائی سے یقین کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک مکمل توانا بچے سے نوازے گا۔

ہاں ... اس بار اس کا بچہ بالکل ٹھیک ہو گا۔

اور تولیے میں ہلتے بچے کو دیکھ کر اسے اپنے یقین پر یقین ہو گیا ہاں یقین اہم ہے باقی سب لن ترانی۔ اللہ پر یقین، ہاں وہ دے گا۔

وہ بچے کو الٹ پلٹ کر، چھو چھو کر دیکھ رہی تھی وہ مکمل تھا چار ماہ بعد بھی۔ ابھی بھی۔ چار سال بعد بھی۔ ہمیشہ۔ ٹیسٹ خیال گمان ڈاکٹر سب۔ مگر اسے یقین تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔

ڈاکٹرز کا دیا گیا ٹائم پیریڈ مختلف ٹیسٹ۔ انتظار۔ وہ چار ماہ کا ہو کر نظر ٹھہرائے گا۔ سر ٹھہرائے گا قلقاریاں مارے گا۔ پکارنے پر دیکھے گا۔ آواز پر چونکے گا۔ چھوٹی چھوٹی موومنٹس۔ ایک مستقل آبزرویشن، سارے گھر کے افراد ہمہ وقت اسے دیکھتے نوٹ کرتے۔ وہ بہت خوبصورت بچہ تھا اور گل گوتھنا وہ مکمل طور پر ماں سے مشابہ تھا۔ ہاں قد کاٹھ یقیناً "باپ پر جاتا۔

دادی جب جب اسے پھلتا پھولتا دیکھتیں تو منہ پھیر کے تھتھکار دیتیں۔ اس کے گلے میں تعویذ تھے۔ منتیں مرادیں۔

مگر وہ ماں تھی اور اس کا دل پر یقین تھا۔ اس کا بچہ ٹھیک ہے۔ بس اور جب اس نے دس ماہ کی عمر میں پہلی بار قدم اٹھایا۔ تب۔

اس نے باقی گھر والوں کی طرح نعرہ بلند نہیں کیا نہ اچھل کود کر بھنگڑے ڈالے وہ مسکراتی نگاہوں سے بچے کو دیکھتی رہی اور پھر سجدے میں گر گئی۔

اس کے شوہر نے بہنوں کو، بھانجیوں کو سونے کے زیورات دیے تھے لیکن اس نے موکس کے لیے وہیل چیئر مانگی تھی۔

"وہ تکیوں کے سہارے بیٹھ جاتا ہے۔ میں بٹھاؤں گی۔ مجھے کوئی سونا چاندی نہیں لینا۔ بس ایک وہیل چیئر۔ مجھے لگتا ہے وہ بیڈ پر پڑا مزید ناکارہ ہو رہا ہے۔ مجھے تو بس یہی چاہیے۔" اس کے لہجے میں ضدی پن آگیا۔

تمام حاضرین نے برے سے منہ بنائے۔ مگر وہ اپنی بات کہہ چکی تھی۔ وہ بچہ سب کے لیے ایک نمونہ یا بے کار چیز تھا مگر اس کے لیے وہ صرف اس کا بیٹا تھا۔ اس کا بچہ اس کی ممتا کی تسکین۔ اسے ساری دنیا سے پیارا۔

وہ جانتی تھی وہ اس بچے کو ٹھیک نہیں کر سکتی مگر وہ اسے کسی قدر آسانی تو دے سکتی ہے۔ ایک کوشش۔ ملال تو نہیں رہے گا ناں۔

اور اس نے کس مشکل اور سب کی ناگواری اور مسلسل شور شرابے کے درمیان اسے وہیل چیئر پر بٹھایا تھا۔ وہ کتنا چیخ رہا تھا وہ رو رہا تھا۔ اسے بیٹھنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر وہ بڑے ڈاکٹر سے پوری ہدایات لے آئی تھی۔ اسے کوشش کرنی تھی۔

اور وہیل چیئر پر اسے بیٹھا دیکھ کر وہ یوں خوش تھی جیسے بچہ ریس جیت کر آرہا ہو۔ فاتح۔ کاش وہ یہ کام پہلے ہی کر لیتی۔ مگر پہلے کوئی آتا بھی نہیں اس کے چہرے پر استہزاء آرکا چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے لیے حق میں اچھا ثابت ہوا تھا۔



وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو فٹ بال سے کھیلتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے سلکی بال ماتھے پر بکھرے تھے اور لال چہرہ وہ ہانپ رہا تھا مگر کھیل کا جنون کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔

اس کی لگائی کک سے فٹ بال اس کے قدموں میں آگری تو اس نے اس پر اپنا پیر رکھ کے بال کو ٹھہرایا۔
بچے نے چونک کر ماں کا چہرہ دیکھا۔
"امی! ہٹ کریں بال کو۔"
وہ بال اٹھا کر اس کے نزدیک چلی آئی۔
"مجھے تو کھیلنا آتا نہیں۔ کیسے ہٹ کرتے ہیں آپ سکھا دو گے؟"
اس نے اسے گود میں اٹھا لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔
"میں تو سکھا دوں مگر آپ تو میرے ساتھ رہتی ہی نہیں۔" معصوم لہجے کا بڑا سا شکوہ۔ مریم کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ یہ یقیناً" اس کے اپنے الفاظ نہیں تھے
"آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ نہیں رہتی۔"
"دادو کہہ رہی تھیں۔ اور وہ ماسی لوگ بھی کہ آپ کو صرف بھیا اچھا لگتا ہے۔" مریم کا دل مسلا گیا۔ اس نے اپنے اندر اٹھتے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کی۔
"اچھا یہ بتاؤ۔" آپ کو دنیا میں سب سے اچھا کون لگتا ہے؟
"مجھے۔ مجھے۔ اوم م م" بیٹے نے شہادت کی انگلی ہونٹ پر جما کر سوچنے کی مہلت لی۔
"امی آپ۔ بہت زیادہ پیاری ہیں۔" اس نے شاید ماں کی خوبصورتی کو سوچا تھا۔ محسوس کیا تھا۔
"ارے میرا بیٹا۔" اس نے بیٹے کے گال چومے۔
"ایک بات کہوں بیٹا!" اس نے بچے کے گرد بازو کسے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "میری بات غور سے سننا۔ اور ہمیشہ یاد رکھنا۔ آپ نے کہا' آپ سب سے زیادہ پیار مجھ سے کرتے ہیں۔ میں آپ سے کہتی ہوں' آپ سب سے زیادہ پیار مجھ سے نہ کریں۔ کبھی نہ کریں۔ بلکہ آپ بھی میری طرح سب سے زیادہ پیار اپنے بھیا سے کریں۔ آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ پیار اپنے بھیا ہی سے کرنا ہے۔ چاہے کوئی آپ کو کچھ بھی کہے۔ منع کرے یا جو بھی۔ ساری دنیا ایک طرف بھیا ایک طرف۔"
"لیکن کیسے پیار کروں۔ وہ نہ بات کرتا ہے نہ میرے ساتھ کھیلتا ہے بلکہ وہ تو مجھے دیکھتا ہی نہیں۔ اسے ٹام اینڈ جیری کا نہیں معلوم۔ اسے اسپائیڈر مین کا نہیں معلوم۔ اس نے کبھی میرے ساتھ کرکٹ میچ نہیں دیکھا امی!"
اس چھ سال کے بچے نے مدبرانہ انداز میں ہاتھ چلا چلا کر دلائل دیئے۔
"وہ تو چل کر نہیں آسکتا۔ درست۔ آپ کبھی گئے اس کے پاس کہ بھیا آج میں آپ کو ٹام اینڈ جیری دکھاتا ہوں یا اسپائیڈر مین کا بتایا۔ آپ بتاتے اور دکھاتے تو

اسے معلوم ہو جاتا ناں۔"

"او۔ امی!" بچے نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اپنی جانب سیدھا کیا۔ "میں سمجھ گیا۔ میں اسے سب کچھ بتادوں گا۔ ساری باتیں۔" اس نے ہلکی سی تیوری چڑھا کر ہوا میں اونچا ہاتھ چلایا۔

"مگر وہ میرے ساتھ کھیل نہیں سکتا۔ اس کے لیے کیا کروں؟" اس نے مسئلہ بتایا۔

"ہاں۔ یہ بات تو ٹھیک ہوئی۔" مریم نے مصنوعی طور پر چہرہ پریشان بنایا۔ وہ چند لمحے جیسے سوچ میں گم ہوئی "مگر بچے۔ آپ اسے یہاں لان میں لاکر بٹھا سکتے ہیں۔ اب جیسے آپ اکیلے اکیلے اتنے اچھے شاٹ لگا رہے تھے۔ بھیا خوشی سے تالیاں بجاتا آپ کو ایپری شیٹ کرتا۔ اسے تالی بجانا آتی ہے ناں۔ کتنا مزہ آتا۔"

بچے کی آنکھیں حیرانی سے نکلی تھیں اور ہونٹ نیم وا۔ پھر حیران آنکھوں میں تسلیم اور یقین بھرنے لگا۔ وہ قائل ہو چکا تھا۔ مریم نے اس کا چہرہ چوم لیا اور آنکھوں پر ہونٹ رکھے۔

"ایک بات یاد رکھو۔ جیسے امی دنیا میں سب سے زیادہ پیار بھیا سے کرتی ہے ویسے ہی آپ کو بھی دنیا میں سب سے زیادہ پیار اپنے بھیا سے کرنا ہے۔ نہ دادی، پھپھی نہ پاپا اور نہ ہی مما سے۔ آپ کو صرف اپنے بھیا کو پیار کرنا ہے۔ ہمیشہ۔"

رات کو سوتے وقت کلمہ پڑھنے کے بعد آپ نے خود سے کہنا میں اپنے بھیا سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میرا بھیا دنیا کا سب سے اچھا بھیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ کہو گے ناں؟"

بچے کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"میں سب سے زیادہ پیار بھیا سے کروں گا ہمیشہ۔"



تازہ پینٹ کی خوشبو اور چمکتے در و دیوار، ماربل کے فرش کی پالش میں چہرہ جھلکتا تھا۔ کارپینٹر کام کر رہے تھے۔ الیکٹریشن بجلی کے تاروں میں الجھے تھے۔

بشائر کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔ ہر شے میں ایک وقار اور توازن تھا۔ خالی کمرے اس قدر جچ رہے تھے سامان و آرائش کے بعد تو چھب ہی جدا ہوگی۔ اسے سب کچھ پسند آرہا تھا۔ سیاہ ماربل کی کچن سلیب ..... وہ اس کی چکنی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ سب ٹھیک تھا۔ تب ہی اس کے ماتھے پر شکن سی ابھر آئی۔ اس نے چاروں جانب دیکھا۔ پھر کچھ واضح ہونے پر شانے اچکا دیے۔ یہ کوئی اس کا اپنا گھر تھوڑی تھا۔ ہر شخص کی اپنی پسند ..... وہ دوسرے کمرے کی جانب بڑھی۔

عدینہ ماموں کے ساتھ ساتھ ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ ہر شے کی مدح سرائی میں رطب اللسان تھی۔ عجب مالکانہ استحقاق اور شان بے نیازی اس کی شخصیت کو نمایاں کر رہی تھی۔

ماموں بجلی والوں سے گفتگو کرتا ذرا باہر نکلا..... تو بشائر کے نزدیک آگئی۔

"کیسا لگا؟" اس کا اشارہ گھر کی طرف تھا۔

"بہت پیارا..... اللہ گھر کو شاد و آباد رکھے ہرا بھرا۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا دی۔

"ابھی صرف نچلا پورشن تیار ہوا ہے۔ ماموں کہتے ہیں۔ وہ اوپری پورشن کو ہر لحاظ سے نیچے والے سے مختلف بنائیں گے۔ اٹالین طرز پر..... یا جاپانی انداز میں ..... اور ہر کمرے کی سٹنگ میں ایک تھیم ہوگی۔ مگر دوسرے سے بالکل الٹ۔"

"روایتی سندھی ٹچ اور ایک کمرے میں بلوچی زمینی نشست جیسا انداز بھی رکھا جائے گا۔" عدینہ کے جملے کو اندر آتے ماموں نے مکمل کیا۔ بشائر نے فقط مسکرا کر تائیدی سر ہلایا۔

"سب کچھ ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ اللہ آپ کو رہنا بسنا نصیب کرے۔"

ماموں کی مسکراہٹ پر اس نے وضاحت کی نیا گھر دیکھ کے ایسے ہی الفاظ میں دعا دیتے ہیں۔

"دس از او کے۔ اینڈ تھینک یو فار یور پریئر۔"

"نہیں..... پھر آپ ان شاء اللہ بولیے..... دعا پر مہر لگ جاتی ہے۔" وہ مسکرائی۔ سگریٹ سلگاتے ماموں کے ہاتھ رکے چہرے پہ خجالت آئی اس نے ان شاء اللہ کہہ کر اپنی تصحیح "فوراً" کی۔

پہلے خجالت آمیز نگاہیں..... پھر جتاتی مسکراہٹ والی نگاہیں۔

بشائر نے نظر چرائی۔ وہ گھوم کر لکڑی کے دروازوں کے ڈیزائن پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ ماموں نے رخ پھیرا۔ وہ کھڑکی کے قریب چلا گیا تھا اور اب دوبارہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس نے پہلا طویل کش لے کر دھواں کھڑکی سے باہر چھوڑا۔ عدینہ اس کے مقابل کھڑی کچھ کہہ رہی تھی۔

بشائر دھیرے دھیرے ان سے دور کھسکی۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔ ماموں نے سیاہ جینز پر نیلی کاسنی شیڈ مارتی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کف موڑے وہ عدینہ کو کسی بات کا جواب دیتے ہوئے کش لے رہا تھا۔ دونوں کھڑکی کے فریم میں کسی تصویر کی طرح فٹ آرہے تھے۔ عدینہ گرد و پیش سے بے گانہ تھی۔ وہ بس ماموں کو دیکھتی تھی۔ سنتی تھی اور کہتی تھی۔ اس کے انداز میں ایک سرشاری، بے فکری اور بے حد خود اعتمادی تھی۔ اسے کسی شے کا خوف نہیں تھا۔

بشائر نے ذرا سا سوچا۔ عدینہ کبھی اعلا سطح کی گہری گفتگو نہیں کرتی تھی۔ بس اپنی کہتی تھی۔ اپنی پسند، اپنی مرضی، اپنی خواہش، "میں" کا قضیہ ..... وہ حالات حاضرہ کے دکھڑے نہیں پالتی تھی۔ فلموں، ڈراموں سے بھی بس معمولی شغف تھا۔ پھول، بوٹے، بہار، موسم، شاعر، موسیقی نہیں ان میں سے کوئی چیز بھی اس کا پسندیدہ موضوع نہیں تھی۔ تو پھر۔

بشائر نے مسلسل بولتی عدینہ اور ہمہ تن گوش ماموں ابصار کو دیکھ کر سنجیدگی سے دوسری بار اس بات کو سوچا۔

وہ آخر ماموں ابصار سے کون سی باتیں کرتی ہے، کس بارے میں، کیسے قصے..... جن میں سامع کی اتنی دلچسپی ہے؟ کون سی باتیں؟ اسے حیرانی آمیز تجسس تو تھا۔ مگر ٹوہ لی جائے۔ اونہوں..... غلط بات۔

اس نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ایک گہری نگاہ ماموں ابصار پر ڈالی۔ یہ شخص..... اس کی آنکھیں..... آنکھیں..... کیا ہے ان آنکھوں میں جو کچھ نہیں آتا

وہ سیکنڈ فلور پر آگئی تھی۔ یہاں کام ابھی کافی باقی تھا۔ وہ یوں ہی کھڑکی سے ٹنگ کر گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہی۔ پزا کی ہوم ڈلیوری والے کی بائیک رکی..... اوہ ..... ان کی تواضع کا خیال ..... کچھ دیر میں عدینہ اور ماموں اوپر آگئے۔ ایک مزدور پلاسٹک کی کرسیاں میز بھی اٹھا کر لا رہا تھا۔

"یہ سب تو تکلف ہوا۔" وہ ماموں کو میز پر سامان رکھتے دیکھ کر شرمندہ ہوئی۔ عدینہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ چکی تھی۔ بشائر نے آگے بڑھ کر شاپرز کھولنے شروع کر دیے۔

"چھوڑ دیں بشائر! ماموں ہی کو کرنے دیں۔ آج ہم ان کے مہمان ہیں۔"

عدینہ کا انداز شرارتی تھا۔ مزہ لیتا ہوا جتاتا سا۔

"عدی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ تشریف رکھیے۔ میں اچھا میزبان ثابت ہوں گا، بلیو می۔" اس نے نرمی سے بشائر کے ہاتھ سے شاپر لے لیا۔ وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔

عدینہ اسے بتانے لگی کہ اوپر کس طرف کس کا کمرہ ہوگا۔ یہ بیڈ روم ہوگا اور کامن کے ساتھ دوسرا روم..... دادا، دادی کے لیے بنا ہے۔ ماموں کہتے ہیں۔ وہ انہیں یہاں لے آئیں گے۔ مگر وہ لوگ کہتے ہیں انہیں اپنا گھر بہت پیارا ہے اور وہ اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی تو خیر گھر بنا نہیں، جب مکمل ہوگا اور ماموں شفٹ کریں گے۔ تب دادا جان کو ماننا ہی پڑے گا۔ ماموں کو منوانا آتا ہے۔" وہ دلکشی سے ہنسی۔

"سب کچھ بہت اچھا ہے۔ اسپیشلی مجھے ایریا بہت اچھا لگا، بہت سکون ہے یہاں..... اسلام آباد جیسا

"..... کراچی، لاہور تو بہت شور والے شہر بن چکے ہیں۔" بشائر نے کہا۔

"آپ تعریف ہی کرتی رہیں گی کوئی نقص پکڑیے ' کوئی مشورہ...." مامون اب اس کی جانب متوجہ تھا۔

"جب ہر چیز ہے ہی تعریف کے قابل تو غلطی کہاں نکلے گی۔" عدینہ نے چہک کر کہا۔

بشائر کے کھلتے لب بھنچ گئے۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں 'سب اچھا ہے۔ ماشاء اللہ۔"

"یقیناً" اچھا ہے۔" مامون نے گہری نگاہ اس کے اوپر گاڑی۔ "مگر ابھی نیچے کچن میں آپ کو کچھ ناگوار یا اعتراض سا ہوا تھا۔ آپ کچھ کہتے کہتے رکی تھیں۔ اب آپ وہ کہیے۔"

"اوہ....!" بشائر کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ "ایسا کب....؟"

"آپ مکر نہیں سکتیں۔ میں اس وقت اتفاق سے آپ ہی کو دیکھ رہا تھا۔ آپ بہت تیزی سے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مگر نہ جانے کیا سوچ کر رک گئیں۔"

"میں...." بشائر نے ذہن پر زور دیا۔ "ہاں.... چھوٹے ایسا کوئی بڑا اعتراض تو نہیں ہے۔"

"تو اگر اعتراض نکلا تو کیا مامون اب توڑ پھوڑ کریں گے۔ سب کچھ تیار ہے۔" اس کے جملے کے بیچ میں عدینہ نے ٹانگ اڑائی۔ وہ جیسے اس بارے میں کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ "مامون کے فیصلے کیسے غلط ہو سکتے ہیں۔ پاگل ہیں کیا؟"

"خاموش عدی.... ! سننے تو دو.... میں واقعی توڑ نہیں سکتا۔ مگر مجھے علم تو ہو کیا بات ہے۔" مامون نے عدینہ کو ٹوکا اور دوبارہ اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

بشائر نے نوالہ نگل کر عدینہ کے چہرے کو دیکھا۔ جہاں تناؤ کی سی کیفیت تھی اور مامون ہمہ تن گوش۔

"دراصل لاؤنج سے ملحق کچن.... آئی مین اوپن کچن۔ بنیادی طور پر یورپی ٹھنڈے ممالک کی سردی کو دیکھتے ہوئے وجود میں آئے تھے۔ ہمارے ایشین گرم ممالک میں کچن کا باڑا گھر سے ذرا علیحدہ یا دور ہونا ہی بہتر ہے۔ پھر ہمارے گھروں میں یورپی ممالک کی نسبت کوکنگ بہت زیادہ ہوتی ہے' تین ٹائم.... اور ہمارے کھانے بہت زیادہ ٹائم لیتے ہیں پکنے میں تو پھر میں جب چولہا دن و رات جلے گا تو گھر تو پھر تندور بن جائے گا۔ کم از کم لاؤنج تو بیٹھنے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ بس اور کچھ نہیں۔" اس نے بہت تفصیل سے بتایا۔ مگر جملے کے اختتام تک جھینپ گئی۔ خوامخواہ کا اعتراض۔

عدینہ کا منہ حق دق کھلا کا کھلا رہ گیا۔

مامون نے ہونٹ بھینچتے ہوئے چند پل خاموش رہنے کے بعد شانے اچکا دیے۔

"میں واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ پھر یہاں سب گھر اسی طرح بن رہے ہیں اور نہ ہی انجینئر نے کوئی مشورہ دیا۔ یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" وہ متاسف نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بشائر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ مجھے تو بھی ایسا ہی کچن پسند ہے۔ یہ کیا ڈبے جیسے کچن میں بند ہو جاؤ۔ سارے گھر سے کٹ کے۔" عدینہ نے سارا معاملہ سمیٹ دیا۔

بشائر نے ٹھنڈی سانس لے کر پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ وہ ہلکا سا رخ موڑ کر باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ہی جملہ چکرا رہا تھا۔ "مجھے تو بھی ایسا ہی کچن پسند ہے۔" ہاں اصل بات یہ ہے۔

"چلیے بشائر! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ مگر آپ کو کوئی نہ کوئی رائے یا مشورہ دینا ہوگا۔" مامون نے اس کی عقل کو تسلیم کیا تھا۔

واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھتے وقت.... مامون نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

"مشورہ ادھار رہے گا۔"

بشائر بدقت مسکرائی۔ "میں ادھار کی قائل نہیں۔" وہ قصداً" بہت بے نیازی سے بولی۔ "آپ آج ہی کسی مالی کو بلا لیں۔ گھر کے تیار و مکمل ہونے

کے ساتھ ساتھ آپ کے شفٹ ہونے تک لان کی باقاعدہ شکل نکل آئے گی۔ پھر ہر شے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہو گی۔ اگر آپ نے کنسٹرکشن کے آغاز پر ہی اس جانب توجہ دی ہوتی تو اب تک تو پیڑ پودے قد نکال چکے ہوتے۔" وہ بات کے اختتام پر مسکرائی۔ آتی ہوا نے پف کو بگاڑ دیا تھا۔ اس نے انگلیوں کی کنگھی سے اسے مشاقی سے سنوارا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

مامون کی آنکھوں میں حیرانی کے بعد ستائش ابھر آئی۔ اسے یہ دھیان کیوں نہ آیا۔ عدینہ کے چہرے پر بھی اچنبھا سا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے مامون نے ویو مرر میں بشائر کا سادہ مگر ذہانت سے چمکتا باوقار چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کی لیپا پوتی نہیں تھی۔

عدینہ کے چہرے پر تناؤ سا تھا۔ اس نے سیٹ پر بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ واقعی بہت تھک چکی تھی۔



"سنا ہے کل آپ تاج محل دیکھنے گئی تھیں۔" بخت نے کہا۔

"تاج محل۔ کون سا تاج محل.... ہم تو کل سی ویو گئے تھے۔ ہاں اس سے پہلے.... اور تاج محل کراچی میں کب ہے۔ وہ تو آگرہ.... انڈیا میں ہے۔" جواب دیتی بشائر نے حیرت سے بخت کی شکل دیکھی۔

"میں اس تاج محل کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جو ممتاز کے لیے شاہ جہاں نے بنوایا مرنے کے بعد.... میں تو اس کی بات کر رہا ہوں جو...."

"یہ فالتو کی باتیں چھوڑو...." بشائر کو یاد آیا وہ کیا پوچھنے آئی تھی۔ وہ اتنے دن سے آیا ہی نہیں کہ وہ پوچھ پاتی۔

"تم اس روز کیا کہہ رہے تھے۔ عدینہ اور.... تم عدینہ کا نام لے کر کہہ رہے تھے۔ وہ زخم لگاتی ہے۔ بخت تم اور عدینہ.... تم سے عدینہ سے۔" بشائر پر یقین تھی۔

"ہاں....!" بخت نے ہاں کی یا آہ خارج کی۔

"اوہو.... مگر وہ تو...." بشائر تاسف میں گھری۔ اس کے چہرے پر پریشانی آ رکی۔

"اتنا گمبھیر مسئلہ نہیں ہے۔" بخت نے ڈھارس دی۔ "چھوٹی سی بات ہے۔"

"مامون اسے عدی کہتا ہے۔ میں بس یہ چاہتا ہوں۔ وہ اسے ساری زندگی عدی ہی کہے۔" اس کا انداز بے حد سنجیدہ تھا۔

بشائر کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

عدی.... ادی.... واہ.... تم تو بڑے بے نیاز سے نظر آتے تھے بخت.... تمہاری اپنی دنیا.... تم کب اس جھمیلے میں پڑے۔" اسے سچ مچ دکھ ہوا تھا۔

"صرف بے نیاز نہیں' بے وقوف بھی کہیے بلکہ" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہنس دیا۔

"عدینہ کو دیکھ کر میں بے خود ہو جاتا ہوں اور اس محفوظ و مامون کو دیکھ کر بے قابو۔" اس نے بے خود کہنے پر آنکھیں جذب کے عالم میں بند کر کے جھوم کے دکھایا اور بے قابو کہنے پر فضا میں گھونسا تان لیا۔ بشائر کی ہنسی بے قابو ہو گئی۔

"آپ کی ہنسی بہت خوب صورت ہے بشائر!" بخت سحر زدہ سا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ "بلکہ خوب صورت تو ہر دوسری چیز ہو سکتی ہے۔ آپ میں کچھ خاص ہے۔ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہر جنبش میں وقار.... ہے...."

"اے.... بس۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "ادھر ادھر مت گھماؤ۔ تم مامون کو پسند نہیں کرتے ہے نا؟" اس نے اصل مدعا کہا۔

"اوہ.... وہ....!" بخت نے لاپروائی سے وہ کو کھینچا۔ "تو آپ دلوں کے بھید بھی جان لیتی ہیں۔"

"مگر کیوں بخت! وہ تو.... اتنا مکمل ڈیشنگ' زبردست۔"

"اوہ....!" بخت نے بھنویں اٹھائیں۔ "آپ

بھی۔"

"بخت!" اس نے تنبیہی انداز میں میز پر ہاتھ مارا۔

بخت نے نظریں جھکالیں۔ وہ پین سے اخبار پر پھول بوٹے بنانے لگا تھا۔ خاموشی بولنے لگی۔

"کیا تم اس سے جیلس ہو؟" بخت نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔

"عدینہ کی وجہ سے۔" بشائر نے جملہ مکمل کیا۔

بخت نے قلم چھوڑ دیا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر جواب دینے کو تیار تھا۔

"نہیں۔۔۔ ماموں کی فطرت کا جنون 'انتہا پسندی' کاملیت پسندی' آپ نے کبھی اس کی آنکھوں کی سردمہری نہیں دیکھی۔ پل بھر کی ساعت کو آنے والی یہ لہر اسے اندر تک سے واضح کرتی ہے اور اس بات کو وہ خود بھی نہیں جانتا۔ وہ ظاہر باطن میں بالکل جدا ہے۔"

بخت اپنی رائے میں ٹھوس تھا، حتمی۔

بشائر کچھ نہ سمجھی۔

"مگر عدینہ تو۔۔۔"

"عدینہ کی آپ فکر نہ کریں۔۔۔ وہ جی حضوری کی عادی ہے۔ بخوشی بہ رضا۔ وہ ساری زندگی گزارنے کے بعد بھی اصل سے واقف نہیں ہوگی۔ آپ نے اسے جانا نہیں۔ وہ سرورق کی خوب صورتی سے متن کا اندازہ لگاتی ہے۔ ورق پلٹنے اور سطریں پڑھنے سے اسے کوئی علاقہ نہیں۔ آپ اس کی فکر میں نہ گھلیں۔"

بشائر خاموش رہ گئی۔ ہاں بخت نے یقیناً" زیادہ بہترین تبصرہ کیا تھا۔ وہ انہیں زیادہ جانتا تھا۔ بشائر کی تو بس ایک نظر ہی تھی نا۔

اس نے ایک خیال آنے پر اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔

اگر بخت جان لے۔ اس نے بھی تو صرف سرورق کی خوب صورتی دیکھی تھی اور خریدنے پر مچل گئی۔



"امی کا رشتہ دیکھنے کا شوق پورا نہیں ہوا۔ اب کس پر نظر کرم؟ اچھا۔ اچھا۔ ایسا کون جو اتنا زیادہ پسند آگیا؟" وہ کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ ایک پیر مسلسل ہل رہا تھا۔ قمیص کی نادیدہ شکنیں دور کرتے وہ بہت پرسکون ہو کر ابو سے فون پر محو گفتگو تھی۔ بہت دنوں بعد تفصیلی بات ہو رہی تھی۔

"اچھا آپ کو بھی سب اچھا لگ رہا ہے۔ یعنی کوئی اعتراض نہیں۔" مجھے بلوانے کی فکر میں کیسی جلد بازی۔۔۔ میں بہت اچھی طرح سے ہوں ابو! مزے میں۔"

وہ باپ کو یقین دلانے کو ہر طرح سے تسلی دے رہی تھی۔ رابعہ خاتون باقاعدہ کرسی رکھ کے اس کے قریب بیٹھی تھیں۔ یک طرفہ گفتگو سے نتیجہ اخذ کیا تھا۔ راحیلہ اور سجاد نے اس کے لیے وہاں کینیڈا میں کوئی رشتہ دیکھا تھا۔ وہ تفصیلات جاننے کو بے چین تھیں۔

"زیادہ تو مجھے پتا نہیں۔ مگر ابو آپ کو تفصیلی کال کریں گے۔ ابھی تو کہنے لگے۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے بہت زیادہ یاد آنے لگی تو نمبر گھمالیا۔۔۔ بس۔۔۔" باپ کی آواز اور بے قراری کو وہ بھانپ لیتی تھی۔ ایک سرشاری سی اسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"تو آپ شادی کر کے کینیڈا جائیں گی۔" عدینہ اپنے پیر نیم گرم پانی میں ڈبوئے بیٹھی تھی۔ قیاس اس نے بھی لگایا۔

"شاید۔۔۔ پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

عدینہ نے ذرا سی ناک سکوڑی۔ "ہونہہ۔۔۔ کینیڈا۔۔۔" کچھ لوگ ہر اچھی چیز کو بس اپنے لیے چاہتے ہیں۔ دوسرے کو بھی اچھی مل رہی ہے۔ پتا لگ جائے تو بلاوجہ ہی پہلو بدلتے پائے جاتے ہیں۔

"ہیلو۔ السلام علیکم نانو۔۔۔" ماموں تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام۔" رابعہ خاتون مسکرائیں۔ وہ راحیلہ کے حوالے سے اپنے خدشات کے غلط ثابت ہونے پر خوش تھیں۔ عدینہ نے جوش سے ہیلو کہا۔

بشائر نے فقط سر ہلا کر جواب دیا۔ وہ آج شمسہ بیگم کے ہمراہ بازار جانے کو تیار تھی۔ لاہور سے آنے کے باعث اس کے پاس بے حد گرم کپڑے تھے۔ کچھ نارمل کاٹن لینن پرنٹس کے لیے وہ چکر لگانا چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ ابو اس کے لیے فکر مند تھے۔ آج کتنی دیر وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ "ابو... میرے پیارے ابو... سحر... احد اور راحیلہ امی آپ بھی... آئی لو یو آل۔"

دل ہلکا پھلکا تھا۔ اس نے یوں ہی اپنا جیولری بکس کھول لیا۔ انگلی بھر لمبائی کا باریک چین نما بندہ ایک سفید موتی کان کی لو سے چپکا تھا اور دوسرا زنجیر کے سرے سے چپکا ہر جنبش پر گردن کو چھوتا تھا۔ اس نے کچھ گنگناتے ہوئے زور سے بالوں میں برش پھیرا۔ پرفیوم کا اسپرے اپنے گداز ہونٹوں پر چاکلیٹ براؤن رنگ کی لپ اسٹک لگائی۔ اس کی تو مانو جون ہی بدل گئی۔ یہ یہاں آنے کے بعد اس کا پہلا سنگھار تھا۔

رابعہ خاتون کی کسی بات کا جواب دیتا مامون اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ بقیہ جملہ حلق میں پھنس گیا۔ اسے سنجیدگی سے تکتی عدینہ نے نظروں کے تعاقب میں جب گردن گھمائی تو بے حد حیرت کے عالم میں یک دم کھڑی ہوئی تو پیر ٹب کے اندر تھے۔ ایک چھپاکا سا باہر اچھلا۔ وہ سرعت سے بیٹھی۔ مگر چہرے کے ہونق تاثرات ہنوز تھے۔

"ماشاء اللہ بیٹی... تم تو بس منہ ہی دھو کر رہتی ہو۔ کیا خوب چہرہ چمک اٹھا۔ ایسے ہی رہا کرو... باپ کے فون نے خوشی بھر دی ہے اس کے اندر۔" اگلا جملہ مامون کے لیے تھا۔

مامون مسکرایا۔ "کیسے ہیں وہ... سب خیریت؟"

"ہاں وہ ٹھیک ہیں۔ رات میں سحر اور احد بھی بات کریں گے۔" وہ واقعی بہت خوش تھی۔ "میرے چھوٹے بہن، بھائی ہیں۔" اس کے لہجے میں محبت کا سمندر تھا۔

"ہاں ماشاء اللہ۔ میں نے دیکھا تھا۔ پورا سیکو اور بچپن ہے۔" رابعہ خاتون نے یادداشت ٹٹولی۔

مامون نے سر ہلایا۔ عدینہ ابھی تک سکتے کے عالم میں تھی۔ لال، گاجر اور براؤن رنگ کے چنری پرنٹ کا ڈھیلا ڈھالا سوٹ۔ اس کے آویزے انوکھے تھے یا گردن کی لمبائی یا ہونٹوں کا نیا رنگ یا سوٹ۔ بہت خوب صورت تھا۔ وہ بے وقوفی کر رہی تھی۔ ہر شے اپنی جگہ مکمل تھی۔ معاملہ یہ تھا کہ عدینہ کو اپنے آگے کوئی اور نظر آتا ہی نہیں تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

"میں جاؤں دادی جان... شمسہ آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی۔" اس نے دوپٹا اپنے گرد لپیٹا۔

"ہاں... ہاں... بالکل... بہت شوقین ہیں شمسہ بازاروں میں گھومنے کی اور بھئی مہارت بھی خوب ہے بھاؤ تاؤ میں، ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔" رابعہ خاتون نے تعریف کی۔

"ایک منٹ بشائر! آپ آج شاپنگ سے فارغ ہو لیں۔ تو کل یا جب ٹائم نکالیں۔ ذرا گھر تک چلیے گا۔ لان کے لیے کام شروع ہو گیا ہے۔" مامون کے پکارنے پر وہ رک گئی۔ اس نے اس شخص کے چہرے کو دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔

"آپ نے شروع کروایا ہے تو یقیناً اچھا ہوگا۔ میرا جانا ضروری تو نہیں۔" وہ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار چلیں۔" مامون نے زور دے کر کہا۔ بشائر نے رابعہ خاتون کا چہرہ دیکھا۔

"چلی چلنا بیٹا... بڑی محنت سے میرے بچے نے یہ سب بنایا ہے۔ بڑی ہمت ہے اس کی۔" رابعہ خاتون کو مامون سے عشق اور آنکھ بند کر کے یقین تھا۔ اس کی مداح سرائی تو وہ سوتے میں بھی کرتی تھیں۔

اس نے عدینہ کو دیکھا۔ وہ اپنے پیروں پر تولیہ رگڑنے لگی تھی۔ مگر اب ساکت ہاتھوں اور نظروں سے مامون کو دیکھ رہی تھی... پہلی بار اس نے اسے نہیں کہا۔ اس نے بشائر کی رائے کو... اسے یہ

خیال ہی کیوں آیا کہ وہ بشائر کو لے کر جائے گا۔ اس نے...

"دراصل لان تو آپ دیکھیں گی ہی... اصل بات یہ ہے کہ میں نے لاؤنج اور کچن کے بیچ دیوار اٹھا دی ہے اور کچن کی بیک دیوار پر ایک بڑی ونڈو رکھوا دی جو بیک ایریا میں کھلے گی۔ آپ وہ دیکھیں۔" مامون نے اصل بات کہی۔

"جی..." بشائر اچنبھے کے عالم میں پھنسی آواز کے ساتھ بدقت کہہ سکی۔

"کیا...؟" عدینہ چلائی۔

"کون سی دیوار چنوا دی۔" عظیم خان نے آدھا کانا قصہ سنا۔ "میرا مطلب اٹھوا دی... اور خیر چنوا دی تو چنوا دی۔ مگر کیا بیک گراؤنڈ میں "محبت کی جھوٹی کہانی پر روئے" کا ریکارڈ چلایا تھا؟" وہ تسلی سے صوفے پر ٹکے۔

"اف...!" رابعہ خاتون نے اپنا سر پکڑا۔ مامون کے بے ساختہ قہقہے میں بشائر اور عدینہ کی آواز بھی شامل ہو گئی۔

"بھئی اس لیے کہا کہ ذرا ماحول سا بن جاتا۔ دیوار میں چنے جانے کا دکھ آدھا رہ جاتا۔ گانا مکمل... دیوار مکمل... اب روتی ہے تو روتی رہے۔ ہاں بڑی چوٹ کھائی جوانی پہ روئے ے ے ے... محبت کی۔" رکتی ہنسی نے ایک بار پھر زور پکڑا۔ مامون کے انکشاف کا اثر ختم ہو گیا۔

فون بیل پر رابعہ خاتون نے بشائر کو عجلت سے آواز دی۔ شمسہ بیگم گھر سے نکلی گلی میں کھڑی تھیں۔ بشائر ہنستا چہرہ لیے باہر کو لپکی۔

پیچھے مامون، عظیم خان کو چنی دیوار کا حدود اربعہ بتا رہا تھا۔

عدینہ کی نظریں مامون کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ مگر دھیان کسی اور ہی انجان سفر پر گامزن تھا۔



"وہ ایسا ہی ہے۔" بازار سے ڈھیروں ڈھیر خریداری کے بعد وہ شمسہ بیگم کے گھر ہی لوٹی تھی۔ بخت ان دونوں کے لیے چائے بنا کر لے آیا۔ بشائر دونوں ہاتھوں سے اپنے پیروں کی انگلیاں دباتی۔ شمسہ بیگم کو سن رہی تھی۔ اس نے مامون اور اس کے گھر کے سارے قصے کو انہیں سنایا تھا۔ اپنی حیرت... اور اتنا فوری اور انتہائی ری ایکشن... وہ راستے میں یہی گفتگو کرتی آرہی تھیں۔

"وہ کسی شے میں کمی یا کجی برداشت کر نہیں سکتا۔ بعض اوقات اس کی یہ عادت بہت اچھی لگتی ہے اور بعض دفعہ ایک جنون، بے وقوفی... اعتدال بہترین رویہ ہے۔ نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"آپ بہت ہلکے جملے استعمال کر رہی ہیں والدہ ماجدہ... سیدھی بات کریں تو ایک ہی جملہ... یہ ایب نارملٹی کی ایک صورت ہے۔" چائے کے گھونٹ لیتے بخت نے ماں کی تصحیح کی۔

"پاگل ہے یہ ایسے ہی ادھر ادھر کی ہانکتا ہے۔" بیٹے کو گھورتے ہوئے وہ بشائر کی جانب گھومیں۔ "بھئی ہر بندے کی اپنی عادت ہوتی ہے۔ کچھ لوگ نقص برداشت نہیں کرتے۔ ختم کہانی۔"

"ماں! دنیا میں کوئی شے جو انسان نے بنائی ہو، بے عیب ہو ہی نہیں سکتی۔ جب انسان کا وجود عیب ثواب سے مل کر بنا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے اعمال میں بس اچھائی رہ جائے۔ انسان اچھا بھی کرتا ہے اور برا بھی۔ بس یہ ہے کہ ہر کسی کے پاس اس کا تناسب کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔"

"ارے میرے والد صاحب خدا کے لیے۔" شمسہ بیگم نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی سے ٹکرائے۔ "یہ اتنے مشکل جملوں کی مار نہ مارنا۔ ابھی صبح ہی تمہارے ابا مجھے کفایت شعاری اور انسان کی زندگی کے لیے انتہائی ضروری چند چیزیں گنوا گئے ہیں کہ میں بازاروں میں میچنگ دھاگے اور لیسوں کے لیے وقت کیوں

ضائع کرتی ہوں۔ جبکہ زندگی بس چار دن کی ہے اور اپنے ان خیالات کو پہلے معاشرتی' پھر معاشی بعد میں کفایتی اور انت میں خوف خدا کے حوالے سے اس طرح بیان کیا کہ۔۔۔"

وہ بشائر کی جانب مڑیں۔

"میرا دل چاہا جنگلوں میں جا نکلوں' دنیا تیاگ دوں' سب کچھ دان کردوں اور اب بیٹا مجھے الگ فلسفے سمجھانے لگا ہے۔ ان باپ' بیٹا کو کوئی اور تو سنتا نہیں۔ بس میرے آگے ہی راگ سناتے ہیں۔ بھئی مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے مامون' صورت ہی دیکھو' کتنی پیاری ہے' ہے نا؟"

"اف۔۔۔" بشائر نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ پوچھا بھی تو کس سے اور کیا؟

"جند جان ہے رابعہ خاتون کی۔۔۔ اور اگر ہے اس کی عادت۔۔۔ تو کوئی برائی تو نہیں ہے نا۔ اعلا تعلیم' کاروبار اور اب گھر بھی بنا لیا۔

منہ سے براہ راست تو کچھ طے وے نہیں ہوا۔ مگر سامنے کی بات ہے۔ رابعہ خاتون تو چاہتی بھی یہی ہیں کہ عدینہ اور مامون۔۔۔ انہیں دنیا میں سب سے پیارے ہیں۔ عظیم بھائی منہ سے کچھ نہیں بولے آج تک۔۔۔ مگر انہیں اعتراض کرنا بھی کیا ہے اور بھئی سب سے اہم بات تو ہے کہ لڑکی۔۔۔ اور اس مامون کا انداز تو شروع سے یہی ہے۔ بچپن کا ساتھ ہے بھئی۔ ایک گھر۔۔۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

وہ بشائر کو بعد میں سارا قصہ سنا رہی تھیں۔ اس سے پوچھا۔

اس نے ایک حتمی احساس کے تحت نفی میں گردن ہلائی۔

"ہاں کسی کو کیا اعتراض۔"

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں نہیں آتا مامون۔۔۔ تم کیسے ہو بیٹا! ہر چیز جہاں تہاں چھوڑ کر چل دیتے ہو۔" مامون تخت پر لیٹا ہوا تھا۔ سر رابعہ خاتون کے زانو پر تھا۔ وہ آزردہ' کچھ پریشان سی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"پر جاتے کہاں ہو' یہ تو پتا چلے۔"

"پتا نہیں۔۔۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بھی نہیں پتا تو پھر کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مجھے یہ کشٹ اٹھانا ہی ہے نانو۔۔۔ میں بہت مجبور ہوں رک نہیں سکتا۔" اس کے انداز میں بار بار چھنی' دکھ عود کر آیا۔ "کہیں باہر چلیں شام کو؟"

"مجھے بھی لے چلیے نا مامون!" عدینہ کی چہکتی ہوئی آواز۔

مامون نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر عدینہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کا سنگھار رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں اور کلائی میں کہنیوں تک تازہ مہندی لگی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہے؟" مامون کی نظروں کے تعاقب نے اسے سوال پر مجبور کیا۔

"بہت اچھی۔۔۔ بڑی مہارت سے لگائی گئی ہے بہت خوب!" مامون نے عدینہ کے بڑھائے ہاتھ کی سب سے لمبی درمیانی انگلی کو بصد احتیاط اپنی انگلی سے اٹھایا اور ڈیزائن بغور دیکھا۔

"ارے بنو۔۔۔ کس کی بارات چڑھ رہی ہے جو تم۔" رابعہ خاتون نے سر پیٹا۔

"تو بارات کیوں؟ خود ہی تو کہتی ہیں۔ کنواری لڑکیاں سر میں تیل ڈالتی ہیں۔ آنکھ میں کاجل کی باریک دھار اور ہاتھ میں مہندی۔۔۔ اب میں نے لگا لی تو طنز کرنے لگی ہیں۔"

"اوئی اللہ۔۔۔ وہ کجلے کی دھار اور تمہارے لانبو مسکارے۔۔۔ اور وہ مہندی بس پور ڈھک لی یا جناتی بنا لیا۔ وہ بھی باپ بھائیوں کی نگاہ نہ پڑے۔ یہاں تو تم

منہ والوں کو مات دے دی۔ تمہیں سنائی غلط دیتا ہے یا اپنی مرضی کی تشریح کرنے کی عادت ہے۔" رابعہ خاتون جلبلا کر بولنا شروع ہو گئیں۔

"آپ چھوڑیں دادو کو مامون! مجھے لے چلیے ناں۔"

"چپکی بیٹھی رہو۔۔۔ مجھے بھی لے چلیے۔ ایک موصوف جب جی چاہا' جہاں دل چاہا اٹھ کر چل دیے۔ یہ بھی ہم قدم ہوں گی۔" رابعہ خاتون کو دونوں پر ہی غصہ آگیا۔ تیزی سے چپل پیروں میں ڈال کھڑی ہو گئیں۔

مامون بھی کھڑا ہو گیا۔ "نانو پلیز۔" اس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔

"ہٹو مامون! مجھے نماز پڑھنی ہے۔" رابعہ خاتون کا مزید تن گیا۔ وہ اندر بڑھ گئیں۔ مامون بے بسی سے ان کی پشت کو دیکھنے لگا۔ عدینہ اپنی مہندی پر پھونکیں مار رہی تھی۔ نظریں ملنے پر پروانہ کرنے کا اشارہ کیا۔

☼ ☼ ☼

"وہ خوش تھی یہاں بہت' یہاں رہنا ایک بے حد خوش گوار تجربہ تھا۔ یہاں صرف محبت تھی۔ ہر جانب سے عزت و احترام اور پیار۔۔۔ مگر وہ مہمان تھی اور اسے واپس جانا تھا۔ اپنے والد کے پاس' بہن' بھائیوں کے پاس۔۔۔ ان سب کی یاد اسے بے چین کرتی تھی اور واپسی کا سب سے آسان راستہ۔۔۔ وہاں کے نیشنل سے شادی بھی ہو سکتا تھا۔ اسے راحیلہ امی کے حساب کتاب اور ہر پہلو کو سامنے رکھ کے چلنے کی عادت کا پتا تھا۔ وہ اپنے معیار سے کم پر نہیں ٹھہرتی تھیں۔ اور پھر جس بندے کو راحیلہ نے پسند کر لیا تھا اور سجاد نے بھی ہامی بھری۔ وہ ایسا ویسا تو ہو گا نہیں۔ کینیڈا کی کسی بڑی فرم میں کمپیوٹر انجینئر۔"

صرف بشائر کی ہاں اور فیصلہ صادر۔

اس نے سرسری نگاہ میں ہی تصویر میں موجود بندے کی شخصیت کو بھانپ لیا تھا۔ "شان دار" ابو نے پسندیدگی کی سند دی تھی۔ ابو نے رات ہی عظیم خان سے بہت تفصیلی گفتگو کی تھی۔ رابعہ خاتون بہت خوش تھیں۔ راحیلہ اور سجاد کے حوالے سے ان کے خدشات بے بنیاد رہے۔

"ہاں تو پھر آپ کے ابو نے بتایا نہیں۔۔۔ نکاح کب ہو گا؟ میں تو کہتی ہوں' جلدی ہی کرلیں۔ اچھے اچھے کپڑے بنیں گے واہ!" عدینہ کے چہکنے میں ایک طمانیت سی تھی اور اسے شاید اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

"ایسے نکاح کیسے ہو سکتا ہے عدینہ۔۔۔ میں وہاں جاؤں گی۔ سب سے ملوں گی۔ پھر فیصلہ ہو گا۔"

"اور اگر آپ کو پسند نہ آیا تو؟" عدینہ کی زبان سے خدشہ اگلا۔

"میرا خیال ہے' مجھے پسند آجائے گا۔ بشائر نے ٹھنڈی سانس لی اور اگر نہ آیا تو کسی اور کو آزمائیں گے یا پھر انتظار۔" اس نے عدینہ کو ڈرانے کی کوشش کی یوں ہی شرارتاً۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ بشائر! کینیڈین نیشنل' اتنی اچھی جاب' قابل' شکل بھی اچھی ہے اور کیا چاہیے؟"

بشائر مسکرا دی۔ "نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔"

ہاں تو بس جلدی کریں۔ آپ شادی وہاں جا کر کرلیجیے گا۔ مگر۔۔۔ ہاں ہم آپ کے جاتے وقت ڈھولکی رکھ لیں گے۔ گانے گائیں گے۔ بلکہ مایوں کرلیں گے۔ سچ دھوم دھڑکا کیے عرصہ ہوا۔"

"تو تم شادی کرلو نا۔۔۔ میں نانو سے کہہ دیتی ہوں' میری موجودگی میں ہی تمہاری کردیں۔ میں بھی دھوم دھڑکا دیکھ لوں گی۔" بشائر نے نہ جانے کس دل سے کہا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی رابعہ خاتون سے مامون اور عدینہ پر کبھی بات نہیں کرسکی تھی۔

عدینہ کا چہرہ پھیکا سا ہوا۔ "میری شادی؟ وہ تو ابھی بہت دور ہے۔ بلکہ پتا نہیں کتنی دور۔" اس کے انداز میں پہلی بار آزردگی سی آئی تھی۔

بشائر نے بے ساختہ اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ "کیوں اتنی بی بی دور۔ کیوں کہا؟"

عدینہ چپ رہی' پھر طویل سانس لے کر بولی۔
"پتا نہیں۔" اس کے چہرے پر اکتاہٹ سی آگئی۔ جیسے یک دم دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا ہو۔
اس سے شمسہ بیگم نے بھی مامون اور عدینہ کے رشتے کی راہ میں حائل کسی وجہ کا ذکر کیا تھا۔ مگر بخت نے بد تمیزی سے ٹوک دیا۔
"کیا وجہ بھلا... سب کچھ تو ٹھیک ہے۔ پھر...؟"

☼ ☼ ☼

"دیکھو بیٹی... ! شادی کی ایک عمر ہوتی ہے' اللہ توبہ طعنہ نہیں دے رہی مگر تم شادی کی عمر کو مانو نکال ہی چکی ہو میں نے بیٹی کی شادی انیس میں کی۔ بعد میں مجھے لگا' بہت جلدی کر دی بڑا پچھتائی تھی میں..." وہ کھو سی گئیں "پکا فیصلہ کر لیا' کبھی اتنی کم عمری کی شادی کی حمایت نہ کروں گی مگر اب اس عدینہ کو دیکھو اکیس کی ہے۔ مگر مجھے ہر وقت خیال آتا ہے بس رخصت کر دوں۔" ان کے چہرے پر دکھ سا تیرنے لگا۔
"تو آپ کر دیجیے ناں دادو جب کہ اب تو..."
"ہاں کر تو دوں مگر... ایسے ہی خوامخواہ کی رکاوٹیں ہیں تمہارے دادا... اور پھر وہ مامون' میرا ارادہ جانتا ہے مگر اپنی ضد پر... چھوڑو بیٹی! میں تو خود ہی مستقبل کے منصوبے بناتی رہتی ہوں۔ سب آج کل اپنے حساب سے چلتے ہیں۔"
وہ کچھ دل گرفتہ ہو گئیں۔ بشائر چونک گئی۔ رابعہ خاتون ہی تو سرپرست تھیں عدینہ اور مامون کی اور یہ دادا کا اعتراض رکاوٹ؟
"دادا جان کیا کہتے ہیں؟ انہیں کیا اعتراض...؟"
رابعہ خاتون چونکیں۔ بشائر کو ان کی آنکھیں ڈبڈبائی سی لگیں۔ "ان کی تو تمہیں پتا ہے ناں دنیا سے نرالی منطق۔ بات وہاں سے نکال کر لاتے ہیں۔ جہاں ہم تم جیسوں کی سوچ کا جانا ناممکن ہو' سامنے نظر آتی پانچ حسیں انہیں غلط لگتی ہیں اور چھٹی نادیدہ حس کے الارم کو سچ مانتے ہیں۔ منہ پھاڑ کر تو کبھی نہیں بولے۔ مگر انہیں ہچکچاہٹ ہے عدینہ اور مامون کے رشتے... ان کا ہاتھ ہی تو میری پشت پر نہیں ورنہ کر کے نکاح پڑھا دوں۔"
"جی! میں سمجھی نہیں دادو۔" بشائر حیران تھی۔
"میں خود نہیں سمجھی تو تمہیں کیا سمجھاؤں؟" رابعہ خاتون یکدم بیزار ہو گئیں تو وہ بھی خاموش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

بے ہنگم سا غیر متوقع شور... وہ گہری نیند سے یکدم بیدار ہوئی تو مانوس ہونے میں چند پل گزر گئے۔
"او نو... !" اس نے برق کی سی تیزی سے چادر اتاری۔ یہ آوازیں تو رابعہ خاتون اور عدینہ کی تھیں۔ سرپٹ دوڑی آوازوں کے تعاقب میں۔
"او مائی گاڈ... !" عظیم خان سینے پر ہاتھ رکھے دہرے گیند سے بنے ہوئے تھے اور ان کا چہرہ اوپر کرنے کی سعی میں نڈھال اونچی آواز سے روتی رابعہ خاتون... عدینہ دادا کی پشت رگڑ رہی تھی' وہ ان سے چپکی ہوئی تھی اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ ان کے ہاتھ کے بوسے لیتی تھی۔
بشائر نے فوری فیصلے کے تحت اپنے کمرے کی جانب دوڑ لگائی۔ نیچے آ کر بخت کے گھر کا نمبر ملایا۔ بخت نے لفظ "دادا جان کو نجانے کیا ہو رہا ہے..." جیسے ادھورے جملے کو سن کر ہی ریسور رکھ دیا تھا وہ ادھر آنے کے لیے بھاگ نکلا تھا۔
"مائنر سا اٹیک تھا مگر اب وہ ٹھیک ہیں۔ کل تک کے لیے ہم آبزرویشن میں رکھیں گے" ڈاکٹر نے تفصیلی چیک اپ کے بعد ان سے کہا۔
رابعہ خاتون کھڑی ہوتیں تو ٹانگیں کانپتی تھیں اور بیٹھ جاتیں تب بھی انجانے خوف سے پورا وجود لرزہ بر اندام...
"میں عظیم صاحب کے بغیر ایک منٹ زندہ نہیں رہ سکتی بیٹی!" رابعہ خاتون نے شکست خوردہ لہجے میں اپنی مجبوری جتائی۔ عدینہ آگے بڑھ کر رابعہ خاتون سے

لپٹ گئی۔
بشائر نے اپنی پوروں سے ان کے جھریوں والے گال پونچھے' وہ انہیں سہارا دیے بینچ پر بٹھانے لے آئی۔
"تم تو اپنا رونا بند کرو۔ پہلے ہی ان کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ مجال ہے جو تم میں ذرا سی موقع شناسی ہو۔ احمق اعظم!" بخت نے آگے بڑھتی عدینہ کا ہاتھ کھینچا اور دانت پیس کر تنبیہہ کی۔ اس کے جملے سے زیادہ قطعی تاثرات اور ناگواری چہرے پر جمی تھی۔ تب ہی رابعہ خاتون نے بخت کے چہرے پر دیکھا۔ بخت فوراً مسکرایا۔
"میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ان کے بغیر نہ جی سکنے والی بات غلطی سے بھی ان کے سامنے مت دہرا بیٹھیے گا۔ ورنہ اس بار ہونے والا اٹیک مائنر بہرحال نہیں ہو گا۔"
اس کا انداز شرارت سے بھرپور تھا۔ بشائر کھل کر مسکرائی۔ رابعہ خاتون بھی بات سمجھ کر پھیکی مسکراہٹ لے آئیں۔ عدینہ اپنے ہاتھ کو سہلا رہی تھی۔ بخت کی پکڑ سخت تھی۔ اس نے چہرہ پکا ہی رکھا۔
خوشی سے مر نہ جاتے گر اعتبار ہوتا
بخت نے ذرا سا جھک کر رابعہ خاتون کا چہرہ دیکھا۔ بشائر بے فکری کے احساس سے بے ساختہ ہنس دی۔
"ہمارا خون کا رشتہ نہیں ہے بشائر مگر... آنکھ کا رشتہ تو ہے ناں" راحیلہ امی کی آواز اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ "آنکھ کے رشتے کا مطلب دیکھنے سمجھنے کا رشتہ میں شان کو تمہاری نظر سے دیکھ رہی ہوں اور پورے نمبر دے رہی ہوں میرا یقین رکھو۔ تم سن رہی ہو ناں۔" بشائر کی مسلسل خامشی پر وہ چونکیں۔
"ہوں..." اس نے ہنکارا بھرا "سن رہی ہوں۔"
"پتا ہے اس کو دیکھنے کے دوسرے منٹ میں مجھے تمہارا خیال آیا اور دسویں منٹ تک میں فیصلہ کر چکی تھی۔ دنیا میرے کہے ہر لفظ کو جھوٹ اور سوتیلے پن میں ڈال دے گی کہ یہی روایت رہی ہے۔ مگر سچ کہوں تو... ضرور دکھا جاتی سوتیلا پن اگر سحر فقط گیارہ برس کی نہ ہوتی۔" کچھ دل گرفتی سے بولتی راحیلہ آخر میں شریر لہجے میں ہنس کر بولیں۔
بشائر کو زور کی ہنسی آ گئی۔
"ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تم جلد از جلد آسکو... اور اب کیا تمہاری خاموشی کو ہاں سمجھوں۔" راحیلہ کا مسئلہ وہیں کا وہیں تھا۔
"یا اللہ... مجھے آ لینے دیں راحیلہ امی!" مشکل ہی سے مگر اس نے کہہ دیا۔
"اچھا..." راحیلہ کے انداز میں مایوسی آ گئی۔
بشائر نے ریسور رکھ دیا۔ "اف۔" اس نے بالوں میں ہاتھ چلا کر ٹینشن دور کرنے کو لمبے لمبے سانس لیے باہر ہوا میں بیٹھتی ہوں۔
کچن ونڈو سے عدینہ کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے حد سنجیدگی' الجھن تھی اس کی نگاہیں چولہے پر رکھی کیتلی پر تھیں۔ مگر دھیان کا پنچھی کسی اور ہی جہان کی پرواز کو گیا تھا کہ نہ پانی کا شور واپس لا رہا تھا نہ قہوہ کے جلنے کی بو۔
"کیا کر رہی ہو عدینہ... سب جل گیا۔" اس نے تیزی سے چولہا بند کیا۔ اندر قہوہ پیندے سے چپک کر کاڑھا سا بن چکا تھا۔ "دھیان کہاں ہے تمہارا؟"
"اوہ... !" عدینہ چونکی' وہ بشائر کو دیکھ تو رہی تھی مگر

مکمل "واپسی" نہیں ہوئی تھی۔
"مہمان ہیں جی صاحب جی کے کمرے میں۔۔۔" بھولی ٹرالی گھسیٹ کر کچن میں لا رہی تھی۔
"کون آیا ہے؟" اس نے باری باری دونوں کی صورت دیکھی۔
"شمسہ آنٹی اور انکل ہیں۔ شاید بخت بھی ہے دادا جان کے کمرے میں۔۔۔" عدینہ نمکو پلیٹ میں نکالنے لگی۔
بشائر کو عدینہ کا انداز غیر معمولی لگا۔
"تو مجھے بلا لیتیں۔ لاؤ بتاؤ کیا کرنا ہے۔" وہ بولی اور پھر کیتلی دھونے سنک کے پاس چلی آئی۔
"میں برتن دھوتی ہوں باجی' آپ کباب تل لیں۔" بھولی نے کہا "دادا جان کے لیے سوپ بھی لے کر جانا ہے۔"
عدینہ اسٹول پر ٹک چکی تھی۔ وہ ان دونوں کو کام کرتا دیکھ رہی تھی مگر سوچیں اب پھر کہیں اور تھیں۔
بشائر نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے منٹوں میں ٹرالی سیٹ کی اور پھر خود ہی عظیم خان کے کمرے کی جانب گئی۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا شے انہیں روکے ہوئے ہے۔ بس یہ طے ہے کہ مجھے مامون اور عدینہ ہی کو بیاہنا ہے۔ اس میں کاہے کا اختلاف یا انتظار۔۔۔ ہاں وہ کاروبار سیٹ کر رہا تھا۔ ماشاء اللہ کتنوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ گھر بنانے لگا وہ اس میں بھی کامیاب اور اب اس سے بڑھ کر مناسب وقت اور کیا ہو گا۔" رابعہ خاتون کی دبی آواز میں جوش سا تھا۔ خفگی اور سخت الجھن۔۔۔ ٹرالی لاتی بشائر غیر ارادی طور رک گئی۔
ہاں! یہی شاید فیصلے کا وقت ہے۔ خالہ دادی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ مگر آخر دادا کو کیا مسئلہ ہے۔ بشائر نے سوچا۔
"اب بھی چپ شاہ بنے بیٹھے ہیں۔ مجال ہے جو ایک حرف بولیں گے؟" رابعہ خاتون کے مخاطب شمسہ بیگم اور کاظم شاہ تھے۔
"میرے خیال میں تمہیں چاہیے کہ تم بھابھی بیگم کو تسلی سے سب بتاؤ' سمجھاؤ اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔" کاظم انکل نے سنجیدگی سے کہا۔
ساکت کھڑی بشائر چونکی تو ٹرالی کو دھکا سا لگا۔ برتنوں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی جھنکار۔۔۔ کمرے میں یکدم خاموشی چھا گئی۔ بشائر چہرے سے تاثرات مٹا کر پردہ ہٹا کر داخل ہو گئی۔ وہ سامان میز پر لگانے لگی۔
"تم جاؤ بیٹا۔۔۔ میں چائے بنا لوں گی۔" شمسہ بیگم کی آواز پر کپ اٹھاتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

☼ ☼ ☼

"بس ایسے ہی خوامخواہ۔۔۔ تم کیوں رو رو کر ہلکان کرتی ہو۔ ڈرے ہوئے ہیں تمہارے دادا' سالوں پہلے ایک نتیجے پر پہنچے اور اب تک اس پر کاربند ہیں۔ تمہیں سب معلوم ہے ناں بچے!" رابعہ خاتون عدینہ کو پچکار رہی تھیں۔
"بس آلینے دو مامون کو۔۔۔ مجھے اب کسی کی نہیں سننی۔ بس کر گزرنی ہے۔۔۔ نہ نہ رو میری گڑیا رانی!" ایک ہاتھ سے اس کے لہریے دار بال سمیٹے اور دوسرے سے آنسو پونچھے۔
"فیصلہ تو دادا جان ہی کا ہو گا۔" اس نے روتے ہوئے یاد دلایا۔
"ہاں۔۔۔ ہاں ان ہی کا ہو گا۔۔۔ لیکن ہمارے حق میں۔"
"آپ سچ کہہ رہی ہیں دادو؟" وہ بے یقین تھی۔
"سولہ صد سچ۔" رابعہ خاتون نے اسے اپنی گود میں چھپا سا لیا۔
اور مامون اگلے ہی روز صبح ساڑھے سات بجے پہنچا بشائر ہی نے اسے سب سے پہلے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ چھوٹے سے لان نما احاطے کی دیواروں پر لگے آرائشی گملوں میں پانی ڈال رہی تھی اسٹول پر کھڑے ہو کر۔۔۔ پانی کی بوتل ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی۔
مامون کی رنگت سنولائٹ کی جانب مائل تھی۔ ہلکی بڑھی شیو۔ پریشان بال اور گمبھیر چہرہ۔ وہ جینز اور آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں تھا۔ اس کے پیروں میں گرد تھے، نجانے کس دیار کی خاک چھانی تھی کہ گرد کا سراپا پورے وجود سے لپٹا تھا۔ گرد پلکوں سے لپٹی تھی انتہائی ناگفتہ حلیہ۔۔۔ بشائر نے پہلی بار دیکھا تھا۔
حسب عادت اندر جانے سے پہلے سگریٹ کے طویل کش لے رہا تھا۔ بشائر اپنی محویت سے انجان تھی۔ سگریٹ جوتے تلے مسلتے ہوئے مامون نے اسے دیکھا۔ وہ چونکا۔ کھانس کر اسے چونکایا۔۔۔ اوہو۔۔۔ بشائر نے گری بوتل کو دیکھا اس کے چہرے پر خجالت آ رکی تھی
اپنے بیگ کو وہیں چھوڑتا وہ اس تک آیا اور زمین پر گری بوتل اس کی سمت بڑھائی۔
"وہ۔۔۔ میں۔۔۔ ان بیلوں کو پانی دینے کے لیے" اس نے اوپر چڑھنے کی توجیہہ پیش کی۔ وہ ہنوز اوپر تھی مامون نے نظریں اوپر اٹھا کر اس کے چہرے پر کا ٹیں۔ ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ کو وہ روک چکا تھا مگر آنکھوں سے چھلکتی کو اس نے چھوٹ دے دی۔
"آپ کو بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے؟" اس کا اشارہ اسٹول پر چڑھنے کا تھا۔ یقیناً وہ اس کی دراز قامتی کو کہہ رہا تھا۔ بشائر چونکی۔
"آپ سراہ رہے ہیں یا چڑا رہے ہیں؟"
"کیا آپ چڑ جایا کرتی ہیں؟"
"نہیں اب نہیں۔۔۔ مگر اسکول کے زمانے میں۔۔۔ دراصل میں کلاس فیلوز سے خاصی لمبی تھی۔"
"آپ اب بھی خاصی لمبی ہیں۔" مامون کا لہجہ متبسم تھا۔
بشائر نے آنکھیں سکیڑ کر اس کا چہرہ جانچا۔ مامون نے دونوں ہاتھ صلح جو انداز میں سیدھے کھڑے کیے۔
"یہ میں نے سراہا ہے۔ بیوٹی فل ہائٹ۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ ستائشی انداز۔ بشائر کو زندگی میں پہلی بار اپنے قد پر جی بھر کے پیار آیا فخر ہوا۔
"کیا آپ یونہی کھڑی رہیں گی؟"
"آں۔۔۔ نہیں میں اتر۔۔۔ تی ہوں۔" اس نے دوپٹے کو شانے پر ٹکایا مبادا پیروں میں لپٹے اور وہ منہ کے بل نیچے گر جائے۔
مامون نے الٹا ہاتھ بڑھایا۔۔۔ بشائر نے بوتل تھما دی۔ وہ دیوار پر اپنا ہاتھ جما کر نیچے اترنے لگی جب اس نے مامون کا سیدھا ہاتھ بڑھا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں تو اب کچھ نہ تھا تو پھر کیا۔
اس نے سوالیہ نگاہوں سے مامون کا چہرہ دیکھا۔ مامون کا چہرہ مسکراہٹ سے معمور تھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے اپنا ہاتھ دکھایا کہ وہ اسے تھام کر اترے۔
مامون مینرز نبھا رہا تھا۔ تو اسے بھی نبھانے پڑیں گے۔ اس کا نازک انگلیوں والا ہاتھ مامون کے مضبوط ہاتھ میں پل بھر کو گیا۔ وہ جست لگا کر نیچے اتر آئی
"تھینک یو۔۔۔"
مامون نے شانے اچکائے۔ بوتل اسے تھما دی۔ اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ بشائر نے دونوں ہاتھوں میں بوتل پکڑ کر اسے سینے سے لگا رکھا تھا۔ بوتل کا ڈھکن ہونٹوں سے جڑا تھا' وہ اس راستے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے مامون البصار گزرا تھا۔
ہاں تو اصل فساد کی جڑ اس شخص کو دیکھنا ہے۔ سارے ارادے اور وعدے ملیا میٹ ہو جاتے ہیں۔ یہ شخص سامنے ہو تو بشائر پھر تمہارے لیے اور کہیں کچھ نہیں ہوتا۔ تو سب سے بہتر یہ ہے کہ اس جگہ سے دور ہو جاؤ جہاں اس شخص کی موجودگی کا اندیشہ بھی ہو' زندگی بہت چین سے بے فکر گزرے گی۔

☼ ☼ ☼

معذور بچوں کی فلاح بہبود کی آرگنائزیشن نے بڑے پیمانے پر چیریٹی شو کا انعقاد کیا تھا۔ لوگوں کو باشعور کرنے کی کوشش۔۔۔ بچے معذور کیوں ہوتے ہیں۔ پیدائشی یا بعد میں ہونے والی کوئی خطرناک بیماری؟ علامتیں' حالات' واقعات' تدارک' پیش بندی' ڈاکٹروں کا ایک بورڈ تھا کچھ پیرنٹس جو والنٹیئری آگے بڑھ کر اس حوالے سے کام کرتے تھے۔

وہ اس کلب کی رکن تھی اور عون کے ہمراہ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتی تھی۔ اس بار کا فنکشن یوں بھی اہم تھا کہ فنکاروں اور کچھ کھلاڑیوں نے والینٹری شرکت کی اور ہالی وڈ کی ایک بڑی اداکارہ خاص طور پر آئی تھی۔

ملکی و غیر ملکی میڈیا وینز قطار سے کھڑی تھیں اور رپورٹر خبروں کی تلاش میں ایک دوسرے کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پروگرام نے بہت کامیابی سمیٹی اور نتیجہ میں چندہ بھی۔

اس کے چہرے پر ایک طمانیت تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر کبھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ اخبارات یا چینلز کی فرنٹ پٹی پر چلے (کم از کم اس حوالے سے) مگر اسے اپنے اس حوالے پر کوئی شرمندگی نہ تھی۔

یہ حوالہ تو اس کا فخر تھا' اس کا کُل۔۔۔ حاصل۔ وہ ایک ماں کی حیثیت سے یہاں تھی۔ وہ عون کی ماں تھی اور اس کا بچہ دنیا کا سب سے خوب صورت پیارا بچہ تھا۔ وہ کیمروں کی زد سے ذرا دور نسبتاً "ویران" گوشے میں کھڑی کانچ کے نازک گلاس سے گھونٹ گھونٹ شربت حلق سے اتار رہی تھی۔ وہ دور جہاں بچوں کا رش تھا۔ مومن پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ سارا وقت اسی کے ساتھ تھی مگر ابھی کسی کام سے اس جانب آئی تو ٹھہر گئی۔

پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بے فکری سے محو گفتگو سیاہ کوٹ میں وہ۔ اس نے ایک لحظہ ٹھہر کر پہچان لیا۔ کنفرم۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے بالکل پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ دروازے پر دستک دینے کے سے انداز میں اس کا شانہ بجایا۔ مقابل کے گردن گھمانے پر وہ ایڑیاں ذرا سی اٹھا کر شریر انداز میں سر جھکا گئی۔

"بیسٹ آف لک۔۔۔!" اس کے لبوں سے نکلا۔

"اوہ آپ۔۔۔!" وہ حیرت سے مڑا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی کھل کر مسکرایا' ایڑیوں پر گھوم گیا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے بھر گئی تھیں۔

"آپ بھی۔۔۔ یہی کہیں گی۔" اس نے مسکرا کر شکوہ کیا۔

"میں کیا۔ سارا شہر' بلکہ ساری دنیا کہہ رہی ہے بیسٹ آف لک۔" اس نے اس کے ٹاک شو کے ہٹ ہونے کا حوالہ دیا "تم نے کمال کر دیا۔ ہر جگہ واہ واہ ہے۔ تم اتنے ہی قابل تھے۔ مجھے یقین تھا۔" وہ بہت خوش تھی۔ "مجھے تم پر فخر ہے تم۔۔۔"

"اب سامنے دیکھ لیا تو منہ بھر بھر کے ڈونگرے تعریفوں کے۔۔۔ ایک فون تک تو کیا نہیں۔ میں نے بھی سوچ رکھا تھا نہیں تو نہ سہی۔" وہ بالکل کسی معصوم بچے کی طرح کہہ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر شرمندگی نے تاریکی سی پھیلا دی۔

"ایسا نہیں ہے۔ تم جانتے تو ہو' میں کتنی مصروف رہتی ہوں۔" وہ جواب سن کر پل بھر کو خاموش رہا پھر اپنے ساتھی سے معذرت کر کے اسے لیے آگے بڑھنے لگا۔ وہ دونوں ایک کونے میں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر ٹکی اس کی نگاہوں سے گھبرا کر چہرہ اٹھایا۔

"مجھے آپ کی مصروفیات کا یقین ہے۔" اس نے شعوری وقفہ دیا۔ "آپ کے شوہر نامدار نے دلایا تھا۔"

"وہ تمہیں کہاں مل گئے؟" وہ بری طرح چونکی۔

"ملے کہیں نہیں' بس دیکھے تھے۔"

"تو پھر۔۔۔؟"

"دراصل ان کے ساتھ جو خاتون تھیں۔ وہ آپ نہیں تھیں ناں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کسی اور جگہ۔۔۔"

"تم میری اور جگہ تو جانتے ہو ناں۔۔۔ پچھلے دنوں عون بہت بیمار رہا اس کی بیماری میں مجھے اور کسی چیز کا ہوش ہی کب رہتا ہے۔"

"عون کی بیماری تو آج کل کی بات ہو گی۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میں تو بہت پرانی بات کر رہا ہوں۔"

"ایسے ہی وہم ہے تمہارا۔۔۔ وہ کچھ افتتاح وغیرہ کا سلسلہ تھا۔"

"کسے تسلی دے رہی ہیں۔ مجھے یا خود کو۔۔۔"

"ہم دونوں کو۔۔۔" اس نے پہلی بار نظریں اٹھائیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کہا "ہم دونوں کو اس کی ضرورت ہے ناں۔۔۔"

اس بار اسے نظریں چرانی پڑی تھیں۔ وہ اس ہجوم کو دیکھنے لگا جو ہالی وڈ ایکٹریس کو دیکھنے کو بڑھتا جا رہا تھا۔

"اور کسی کو عقل کی۔۔۔" اس نے دیکھے بغیر کہا

"مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟" وہ بھی وہیں کو دیکھ رہی تھی۔

"ڈھکی چھپی باتوں' معنی خیز جملوں' قیافوں کے بجائے صاف بات کر لینی چاہیے۔" وہ اس کی جانب مڑا اور مشورہ سادے ڈالا۔

"تو پھر تم ہی بسم اللہ کرو۔ سب سے لمبی چپ تو تمہاری رہی تھی۔" اس نے جتایا۔

"تو کیا کہہ دینے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟"

وہ کچھ نہ بولی پھر موضوع بدلنے کو کہا۔

"عون تمہیں یاد کر رہا تھا۔"

"کیسے بھلا؟" اس نے چونک کر دیکھا عون کے پاس ایسے ری ایکشن نہیں تھے جن سے وہ دل کا حال وضاحت سے بتا سکتا' اس کی حیرت بجا تھی۔

وہ سنبھل کر دل گرفتی سے مسکرائی۔

"تمہارے شو کی کلپ چل رہی تھی۔ ایک دم زور زور سے ہمم مم کہنے لگا تو۔"

"وہ مجھے مم کہتا ہے؟" اس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔

اسے چپ سی لگی۔ "اسے مم ہی کہنا آتا ہے۔" اس کی آواز کرچی کرچی تھی۔

"اوہ۔۔۔ تو پھر باپ کو بھی مم کہتا ہے' کیسا لگتا ہے پھر آپ کے شوہر نامدار کو۔۔۔" اسے مزہ آیا تھا۔

"وہ باپ کو کسی نام سے نہیں پکارتا۔ وہ باپ سے ڈرتا ہے۔ اس کی موجودگی سے گھبراتا ہے۔ وہ شاید باپ کو ناپسند کرتا ہے۔" اس کا لہجہ خود اذیتی سے بھر گیا

تھا۔
"ناپسندیدگی کا جواب ناپسندیدگی ہی ہوگا ناں۔" یہ خود کلامی تھی۔
"تو پھر محبت کا جواب محبت کیوں نہیں؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔
"تم نے کب اظہار کیا؟ بس دل ہی دل میں پوجتے رہے۔ اتنے پریکٹیکل ہو کر تمہاری یہ ڈھکی چھپی عاشقی مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔ تم نے اسٹیپ اٹھایا ہوتا تو شاید کہانی کچھ اور ہوتی۔ منہ سے براہ راست نہ سہی کوئی اشارہ ہی دیتے۔ بس جوگ لے کر بیٹھے ہو۔ تم سے تو افسوس کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔۔۔ بس تم پر افسوس ہوتا ہے۔"
وہ پرملال مبہم مکالموں کے اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے چہک کر بولی تھی۔ اور پہلے بھی تو ہزار بار وہ ہزار طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کر چکی تھی۔ مگر ادھر وہی ایک پراسرار مسکراہٹ جواب ہوتی۔
"بے وقوف ہیں آپ۔۔۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔
"وہ اونچی ذات والوں کے من مندر کی دیوی تھی۔ نچلی ذات والوں کی بھینٹ پر کب نظر کرم کرتی، ہم تو بس چوری چھپے دھرم نباہتے تھے۔ اور دیویاں بے خبر نہیں ہوتیں، بن کر رہتی ہیں بس یہی دعا کرتے رہے کہ اس برہمن پجاری کو کانوں کان خبر نہ ہو۔۔۔ باقی سب پھر شانتی ہے۔"
اس نے اپنے سوال کے جواب کے لیے بہت سے موزوں جواز از خود تلاشے تھے۔ مگر یہ کبھی نہیں۔ اتنی خوب صورتی اور گہرائی سے وہ ہی کہہ سکتا تھا۔ وہ جیسے سکتے کی سی کیفیت میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔
اس کا نام پکارنے کو اس کے ہونٹ نیم وا ہو کر خود ہی آپس میں جڑ گئے۔ وہ تحیر کی انتہاؤں پر تھی۔
"تمہارا مطلب ہے، وہ جانتی ہے۔۔۔ مطلب جانتی تھی کہ تم۔۔۔ او مائی گاڈ!"
"آپ محبت کو کیا سمجھتی ہیں۔ مختلف طریقوں سے کی جانے والی چار لفظوں کی ترتیب۔۔۔ ہونہہ پریم، پیار۔ لو (Love) محبت بے ترتیبی کا دوسرا نام [illegible] الٹ پلٹ کر دینے والی، اندر باہر اکھاڑ پچھاڑ [illegible] والی۔ بارش کہیں بہت دور بھی برسے تو ہوا [illegible] گن لے آتی ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس [illegible] اٹھنے والی پھوار کی مہک نے اگلے کی قوت شامہ کو [illegible] نہ کیا ہو۔"
وہ اس کی متحیر آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالے [illegible] کی طرح دور کی کوڑی لایا تھا اور وہ شاید قوت گویائی [illegible] چکی تھی۔ حلق خشک۔۔۔ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بدقت بولی۔
"اور۔۔۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ سرتاپا کسی اور کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے اور تم تب بھی۔۔۔؟" [illegible] یا انسلٹیا۔۔۔
"میں پھر کہوں گا، بے وقوف ہیں آپ۔" وہ مسکرایا۔
"وہ رنگ۔۔۔ عادت تھا جواب رقابت میں [illegible] گیا ہے۔ جب فیصلہ سنا دیا جائے تو بیچ پر کھڑے رہنا نادانی ہوتی ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس نے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا۔"
"تو کیا تم انتظار کرو گے؟" وہ دکھ سے دہری ہو رہی تھی۔
"تو اب تک کیا کر رہا ہوں؟" اس نے الٹا جواب کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟" اس نے اچانک سوال کر دیا۔
"تمہارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ تم مجھے سمجھانے کا سوال کرو؟" وہ چونکا نہیں۔ وہ نیل پالش کے سوکھنے کی منتظر تھی۔ ہاتھ اور پیر ذرا سے پھیلائے ہوئے آرام دہ حالت میں صوفے پر بیٹھی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں شوہر کا عکس دیکھ رہی تھی۔ جو پینٹ اور سفید بنیان میں ملبوس تھا اور پینٹ کی بیلٹ کس رہا تھا۔

"کچھ خیال و گمان وقت کے محتاج نہیں ہوتے، وہ [illegible] کے ساتھ حاضری لگواتے ہیں۔ کبھی خود کو [illegible] نہیں دیتے؟"
"تم گفتگو بہت اچھی کرتی ہو۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔" [illegible] آسمانی نئی شرٹ پہن رہا تھا۔
"پہلے آپ میری گفتگو پر فوراً" عمل درآمد کر لیا کرتے تھے۔" اس نے جتایا۔
"کیا تم مجھے اب بھی کچھ کرنے کو کہہ رہی ہو۔" [illegible] کرتے ہاتھ رکے۔ شوہر نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"ہاں!" اس کی آواز بے جھجک، دوٹوک اور واضح [illegible]
"کیا؟"
"میں کہہ رہی ہوں کہ یہ جو آپ کر رہے ہیں نہ کریں۔"
"میں کیا کر رہا ہوں؟" اس نے اپنی شہادت کی [illegible] اپنے سینے پر رکھی۔
"انجان مت بنیے۔ میں واقعی اس بات کو بہت مدت سے سوچنے لگی ہوں کہ آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی جب۔۔۔ جب یہی سب کرنا تھا۔ کیا آپ کو لو ٹرائی اینگلز بہت پسند ہیں۔"
وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ وہ قیمتی پرفیوم کو خود پر چھڑک رہا تھا۔ ایک تازگی کا احساس تناؤ بھرے ماحول پر چھانے لگا۔
"تمہارے پاس تیار ہونے کے لیے صرف دس منٹ ہیں۔ ہمیں وقت پر پہنچنا ہے۔"
وہ اس کے صوفے کے پاس آ رکا تو اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے اسے سرتاپا دیکھا۔ نک سک سے درست۔ وجاہت مردانگی کا شاہکار۔ اس پر امارت کا رنگ اور سب سے بڑھ کر اپنی خوبیوں سے آشنائی نے آنکھوں میں ایک احساس تفاخر ثبت کر دیا تھا۔
وہ آج بھی آسمانی بجلی کا وہ لپکا تھا۔ جو بھسم کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔
ایک ایسا کوندا جو دل کو جلاتا تھا۔ جو دل کو بجھا بھی دیتا تھا۔
آج بھی اس چہرے پر حق سے نظر ٹکانا ایک انعام تھا اور آج بھی ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھنا ایک امتحان۔۔۔
اس نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔ اتنا سب کچھ۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔ اتنی جیت۔ اتنی ہار۔۔۔ اتنے موسم مگر دل میں آج بھی محبت زندہ تھی۔
آنکھوں کے آگے یادداشتوں کی فلم سی چل گئی تو نین کٹوروں میں نمی ہلکورے لینے لگی۔
ایک تکلیف دہ کیفیت کے زیر اثر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اس کے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ اس کا شوہر ہینگر میں لگی سیاہ فراک اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ فراک ٹخنوں تک لمبی تھی اور گھیرے پر سلور پھول اور نگ ستارے ٹکے تھے۔ چاندی کے جیسی نازک ہیل پاس ہی زمین پر پڑی تھی۔ اب شوہر کے ہاتھ میں ڈائمنڈ نیکلس سیٹ تھا۔ جو اس نے ہی برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔ وہ بیوی کے تمام ملبوسات ملک کے نامور ڈیزائنر سے خریدا کرتا تھا بمعہ لوازمات۔۔۔ اس کی بیوی نے عرصہ ہوا ان چیزوں میں دلچسپی لینی چھوڑ رکھی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ سارا وقت گھر میں رہتی اپنے بیٹے کے ساتھ یا پھر مصلے پر تسبیح ہاتھ میں لیے۔۔۔ مگر وہ ایسی بیوی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شانہ بشانہ ہاتھ میں ہاتھ لیے چلنے والی بیوی درکار تھی۔
دروازے پر گھبرائی سی دستک کے بعد آیا اندر داخل ہوئی۔ وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔ شوہر کے چہرے پر ناگواری سی در آئی۔
"وہ۔۔۔ وہ عون بابا۔۔۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے بے اختیار ریف ہاتھ سے چھوڑ دیا عون کو دو روز سے ہلکا بخار تھا۔ وہ کسی صورت اسے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔
مگر یہ ایک بزنس ڈنر تھا جہاں اس کا اپنے شوہر کے ساتھ پہنچنا بہت ضروری تھا۔ بیٹے کی بیماری سے بھی زیادہ۔
اس کے ڈھیلے پڑتے ہاتھ اور بدلتے رنگ کو بغور

دیکھا تھا اس کے شوہر نے۔ اس نے اپنے چہرے پر پھیلی درشتی کو لہجے میں آنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی وہ آیا سے مخاطب ہوا۔

"آپ جانتی ہیں ناں کہ ہم ایک امپورٹنٹ بزنس ڈنر کے لیے جارہے ہیں آپ کو یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

آیا نے ذرا سی نگاہ میڈم کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں بس ٹپکنے کو تھیں۔

"پلیز۔" سر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کے لیے دروازہ دکھایا۔ وہ اس بار میڈم کی جانب دیکھے بغیر سرعت سے نکل گئی۔

"کیا اب آپ سے بھی کہا جائے گا کہ ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔" وہ تسلی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے طنز سے بولا۔

"میں بس دوائی پلا آتی ہوں۔" اس کا دل بیٹے کے پاس جانے کو ہمک رہا تھا۔

وہ جوابا" کچھ نہ بولا اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر گھڑی دکھائی۔ مگر چہرے کے انتہائی درشت تاثرات۔۔۔

وہ کپڑے بدل کر لوٹی تو آنکھوں کی سرخی بتاتی تھی، وہ رو کر آئی ہے اس کی ذرا سی جنبش سے فراک کا گھیرا بل کھا جاتا تھا۔ وہ اب ڈریسنگ کے آئینے میں اسے بغور دیکھ رہا تھا یقینا" اس کی بیوی کا حسن لوازمات کا محتاج نہیں تھا۔ وہ اپنے اداس چہرے کو غازے سے رنگ رہی تھی۔ ضبط گریہ سے سرخ آنکھوں پر اس نے کاجل سے خط کھینچ دیا۔ اپنے کپکپاتے لبوں پر گلابی رنگ پھیر دیا۔ اپنے پیروں میں چاندی کی جوتی پہننے کے بعد وہ نیکلس کا ہک بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ سی تھی۔ وہ ہک بند کرنے کے لیے اٹھ آیا۔ آئینے میں ان دونوں کی جوڑی چاند سورج جیسی تھی۔

"آپ کو مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی مامون!" اس نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے ایک ہارا سا جملہ کہہ دیا۔ اس کی گردن پر سرکتی انگلیاں پل بھر کو تھمیں۔ آئینے میں وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نظر آئے۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو بشائر! مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس نے ملائمت سے اس کے گال پر انگلی پھیری۔

☼ ☼ ☼

"وی آر ناٹ اسپیشل (We are not special)

ہمیں احساس برتری کی ضرورت نہیں۔ ہم برابری کی بنیاد پر جینا جانتے ہیں۔"

W.N.S نامی معذور بچوں کی فلاح و بہبود کا یہ سماجی ادارہ اپنے پچاس سال پورے ہونے پر بڑے پیمانے پر پروگرامز کر رہا تھا۔ انہی میں ایک نئے اعزازی صدر کا انتخاب بھی تھا اور وہ بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئی۔

اس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا معذور ہونے اور معذور کی ماں ہونے میں کتنا درد ہوتا ہے۔ اس کے حلقہ احباب کا پرزور اصرار تھا کہ ایک گرینڈ پارٹی دی جائے اسے پارٹی دینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر پارٹی اپنے گھر میں دیتی یا کہیں باہر، مامون کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ وہ کیا کہہ کر لوگوں کو بہلاتی کہ۔۔

اور یہ۔۔۔

پارٹی کا سن کر مامون نے بہت خوش ہونا تھا۔ مگر یہاں مسئلہ پارٹی کی نوعیت کا تھا۔ وہ ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل نیک نام ادارے کی صدر بنا دی گئی تھی۔ مگر اس ادارے کی وجہ شہرت تھی معذور بچے۔۔۔ اور مامون شاید اس پر خوش ہو جاتا اگر اس کے اپنے گھر میں ایک معذور بچہ نہ ہوتا۔

نہ تو بشائر نے کبھی تجزیہ کیا اور نہ خود اس نے کہ اسے اپنے ہی جگر گوشے کو دنیا کے سامنے لانے میں کیا ہچکچاہٹ تھی۔

مامون کے چند جاننے والوں نے اسے بشائر کی اس عزت و کامیابی پر جب مبارکباد دی تو وہ بھناتا ہوا گھر لوٹا تھا۔

"کوشش کیا کرو کہ تمہاری سرگرمیاں مجھ تک کسی بھی حوالے سے نہ پہنچا کریں۔"

اور اب ایسے میں وہ اس سے امید رکھتی کہ وہ اپنے گھر میں ایسی کسی پارٹی کی اجازت دے گا اور اس میں شرکت کرے گا۔ نو۔ نیور امپاسبل۔۔۔

ابھی پرسوں ہی تو اس نے اس کا اچھا موڈ دیکھ کے پوچھا تھا۔

"ٹاک شو میں بلوایا ہے مجھے۔۔۔!"

"گڈ۔۔۔ کون سا ٹاک شو۔۔۔"

"بیسٹ آف لک۔۔۔ ود بخت!" اس نے کہا۔

"بہت تعریفیں سن رہا ہوں میں اس شو کی۔۔۔ ریٹنگ بھی نمبرون جا رہی ہے ضرور جاؤ۔ وہ ایسے ہی کام کر سکتا تھا۔" اس نے تنقید کی تھی یا تعریف۔۔۔ مگر بشائر کو برا لگ گیا۔

"ایسے ویسے کام کا کیا مطلب۔۔۔ وہ اتنا لائق فائق پڑھا لکھا۔ اسے یہی کام کرنا چاہیے تھا اور اگر آپ کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھیں تو لاکھوں کما رہا ہے۔ ایسے جوانوں کی ہی تو ضرورت ہے اس۔۔۔"

"اور اس ایسے جوان نے آپ کو کس سلسلے میں بلوایا ہے؟"

وہ گڑبڑا گئی۔

"وہ۔۔۔ W.N.S کی ففٹی ایرز پر ہونے والے ایونٹس اور۔۔۔"

"اور معذور بچوں کے بارے میں آپ سے زیادہ اتھنٹک (مستند) رائے کہاں سے مل سکتی ہے۔" مامون نے اس کا جملہ اچک لیا۔ "اونہہ! جو نہیں جانتے وہ بھی جان لیں کہ۔"

"وہ ہمارا بچہ ہے مامون۔۔۔!" وہ تڑپ اٹھی۔

"ہاں۔۔۔ مگر برائے مہربانی اسے ہمارا بچہ ہی رہنے دو قوم کا بچہ بنانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ نمائش کا ارادہ ہے ہونہہ!"

اور ایسے میں وہ اس پارٹی میں شرکت کرے گا؟ جہاں میڈیا کا جمگھٹا ہو پھر بھی اس نے کوشش کی تھی۔

"پلیز مامون۔ میری شناخت مسز بشائر مامون ہے میں گھر کی پارٹی میں مہمانوں کو اکیلے ریسیو کرتے کتنی امبیریس ہوں گی۔ تھوڑی دیر کو ساتھ رہ کر آپ معذرت کرلینا کہ آپ کو کہیں ارجنٹ جانا ہے مگر ویل کم کہنے کو تو موجود ہوں۔

اس نے ان خوب صورت آنکھوں کی قطعیت کو دیکھا، اسے سحر زدہ کر دیا تھا کبھی ان آنکھوں نے

"عون سامنے تھوڑی آئے گا۔ بچے تھوڑی ہوں گے۔ ہمارے کچھ فیملی فرینڈز اور باقی ادارے کے اراکین وغیرہ جسٹ پارٹی۔ ڈنر اور بعد میں سوچ رہی ہوں۔ کسی غزل گائیک کو بلوالیں۔" اس نے ملتجی لہجے میں اپنی منتوں کو پرکشش بنایا۔

اور مامون نے پہلی بار پرسوچ انداز میں اسے دیکھا۔

"اوکے۔۔۔ مگر میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں رک سکتا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہ تھینک یو۔۔۔ مامون!" اس نے یکدم سرشار ہو کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس کے چہرے پر خوشی نے خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے۔ موتیوں جیسے دانتوں کی قطار احساس کروائی تھی وہ ہمیشہ مسکراتی رہے۔ مامون نے بے ساختہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے قریب کیا۔ بحث تمحیص منت ترلے۔۔۔ پیار لاڈ ناز و ادا ان کے رشتے سے کب یہ چیزیں غائب ہوئیں۔ پتا ہی نہ چلا ایسا برجستہ التفات تو گئے زمانوں کا قصہ ہوا۔

ان دونوں کے لیے بھی ایک دوسرے کا لمس اور قربت گویا حیرانی تھی۔ پل بھر کی بے خودی، بشائر نے دھیرے سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ عرصہ پہلے اس نے اس شخص سے عشق کیا تھا۔ بے حد، اسے یاد تھا ذرا ذرا۔

"عورت کا دوسرا نام بے وقوفی ہے۔"

☼ ☼ ☼

مامون نے آدھے گھنٹے ٹھہرنے کا عندیہ دیا تھا۔ مگر وہ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک پارٹی میں موجود رہا۔ بڑے

بڑے نامی گرامی لوگ موجود تھے۔ میڈیا کی چند جانی مانی شخصیات اور کچھ رپورٹر وغیرہ بھی..... وہ بہت عرصے بعد دل سے خوش تھی۔ مامون کی ہمراہی کا فخر اس کی سنگت کے "جبر" نے کب کا معدوم کر دیا تھا اور اس روز اس کے الجھے، ہارے، نڈھال، بے بس سوال کے جواب میں ملنے والا جملہ.....

"مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس نے اندر باہر سے مار ڈالا تھا۔

وہ لاشعوری طور پر کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ مگر جو جواب مامون کی جانب سے ملا وہ..... آہ.....

وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور پھر دو بدو اس کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی کہ جہاں مزاح یا یونہی۔ ایسے ہی خوامخواہ چھیڑنے کے لیے جواب دے دیا جیسا تاثر ملے۔ مگر وہاں موجود یخ بستہ سرد مہری، قطعیت اور بے فکری نے اسے بلندی سے منہ کے بل نیچے پھینک دیا۔ گویا آگے کچھ بولنے کے لیے، پوچھنے کے لیے بچا ہی نہیں۔

مگر اس وقت.....

مامون کی شخصیت کا تاثر سارے ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ پورے کا پورا اس کا ہو کر بھی اس کے لیے ایک امتحان کی طرح تھا۔ جسے کن اکھیوں سے دیکھنا ایک مسلسل خوشی اور اعزاز تھا۔

"تمیں تمیں میٹر کے یہ جبے (فراک) پہن کر گھومتی یہ خواتین.....

آپ عورتوں نے کہیں کپڑے کی اسمگلنگ تو شروع نہیں کر دی؟"

پرستائش آواز پر چونک کر گھومی تو فرش کو چھوتا اس کا سفید انگرکھا فراک چکر کھا گیا۔

"اوہ..... بخت! تم آئے تھینکس گاڈ!" اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

"آنے کا ارادہ تو نہیں تھا مگر آپ کا خفا چہرہ بار بار دھیان میں آ رہا تھا سو..... مجبوری۔"

"صحیح بات ہے اگر تم نہ آتے..... تو..... سچ میں بہت خوش ہوں۔ میں ایسا ہی کچھ کرنا چاہتی تھی مگر بے اختیار تھی۔ اب مجھے کون روکے گا۔ اب میں کر سکتی ہوں۔"

"آپ اپنے شوہر نامدار کو بھول گئیں۔ اصل روکنے ٹوکنے والے۔" بخت نے بروقت یاد دلایا۔

"اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا۔ "تم ملے ان سے.....

"نہیں، سیدھا ادھر ہی آگیا۔ روشنی ہی روشنی تھی جیسے چاندنی زمین پر اتری ہو۔ دیکھا تو آپ تھیں۔" وہ اس کے سفید لباس کو سراہ رہا تھا۔

"تم انہیں پسند نہیں کرتے ناں!" اس نے اصل بات کہی۔

"آپ بھی کمال ہیں خاتون..... غلط فہمی میں جیتی ہیں اور جی بھر کے جی لیتی ہیں۔" "وہ" مجھے پسند نہیں کرتے اور وہ بھی ہمیشہ سے۔"

"بلاوجہ ہی وہم ہے تمہارا۔"

"مصدقہ اطلاع یہ ہے کہ پہلے وہ مجھے ناپسند کرتے تھے اور اب باقاعدہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں..... اور میری انفارمیشن غلط نہیں ہوتی بھول گئیں" بیسٹ آف لک، وو بخت" سیاسی و سماجی حوالوں سے مستند ترین رائے رکھتا ہے۔ آپ کو پتا ہے لاسٹ ویک حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے خرانٹ بندوں کو بلایا تھا شو میں..... وہ بعد میں کہتے پائے گئے۔ بخت شاہ کو ہپناٹائز کرنا آتا ہے۔ وہ، وہ باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ جو کبھی بھی نکلنی نہیں چاہئیں اور آپ کہتی ہیں۔ وہم ہے تمہارا۔" وہ متبسم لہجے میں کہتے ہوئے اسے یقین دلا رہا تھا۔

"وہ ایسا کیوں کریں گے بخت.....؟" اس نے بخت کی دلیل کو مان لیا تھا۔

"عدینہ..... نہیں آئی؟" وہ بات بدلتے ہوئے بولا

بشائر کے چہرے پر مایوس سی مسکراہٹ آئی۔ "وہ میری تقریبات، مطلب میرے حوالے سے کب آتی ہے۔"

"اسے معلوم نہیں ہو گا، میزبانوں میں مامون صاحب موجود ہوں گے۔" بخت نے نکتہ نکالا۔

وہ سر جھکا کر جوتے کی ٹو سے گھاس کو ٹھوکر مارنے لگی۔

"میں نے دادو کو تو فون کیا تھا۔ مگر وہ گھر پر نہیں تھیں۔" بشائر نے جتایا۔

"وہ بیمار ہیں اور کل مامون، عدینہ کے ہمراہ انہیں لے کر ہاسپٹل گئے ہوئے تھے۔" بخت نے اسے چونکا دیا۔

"مامون نے مجھ سے ذکر نہیں کیا!" وہ ازحد حیران تھی۔

"اب کیا کیا ذکر کیا جائے۔" بخت کا انداز لاپروانہ تھا۔ "رابعہ آنٹی تو ٹیسٹ وغیرہ کرواتی رہیں اور یہ دونوں پہلے آغا خان کی کینٹین کی فش اڑاتے رہے بعد میں ہرے بھرے لان میں ٹہلتے پائے گئے۔ اس سے دو روز پہلے انہوں نے سنی پلیکس میں نئی فلم بھی دیکھی اور....."

"بخت..... تمہیں کیسے پتا چلا.....؟" وہ شدید شاک کے زیر اثر تھی۔ "تم کیا ان کا پیچھا کرتے ہو۔ اپ ٹوڈیٹ انفارمیشن..... مائی گاڈ جاسوس!" اس کی پھٹی آنکھیں اور اس پر معصوم سوال.....

"ایک طرف بہن کا گھر..... دوسری جانب بے بس دل..... ہم سا مجبور کون۔" وہ اتنے بڑے انکشافات کے بعد یکدم بے حد ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

"او ہائے بخت آپ بھی یہاں ہیں....." ایک سیاسی پارٹی کی خاتون لیڈر بڑے حیرت بھرے جوش کے ساتھ چلائی تھیں..... دونوں چونک کر مڑے اپنی گفتگو میں ہر شے کو فراموش کر دیا تھا۔

"آپ تو کہیں جاتے نہیں پھر یہاں.....؟" لیڈر کے لیے بڑی دلچسپی تھی۔ بخت کو پروگرام میں انوائٹ کیا جا سکتا تھا۔

"یہ موصوفہ..... بہن ہیں میری۔" بخت کے جملے نے بشائر کا دل پگھلا ڈالا، وہ ان سے معذرت کر کے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیوں آجاتی ہے وہ یہاں؟ کیا لینے کے لیے؟ اب کیا بچا ہے۔ جس کی فکر میں جب دل چاہا منہ اٹھا کر....." وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ تیز تیز بول رہی تھی۔

"کون سی سگی دادی ہیں آپ۔ جو فکر میں گھلتی ہیں محترمہ اگر اس طرح آئیں گی نہیں تو نمود و نمائش کیسے ہو گی اپنے جلوے دکھانے کی..... ابھی بھی بتانا ہو گا کہ انٹرنیشنل این جی او کی صدر بن گئی ہیں تو....."

"اس نے تو ایسا کچھ نہ کہا بیٹی!" رابعہ خاتون کی آواز نقاہت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "کس چیز کی صدر بن گئی ہے، اللہ اسے خوشیاں دے اور اس کا دل ٹھنڈا کرے۔"

وہ دل سے دعاگو تھیں۔

"دادو.....!" عدینہ کی برداشت جواب دے گئی۔ "اب اور کون سی خوشیاں.....؟ سب کچھ تو پا لیا۔ بلکہ چھین لیا۔ اب اور کیا ملے اسے کہ دل ٹھنڈا ہو ڈائن کا۔" غصے کی شدت سے وہ تیز تیز اونچا بول رہی تھی۔ لفظ ٹوٹے پھوٹے تھے۔

"اولاد کے دکھ سے بڑا کون سا دکھ....." رابعہ خاتون کی آواز پست ہو گئی۔

"ہونہہ.....!" عدینہ صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے نتھنے پھول رہے تھے اور آنکھیں شرربار۔

"کبھی روبی شکیل کا جوڑا چڑھا کر آجائیں گی۔ کبھی ایچ ایس وائے کے لان پرنٹ۔ میں خود بوتیک چلاتی ہوں..... کچھ اندازہ ہے ایک ایک جوڑے کی کیا قیمت ہوتی ہے؟ وائٹ گولڈ میں ڈائمنڈ جڑی رنگز پہنتی ہیں۔ ابھی گاڑی کا نیا ماڈل خرید اگیا ہے اور کیا چاہیے جو آپ آنکھوں میں آنسو بھر کے گڑگڑا کر اور خوشیاں مانگیں۔ زمین پر جنت مل گئی۔ حوا بن کر رہتی ہیں۔ آپ نے کبھی میرے لیے تو خوشیاں نہ مانگیں ایسے آنسو برسا برسا کر۔"

وہ غصہ کی انتہا پر تھی۔ جو منہ میں آ رہا تھا بولے جا رہی تھی۔

"اور اولاد کا دکھ تو وہ زندگی بھر سہے گی۔ اس کے کرموں کا پھل ہے۔ جب اس نے اپنی نزاکت' وقار کے جلوے دکھا کے آنکھوں کی سوئیاں نکال لیں۔ میں نے تو یہ سبق سیکھا ہے" آج کی ہو یا سالوں پرانی اس کو جاگتے ہی رہنا چاہیے۔"

اس کا لہجہ دکھ سے چور چور ہو گیا تھا۔ رابعہ خاتون کا دل مسلا گیا۔ وہ تسلی کے لیے کون سے جملے ترتیب دیتیں۔

"اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بیٹی...! تمہارے دادا..."

"دادا کا نام مت لیں..." وہ اچھل پڑی۔ "آپ مان کیوں نہیں لیتیں اس کی موقع شناس فطرت کو... اس نے باقاعدہ پلاننگ کی تھی دادو... آپ کو نہیں پتا ورنہ... ہم تو بیڈ روم کی کلر اسکیم چوائس کر رہے تھے اور باہر کی کراکری... اور آپ کو کیا یاد کرواؤں... بکسا کھول کر تو آپ ہی جوڑوں کو دھوپ لگوانے لگی تھیں اللہ کرے زندگی بھر روئے۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔ کوئی جادو کر دیا تھا اس نے... ورنہ یہ وہی مامون ہیں ناں... اور... اور یہ کیا تھیلے کے تھیلے بھر کے لے آتی ہے' مامون کی کمائی ہے۔ وہ دے تو دے۔ یہ کیوں اپنا پیر اوپر رکھتی ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کے رونے میں بے چارگی' ناکامی' تکلیف کے سو پہلو تھے۔

رابعہ خاتون نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا کر چپ کروانے کی خواہش کو تھپکا۔ وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور عظیم خان کے بعد بہت کمزور و بے بس۔ بیماری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ ان کے آنسو کنپٹی سے گزر کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

اور بشائر' جو رابعہ خاتون کے لیے شاپنگ کر کے آئی تھی۔ اس میں سے ایک بیگ گاڑی میں رہ گیا تھا۔ اس نے عدینہ اور رابعہ خاتون کے تمام مکالمے سنے تھے۔

اس نے بیگ دھیرے سے زمین پر رکھ دیا۔ وہ رات بہت خوش تھی۔ وہ رات ہی بہت ناخوش ہوئی تھی۔ ایک ادھورا انکشاف' پزل بکس کے چند حصے' جو ابھی جڑے نہیں تھے مگر مبہم اشارے ہی بتا رہے تھے تصویر بھیانک ہو گی۔

وہ ہمت کر کے بقیہ کڑیاں جوڑنے نکلی تھی۔ ادھر عدینہ کی زہر افشانیاں۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ اس پر لگائے الزامات میں کوئی صداقت نہ تھی۔

اس نے پانے کی خواہش ضرور کی تھی۔ مگر کوشش ہرگز نہیں۔ وہ تو بس ایسے ہی مل گیا۔

مگر کیسے اور کیوں...

اسے معلوم کرنا تھا۔



ڈنر کے بعد غزل پروگرام تھا۔ فرشی نشست تھی سازندے اپنے ساز سیٹ کر رہے تھے۔ جب وہ بہت مطمئن حالت میں کچھ دوستوں اور W.N.S کے پرانے اراکین چیف کے ہمراہ بیٹھ گئی۔

"میں تم سے مل کر بہت خوش ہوں۔" بوڑھی ڈاکٹر رئیسہ نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔ انہوں نے زندگی کے چالیس برس اس ادارے کو دیے تھے۔ معذور بچوں کے حوالے سے ان کی خدمات اور تحقیق نے دنیا بھر میں انہیں عزت سے نوازا تھا۔

"تمہارا ہسبنڈ بہت اسمارٹ ہے اور تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگتے ہو۔" وہ دور مامون کو دیکھ رہی تھیں۔ "مجھے پتا نہیں کیوں بار بار یہ لگتا ہے کہ میں اس سے پہلے بھی کہیں مل چکی ہوں۔" ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ وہ مسکرا دی۔

"ہو سکتا ہے ڈاکٹر رئیسہ... میں آپ کو ان سے ملوا دیتی ہوں۔"

مگر مامون تھوڑی دیر بعد نکل گیا۔ بشائر کے ذہن سے بھی محو ہو گیا۔ سب غزلوں پر جھوم رہے تھے۔ جب ڈاکٹر رئیسہ نے اسے اپنے نزدیک بلا لیا۔ وہ بہت جوشیلی ہو رہی تھیں۔

"مجھے سب یاد آگیا مسز بشائر!" وہ مسکرا رہی تھیں۔

"تم بہت لکی ہو جو تمہیں مامون جیسا شوہر ملا۔ اتنی

محبت کرنے والا۔۔۔ مجھے یاد ہے یہ 2005ء تھا جب وہ مجھ سے ملا۔ اس کے پاس ایک جینٹک ہسٹری تھی ویری ڈینجرس اور یہ پاگل ہو رہا تھا بہت پریشان۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ مامون آپ کے پاس کیسے آ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہو رہا ہے آپ کسی کے شبے میں۔"

"تم اپنے شوہر کی کزن ہو ناں؟"

"جی ہوں۔۔۔ مگر"

"دیکھو لڑکی! تمہارا شوہر اتنا گڈ لکنگ ہے کہ جو ایک بار دیکھ لے وہ ہمیشہ یاد رکھے۔" وہ ذرا اخفا ہوئیں "میں نے اسے ڈاکٹر صوفیہ اسلام کے پاس بھیجا تھا۔

"اسے تم سے بہت محبت تھی۔ یہ رو دینے والا تھا کہ میں اسے بتاؤں کہ وہ بے فکری سے اپنی کزن سے شادی کرے۔۔۔ مگر ظاہر ہے مجھے وہ بولنا تھا جو کیس ہسٹری کہہ رہی تھی اور میرا جواب انکار تھا کہ وہ کبھی اپنی کزن سے شادی نہ کرے۔ مگر وہ بہت پیار کرتا تھا تم سے۔۔۔ میں شاک میں ہوں مسز مامون کہ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے تم سے شادی کی۔ محبت کو اہمیت دی۔ وہ جانتا تھا کہ۔۔۔ تم سے شادی کی صورت میں وہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔ مگر اس نے سب بھلا کر تم ہی شادی کی مائی گاڈ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں 'اب افلاطونی عشق نہیں ہوتا مگر ہوتا ہے۔ دیکھو ناں تم اور وہ۔۔۔"

وہ بہت خوش تھیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ مامون آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟" اسے اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

"مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" ایک جواب ایک پچھتاوا۔

ڈاکٹر رئیسہ کی بوڑھی آنکھوں میں رشک تھا۔

اور کبھی انسان مرجاتا ہے مگر نہ اعلان ہوتا ہے نہ دفنایا جاتا ہے سرد خانے میں منجمد لاش کی طرح۔۔۔ درمیان میں لٹکا۔

"اور مجھے یاد ہے۔۔۔ وہ اپنی کزن کے حوالے سے اور۔"

"ڈاکٹر رئیسہ!" اس نے اتنی سختی سے جبڑے بھینچے کہ رگیں ابھر آئیں۔ "میں ان کی وہ کزن نہیں ہوں جس سے وہ شادی کرنا چاہتے تھے۔" اس نے دھماکہ سا کیا۔

الجھے دھاگے کا ایک سرا۔۔۔ مگر اسے ساری ڈور سلجھانی تھی۔ اس نے صوفیہ اسلام سے ملنا تھا۔



وہ آٹھ سال سال پہلے کے ایسے ہی مارچ کی بہار کے ہرے بھرے خوشبودار دن تھے۔ جب سارے گھر کے لوگ موسم کے جوبن سے نظریں چرائے اپنی اپنی سوچوں کے اژدحام میں گم تھے۔ خود میں مگن 'خاموش اور اگر کہیں کلام تھا بھی تو مبہم دھیما' ادھورا۔۔۔ سوچوں کی اکھاڑ پچھاڑ کا اتنا شور تھا کہ ایک دوسرے سے مخاطب ہونا بھی گویا سب بھول گئے تھے۔

عظیم خان ڈاکٹر کی ہدایت موجب واک کے لیے جاتے تو واپسی کا راستہ بھول جاتے۔ رابعہ خاتون انتظار کی کوفت سہتیں اور بڑبڑاتیں وہ عدینہ کو ساتھ لگائے سرگوشیاں کرتیں۔ پریقین لہجے میں تسلیاں دیتیں اور عدینہ وہ اپنے بناؤ سنگھار کو فراموش کیے گھنٹوں بالوں کی لٹوں کو انگلیوں پر بل دیتی رہتی۔ خفا چہرہ۔

"میری جانب سے ہاں ہے راحیلہ امی۔۔۔ مگر پلیز مجھے آنے دیں۔" بشائر نے دنوں کی سوچ و بچار کے بعد ایک روز کہہ دیا اور اس نے محسوس کیا "ہاں" کہنے کے پل تک کی ساری مشکلیں تھیں۔ ہاں کہنے سے گویا رکی سانس بحال ہو گئی تھی۔ مگر دل۔۔۔ یوں لگتا جیسے دل بجھ گیا ہو۔ ایک سناٹے کی کیفیت۔۔۔

اور ان سب سے الگ ادھر مامون تھا۔ بشائر نے دیکھا۔ وہ بہت چپ چپ رہنے لگا تھا اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ راتوں کو ٹہل ٹہل کر سگریٹ کے کش لیتا' لیٹ جاتا' بیٹھ جاتا۔ دھوئیں کے مرغولے میں چہرہ دھندلا دکھائی دیتا مگر اتنا اندازہ ضرور ہوتا' دھند کے پار گمبھیر تا تھی۔ پریشانی الجھن بے یقینی ہاں اور نہیں کی تکرار۔

اس کی نگاہیں۔۔۔ عدینہ کے چہرے پر ٹک جاتیں۔ پلکیں جھپکائے بنا اسے دیکھتا۔ یہاں تک کہ وہ آنکھیں جل اٹھتیں تو چونک جاتا۔ وہ رابعہ خاتون کے چہرے پر بھی کچھ کھوجتا اور یہی نہیں۔ بشائر نے اپنے شکے سے گمان کو مشاہدے کے بعد یقین میں ڈھالا کہ اکثر مامون کی نظریں اس کا پیچھا کرتیں۔ جانچتی' تولتی رکھتی اکثر اس کے قدموں سے لپٹ جاتیں پتا نہیں کیوں؟

مامون کی شیو بڑھ گئی تھی۔ شب بیداری نے آنکھوں کی سرخی کو نمایاں کر دیا تھا۔ اس عالم میں بشائر کا دل پارہ بن جاتا۔ کسی پل نہ ٹھہرتا۔

"ایک حتمی فیصلے کے بعد یہ بے ایمانی ہے بشائر سجاد" اس نے خود کو ڈپٹا "تم اللہ کے حکم کی نافرمانی کر رہی ہو کہ قطعی نامحرم شخص کو بے خودی کے عالم میں تکنا۔۔۔ یہ گناہ ہے بشائر! وہ تمہیں پسند آ گیا اجازت تھی۔ مگر وہ تمہیں مل نہیں سکتا۔ وہ کسی اور کا ہے اور تم کسی اور کی ہونے جا رہی ہو۔۔۔ تو اب یہ وارفتگی۔"

دل سیدھی شرافت سے مان ہی نہ رہا تھا سو اس نے اسے گناہ و ثواب کے ذریعے عقل دی۔

وہ اب یہاں سے جانے کو بے چین تھی۔ اسے لاہور میں اپنا گھر یاد آنے لگا تھا۔ اسے امی ابو بہن بھائیوں کی یادیں ہر پل ستا رہی تھی اور اسے بس اب جانا تھا۔

تب ہی آسمان میں دو سیارے ٹکرائے جیسے وہ بے یقینی کے سمندر میں غرق ہو گئی۔

"کک۔۔۔ کیسے۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ آپ نے غلط سنا ہو گا راحیلہ امی؟" وہ خوش نہیں ہوئی۔ اس پر شادی مرگ بھی طاری نہ ہوئی شدید حیرانی نے چہرے کے نقوش کو بگاڑ دیا۔

"وہ۔۔۔ تو۔۔۔ وہ تو عدینہ۔ سب جانتے ہیں۔"

"ارے بے وقوف!" راحیلہ امی نے اس کی نادانی پر سر پیٹا۔ "اس نے صاف کہا کہ وہ تو بس دوست ہے۔ بچپن سے ساتھ ہے۔ بہنوں جیسی ہے بھئی۔"

"مامون نے یہ کہا۔۔۔؟" وہ بھونچکی رہ گئی۔

"راحیلہ امی! آپ مامون سے کبھی ملی نہیں۔ آپ نے عدینہ کو نہیں دیکھا بلکہ آپ نے ان دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔" اس نے پراسرار لہجے میں جتانا شروع کیا۔ میں خود اتنے عرصے سے سب دیکھ رہی ہوں۔ وہ تو جیسے ایک دوسرے کا سایہ ہیں اور آپ کہتی۔۔۔"

"احمق لڑکی!" راحیلہ امی نے دانت پیس کر اس کی عقل پر ماتم کیا۔ "وہ ساتھ رہے ہیں۔ عدینہ اس کی عادت ہو گی۔"

راحیلہ بھنا گئیں۔ "تم صاف بات کرو تمہیں اعتراض ہے تو بولو' میں جو اتنا فورس کر رہی ہوں تو تمہارے ابو کی وجہ سے۔ وہ مامون سے مل چکے ہیں اسے جانتے ہیں اور بہت پسند کرتے ہیں اور اس رشتے کی بابت جان کر وہ شان کو تو بھول ہی گئے۔ ہم عنقریب لاہور آ رہے ہیں اور کیا تم اسے ناپسند کرتی ہو؟ میں تو صرف کمپیوٹر پر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ویری ہینڈسم مین۔۔۔ سامنے سے کیسا لگتا ہو گا؟"

"ہاں سامنے سے۔" بشائر نے ہار مانی۔



"عدینہ کا کیا پوچھنا۔۔۔" بشائر شمسہ بیگم کے پاس آئی تھی وہ آٹھ سالوں بعد پہلی بار دہرا رہی تھیں۔ "اس نے کمرہ کی ہر چیز اٹھا کر پھینک دی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے تر تھا۔ بکھرے بال اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ وہ نجانے کس قدر رو چکی تھی اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جو رابعہ خاتون کہہ رہی ہیں۔

"آپ نے تو کہا تھا آپ دادا جان کو منا لیں گی ہر صورت۔۔۔ اور آپ کہتی ہیں 'مامون بشائر سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔۔۔ یہ کون! بشائر۔۔۔ who is" وہ چیخ رہی تھی۔

"وہ تو کہیں کینیڈا جا رہی تھی ناں۔ آپ اس سے کہیں' وہ کبھی نہ مانے۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ اسی نے مامون کو پھانسا ہو گا۔۔۔ اور شمسہ آنٹی' دادو کہتی ہیں۔ دادا نے کہا۔ مامون نے صحیح فیصلہ کیا۔ آپ بولیں'

میرے اپنے دادا۔۔۔"

"بیٹا مرد کے دل کا حال۔۔۔" رابعہ خاتون کیا بولتیں وہ کیا بتاتیں کیا چھپاتیں۔"

"میں کیسے رہ سکتی ہوں۔۔۔ مامون۔۔۔ میں نے اس کے علاوہ کچھ سوچا ہی نہیں۔ مجھے پتا ہی نہیں کہ دنیا میں اور بھی مرد ہیں" اِس کا رونا بہت تکلیف دہ تھا۔

"وہ دنیا کا آخری مرد نہیں تھا۔" میں نے کہا تھا۔

"کیا پہلا' آخری۔ وہ میری زندگی کا واحد تھا شمسہ آنٹی!" وہ بے چارگی کی انتہا پر تھی۔

"بیٹا! یہ ایک حقیقت ہے کہ تم اور ہم اب کچھ نہیں۔۔۔ وہ بشائر کے۔"

"نہیں۔۔۔" وہ چلائی "کون بشائر دادو۔۔۔ ہم ہی تھے ہم چار صرف ہم چار۔۔۔ جیسے اسکوائر کے چار کونے۔۔۔ آپ ہی نے تو مجھے اسکوائر کی ڈیفی نیشن یاد کروائی تھی۔" اس نے رٹا سنا دیا تیزی سے۔۔۔

اس کی لبالب بھری آنکھیں اور رو رو کر بیٹھا گلا۔۔۔ وہ اتنی قابل رحم لگ رہی تھی کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی ہو۔

"میں جاؤں گی مامون کے پاس۔" وہ سختی سے آنکھیں رگڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں پوچھوں گی ان سے کہ۔۔۔"

"ناں بیٹی!" رابعہ خاتون نے اسے روکا اور شانوں سے تھام کر اپنے ساتھ بٹھایا۔ جتنا انجان بن کر وہ جا رہا ہے۔ تم اتنی ہی اجنبیت سے اسے رخصت کر دو۔ یاد رکھو' جان اور آن میں سے ایک چیز بچانی ہو تو آن بچانا۔۔۔ اپنے پندار کی حفاظت۔۔۔"

"مجھے گہرائی کی۔۔۔ بلندی کی باتیں نہ سنائیں۔ میں منہ کے بل پستی میں گری ہوں اس نے مجھے کیوں چھوڑا دادو؟" وہ معصومیت سے چہرہ اٹھا کر پوچھ رہی تھی۔ میں نے اپنے آنسو چھپا لیے۔" شمسہ بیگم کی آنکھوں میں آج بھی آٹھ سال کا دکھ بول رہا تھا۔

"آپ آٹھ سال بعد اس سوال کو لے کر آئی ہیں اور ہم آٹھ سال سے سوچ رہے ہیں کہ اس نے عدینہ کو کیوں چھوڑا۔" بخت اتنی لمبی نشست میں پہلی بار بولا۔ وہ بہت سنجیدگی سے بس اسے سن رہا تھا۔

"اور بشائر سے شادی کیوں کی؟" بشائر نے سوال کے جواب میں ٹوٹے لہجے میں سوال جڑ دیا۔

شمسہ بیگم اور بخت نے نظریں چرائی تھیں۔

(میں جواب ڈھونڈ لائی ہوں۔۔۔ بخت)

بشائر سجاد نے پہلی نگاہ سے دو دن کے وقفے تک مامون سجاد کو عجب سرخوشی کے عالم میں استحقاق سے سوچا تھا۔ تیسرے دن اس نے جان لیا کہ وہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی اور کا ہے۔ تب وہ وقت اس نے ملال میں گھر کے کنی کتراتے خود کو سمجھاتے گزارا۔

اور رشتہ طے ہونے کے بعد سے شادی کے دن تک وہ بے یقینی کے عالم میں قصداً" ہی مامون کے چہرے کو کھوج نہیں پاتی تھی۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ اس کے دل میں اس شخص کی طلب اتنی شدید تھی کہ اس نے اسے بنا کسی مقابلے کے پالیا۔ وہ شخص اس کا ہو چکا تھا۔

اور گلاب کی خوشبو سے بوجھل خوابوں جیسی وہ شام۔۔۔ وہ اپنی تمام تر وجاہت اور ساحر آنکھوں کے ساتھ اس کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کے دل کی اتھل پتھل۔۔۔ دل حلق میں اٹک گیا جب تصاویر بنوانے کے شائق گھس گھس کر ان کے دائیں بائیں بیٹھ رہے تھے اور ایک وقت ایسا آیا جب ان کے پہلوؤں میں کوئی درز نہ رہی۔ اس کی قمیص کا گلا گہرا تھا اور نیچے ڈھلک رہا تھا سب کو لگا اس نے اپنا حنائی چوڑیوں انگوٹھیوں سے بھرا ہاتھ گریبان کو سنبھالنے کے لیے سینے پر رکھا ہے مگر مشکل سے وہ واقف تھی دل کی بے ترتیب دھڑکن۔۔۔

اور ارمانوں بھری رات۔۔۔

اور نئے آغاز کی روشن صبح۔۔۔ اسے اب یاد آتا تھا۔

جیسے گھڑی کی سوئیاں جذبات کے بغیر آگے بڑھتی ہیں۔ زندگی کے وہ یادگار لمحے بس آئے اور گزر گئے تھے۔

کوئی اظہار نہیں تھا۔ بس "آغاز" تھا۔

ہاتھوں میں ہاتھ تو تھا مگر "ساتھ" نہیں تھا۔

گفتگو تو تھی مگر "باتیں" نہیں تھیں۔

اور وہ شادی مرگ کے جس عالم میں تھی۔ اس نے کبھی جذبات سے عاری مشینی رویے پر دھیان ہی نہ دیا۔ وہ کینیرڈ کی پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی۔ مجبور۔ مگر تھی تو عورت ناں۔۔۔ جس مرد پر پہلی نگاہ پڑتے ہی اسے خیال آیا تھا۔ کاش وہ اس کا ہو کاش وہ اس کی ہو جائے۔ اور اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

آسمان کی بلندیوں سے کھیت کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے سبز رنگ کا قالین بچھا ہے اسی کھیت کو زمین پر جا کر قریب سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کتنا فاصلہ موجود ہے۔

اور وہ مامون ابصار کی سنگت میں ہواؤں ہی میں تو اڑ رہی تھی۔ اس کے پیر زمین پر کب تھے۔ جو فاصلہ ماپ سکتے۔

وہ اپنے بیڈ روم کو صبح سویرے تازہ پھولوں سے سجاتی۔ وہ خود خوشبوؤں میں بسی رہتی خوشبو دار موم بتیوں کی لرزاں روشنی میں شام کا استقبال کرتی۔

اس نے بہت بعد میں اپنے اور مامون کے رشتے کے بارے میں جب سوچا تو دھیان آیا۔

اس کے بے ساختہ بے حد التفات پر اس نے کبھی سرد مہری نہیں دکھائی تھی۔ مگر پہل ہمیشہ اس کی جانب سے تھی۔ مامون ابصار نے محبت کے جواب میں محبت ہی دی تھی (ناو فقینکہ)۔

مامون نے کبھی اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا۔ وہ اسے بغور سنتا تھا۔ اس کی رائے کو بے حد اہمیت دیتا تھا۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ اسے گھمانے لے گیا۔ ہنی مون کے لیے۔ وہ اسے اندھا دھند شاپنگ کرواتا۔ اس کی باتوں پر ہنس دیتا۔ اسے سنتا رہتا۔ مگر کبھی کبھی بشائر کو لگتا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مسلسل حزن آ رکا ہے۔ اس نے کبھی پوچھنا چاہا تو اس نے بہلا دیا۔

"اس کا وہم ہے وہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔" وہ کہتا بشائر چپ سادھ لیتی وہ نہ کہتی کہ وہ ان آنکھوں کے ہر رنگ کو پہچان لیتی ہے ان آنکھوں ہی نے تو۔۔۔

اور عون کے آنے کی خبر۔۔۔ وہ جھوم اٹھی۔ اس پہلو پر تو دھیان ہی نہ گیا۔ اس کا اور مامون کا بچہ۔۔۔ کہاں ہے بچہ؟ وہ قد آدم آئینے میں خود کو کھوجتی اور ایسے میں مامون کا رویہ۔۔۔ اف وہ اسے یوں ٹریٹ کرتا جیسے کسی نے کانچ کی نازک گڑیا اپنی ہتھیلی پر کھڑی کر رکھی ہو۔ بشائر حیران ہوتی۔ وہ خوش تو نظر آیا تھا۔ مگر وہ اس کی طرح حق دق نہ رہ گیا تھا۔ وہ جیسے منتظر تھا۔ اس کا کھانا پینا سونا جاگنا آرام۔۔۔ وہ ان دنوں اپنے بزنس کو بڑھا رہا تھا۔ کامیابیاں' دن رات کی محنت۔ سفر۔۔۔ مگر ان سب کے درمیان بشائر کے لیے وقت اور توجہ۔ وہ اس کی ہر حرکت پر گویا نگاہ رکھتا اور بشائر اس درجہ پرواہ پر خوشی سے پاگل۔۔۔ کبھی کبھی وہ مامون کے جنون پر حیران ہوتی بلکہ گھبرا جاتی۔

کبھی اسے لگتا۔ اتنے وقت' توجہ اور گفتگو کے باوجود مامون وہ کہہ نہیں پاتا جو کہنا چاہتا ہے۔ وہ مضطرب لگتا۔ گہری سوچ میں غرق۔۔۔

"آپ خالہ دادی کے گھر نہ جا سکنے سے پریشان ہیں ناں؟"

"ایسا نہیں ہے۔" ماموں نے انکار کیا۔

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پہلے عظیم خان نے اور بعد میں رابعہ خاتون نے مامون کو منع کیا تھا وہ اب۔۔۔ وہ اب ان کے گھر نہ آیا کرے۔۔۔ یا کم از کم عدینہ کی موجودگی میں تو۔۔۔ اسے شمسہ بیگم نے ایک ملاقات میں بتایا۔

اور شمسہ بیگم اور بخت۔۔۔

"تمہیں ہر طرح کی آزادی ہے بشائر۔۔۔ مگر یہ حکم نہیں ہے تم۔۔۔ بخت وغیرہ سے نہ ملو۔۔۔ میرا مطلب ہے اس طرف کم جاؤ تو۔۔۔ دراصل بخت عجب لاپرواہ سا' نکما خیالی باتیں کرتا لڑکا ہے نان پریکٹیکل۔۔۔ میں منع نہیں کر رہا تمہیں اور کچھ اس حال میں۔۔۔ تم جانتی تو ہو کہ میں تمہارے اور بے بی کے حوالے سے۔۔۔"

بشائر بخت کے حق میں سو دلائل اور ہزار تعریفوں

کے پل باندھ سکتی تھی۔ مگر مامون نے پہلی بار۔۔۔ کسی بات پر ناگواری یا ہدایت دی تھی اور بے بی کے حوالے سے اس کا اتاولا پن۔۔۔ وہ قطعاً "برا مانے بغیر مان گئی اور پھر بعد میں۔۔۔

وہ اپنے بے پناہ مصروف شیڈول میں سے اس کے ہر اپائنٹمنٹ کے لیے وقت نکالتا۔ وہ ہر الٹرا ساؤنڈ میں سونولوجسٹ کے کمرے میں اس کے ساتھ اندر جاتا۔ کرید کرید کر پوچھتا۔ نجانے کون کون سے ٹیسٹ اور ڈاکٹرز کی ایڈوائز اور بشائر اتنی محبت پر سرشار رہتی۔

اور وہ جان چکی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہوگا لیکن جب وہ اس کے ہاتھ آیا۔ اس کی خوشی کا عالم۔ وہ ہو بہو مامون ابصار تھا اس نے بشائر سے کوئی عکس نہ لیا تھا۔ خوشی، محبت۔ کاملیت۔ زندگی مکمل ہو گئی۔ ہیپی فیملی۔

وہ اسے چھو چھو کر دیکھتا عمیق نگاہی سے۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ حفاظتی ٹیکے۔ وٹامنز وہ بشائر کی خوراک کا خیال رکھتا اسے خود اپنی زیر نگرانی دودھ کے گلاس پلاتا تاکہ بچہ ماں ہی کا دودھ پیے اور خوراک کی کمی کا شکار نہ ہو۔

اور بشائر مامون ابصار ایک بار پھر حیران رہ گئی۔ جب اتنی احتیاط کے ساتھ پرورش پاتا بچہ چار ماہ بعد بجائے سر اور نظر ٹھہرنے کے اس کا سر ڈھلک گیا۔ اس کی نظریں پلٹ رہی تھیں۔ اس کے منہ سے مسلسل رال سی بہنے لگی تھی۔

"کم عقل عورت! تمہیں نظر کیوں نہ آیا؟" وہ اتنی زور سے چیخا کہ درودیوار ہل گئے اور وہ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ ششدر صوفے پر گر گئی۔

"میں۔۔۔ مجھے نہیں پتا چل سکا۔ وہ منہ سے دودھ تو نکالتا تھا۔" وہ ناسمجھی کے عالم میں منمنائی۔

"تمہیں دودھ اور رال کا پتا نہیں؟" اس کی آواز میں توپ کے گولوں جیسی گھن گرج تھی۔ وہ ہمیشہ بچے کو یوں چھوتا تھا جیسے نازک شاخ پر لگی نودمیدہ کلی۔۔۔ مگر اس سے وہ اسے یوں دائیں بائیں الٹ پلٹ رہا تھا جیسے۔۔۔ جیسے کوئی بے جان فالتو چیز ٹھیک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ فالٹ ڈھونڈنے کی عجلت اور۔۔۔ اور پھر بعض سر پھرے ناکام ہو کر ایک ہاتھ مارتے ہیں اور خراب شے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین بوس ہو جاتی ہے۔ بشائر نے فوری خیال کے تحت اٹھ کر بچے کو سینے سے لگا لیا۔ خود میں بھینچ لیا۔

وہ ہراساں نگاہوں سے ہانپتے اور نجانے کیا کیا بولتے مامون ابصار کو تک رہی تھی۔ وہ نجانے کن جارحانہ عزائم سے اس کی جانب آیا۔ وہ چیل کی سی تیزی سے بچے کو خود میں سموئے بیڈ پر اوندھی ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے میچ رکھی تھیں۔ مامون ابصار نے ایک زوردار ٹھوکر بیڈ پر ماری اس نے لیمپ اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر مار دیا کرچیاں چھناک چھن۔۔۔ آہ۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔

بشائر نے تسلی کر کے کہ وہ جا چکا ہے اپنی سہمی آنکھیں کھولیں اس نے اپنے روتے بچے کو بغور دیکھا۔ بچے بیمار ہوتے ہی ہیں۔ آخر ہو گیا تھا؟ وہ بچے کے کپڑے بدلوانے لگی۔ اسے پتا نہیں تھا وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کے کپڑے ملگجے تھے۔ ایک یاد، ایک خیال، ایک وہم۔۔۔ ہاں وہ الٹی سیدھی چپل اڑسے باہر کو لپکی۔ اسے خود ہی ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔

وہ پہلی بار بچے کے ہمراہ اکیلی باہر نکلی تھی اور واپسی کے تنہا سفر نے اسے یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ وہ اب آئندہ ہمیشہ۔۔۔ ایسے ہی اکیلے؟

اس کے بچے کے ساتھ ایک عمل کا آغاز ہو رہا تھا ایب نارملٹی کا آغاز۔ اس نے نظریں پھیریں، اس کا سر بے قابو ہوا۔ اس کے ہاتھ پیروں نے کبھی توانائی نہ پکڑی۔ کیا کیوں کب کیسے۔۔۔؟ بشائر کو پھر ان سات سالوں میں یہ سب سوچنے کی مہلت نہ ملی۔

عون کے لیے باپ کی محبت ختم ہو چکی تھی۔

عون کے لیے ماں کی محبت شروع ہوئی تھی۔ جو کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتی۔

ماں کی محبت، زم زم کا چشمہ ہوتی ہے ایک بار جاری ہو گیا تو بس ہو گیا۔

فقط سات چکروں میں زمین کا دل پگھل جاتا ہے۔ دراصل زمین بھانپ لیتی ہے، ماں ستر چکر لگا کر بھی نہ ناامید ہو گی اور نہ تھکاوٹ کی شکن اس کے ماتھے پر سجے گی۔

اور شروع کے چار سال بشائر نے اس کی صحت یابی کے خواب دیکھتے ہوئے تگ و دو کی اور آگے تین سال اس نے تسلیم کر لیا تھا۔

بچہ میاں بیوی کے رشتے کو مضبوط ترین کرنے کی زنجیر ہوتا ہے مگر شاید عون زنجیر تو تھا۔۔۔ مگر زنگ آلود

—

عون ان دونوں کی خوشی تھا جسے انہوں نے خوب جی بھر کے منایا تھا۔

عون ان دونوں کا دکھ تھا جسے بشائر نے اکیلے سہا تھا۔ مامون نے ہاتھ کھینچ لیے تھے ناں۔

عون کوڑھ زدہ مریض کی طرح گھر کے کونے والے کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور مامون بھول گیا کہ اس گھر میں ایک تیسرا فرد بھی رہائش پذیر ہے۔

وہ اتنا کٹھور، سنگ دل، سرد مہر آنکھوں والا بن گیا تھا کہ وہ اوپر اوپر سے مضبوط دکھائی دیتی مگر دل میں لرزتی۔ ایک جانب عون دن بدن مزید تنزلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ زیادہ ڈیمانڈنگ۔ دوسری جانب مامون کا بے لچک رویہ۔۔۔

وہ چھ سال سے دوسری بار ماں بننے کے لیے تڑپ رہی تھی مگر۔۔۔ مامون۔۔۔

شروع کی حیرانگی کے بعد اس نے جانا، عون مامون کے لیے باعث شرمندگی تھا۔ شاید باعث اذیت۔ وہ اس کی بیماری کا سن کر اپنے آپ میں مگن رہتا۔ اس کے جنون کے دنوں کی چیخ و پکار سے بچنے کے لیے اس نے نیچے جا کر سونا شروع کر دیا۔ وہ گھر میں ڈاکٹرز کی آمد و رفت دیکھتا مگر کبھی پلٹ کر نہ پوچھا "کیا ہوا ہے سب ٹھیک ہے نا" اور شروع کے کچھ سالوں کے بعد بشائر نے ذکر کرنا ہی کم کر دیا تھا یعنی کچھ بھی بتانا۔

وہ اپنا اور مامون کا رشتہ تو نجانے کب سے فراموش کر چکی تھی۔ ایک چھت کے نیچے رہتے دو اجنبی۔۔۔ دنوں گزر جاتے وہ ایک دوسرے کو مخاطب بھی نہ کر پاتے۔ ان دونوں کا یہ فاصلہ۔۔۔ گھر کے ملازمین کے سامنے تھا۔ ہاں وہ باہر کی دنیا کے سامنے بہت اچھا بن کر پیش ہوتے تھے ایک آئیڈیل جوڑا۔۔۔

اور پھر یہ خلا اس وقت بے پناہ بڑھ گیا جب عظیم خان کے انتقال کے بعد مامون کا ایک بار پھر کھلم کھلا رابعہ خاتون کی خبر گیری کے لیے جانا شروع ہوا۔ مامون نواسا تھا اور بوڑھی نانی کی فکر کرنا اس کا ہر لحاظ سے فرض تھا رابعہ خاتون جو بہت بوڑھی، کمزور اور بیمار ہو چکی تھیں۔

اور یہیں سے عدینہ اور مامون کا رشتہ دوبارہ استوار ہوا۔

بشائر کے اپنے والدین کینیڈا شفٹ ہو چکے تھے۔ اس کے لیے رابعہ خاتون ماں کی جگہ تھیں۔ مگر عدینہ، رابعہ خاتون کو سناتے ہوئے بہت اونچی آواز میں اسے بتا چکی تھی کہ وہ یہاں نہ آئے۔۔۔ رابعہ خاتون اس کے رشتے کے لیے بے پناہ فکر مند تھیں۔ مگر ادھر ایک ناں تھی مسلسل۔ وہ اپنے شوق کے مطابق ایک چھوٹی سی بوتیک چلاتی تھی۔

مامون نے ہر حوالے سے اس کی مدد کا بیڑا اٹھا لیا۔ وہ اسے میڈیا کے حوالے سے لانچ کر رہا تھا۔ اس کے بنائے ملبوسات معروف اینکرز استعمال کر رہی تھیں۔ اس سب کے پیچھے اہم ہاتھ مامون کا تھا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قربت، دوستی یا؟

کیا مامون پچھتا رہا ہے؟ کیا وہ مداوا کرے گا۔ عدینہ کا مسلسل تنہا ہونا اس بات کا غماز تھا کہ وہ آج بھی مامون سے۔۔۔ بلکہ مامون ہی سے کتنی محبت کرتی تھی۔

بشائر کو سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک روشن حقیقت، وہ خود گواہ تھی۔

اور دوسری روشن حقیقت تو یہ بھی تھی کہ وہ بھی مامون سے اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اتنی ہی محبت کرتی تھی۔ پہلی نگاہ کا پہلا بے بس احساس آج بھی زندہ تھا۔

پہلی نگاہ کی خوشی۔ پلٹ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش۔۔۔ آج بھی مامون کے چہرے کو نظر بھر کے دیکھنا اس کے دل کو خوشی اور فخر سے بھر دیتا تھا۔

لیکن اب اسے کچھ عرصے سے اپنی محبت کی زندگی پر شک ہونے لگا تھا۔ وینٹی لیٹر پر رکھی محبت۔ خاتمے کے اعلان کی منتظر۔۔۔۔ لیکن حتمی اعلان سے پہلے ماتم تو شروع نہیں کیا جاسکتا ناں۔

مامون کیا کر رہا تھا۔ کیا کرنے والا تھا۔ کیا وہ۔۔۔۔ اُو تو عظیم خان کے انتقال پر عدینہ، مامون کو دیکھ کر جس سرعت سے اٹھی اور اس کے ساتھ لگ کر جس بے قراری سے روئی۔ عدینہ کے رونے میں بے اختیاری تھی۔ اردگرد سے بے گانہ۔۔۔۔

کیا وہ صرف عظیم خان کی موت کو رو رہی تھی؟ بشائر نے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

اس نے مامون کو بھی دیکھا۔ ضبط گریہ نے ان ساحر آنکھوں کے فسوں کو بڑھا دیا تھا۔ وہ پورے قد سے کھڑا عدینہ کے سر کو تھپتھپا رہا تھا۔ اس کا خود پر کنٹرول تھا۔ وہ اپنے اندر کو چھپا لینے کے فن میں طاق تھا۔ بشائر کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔

رابعہ خاتون کی عدت کے دن۔۔۔۔ بشائر کوشش کرتی وہ ہر روز چکر لگا سکے۔ مگر عون کے باعث یہ ممکن نہ تھا۔ وقفے بھی آتے۔ رابعہ خاتون عظیم خان کو روتیں یا پھر عدینہ کی فکریں بتاتیں۔

ان دونوں کا آمنا سامنا کم ہی ہوتا۔ عدینہ کے چہرے پر نفرت کا سیاہ رنگ اتنا ہولناک ہوتا کہ وہ نظر ملانے سے کترایا کرتی۔ عدینہ اس کا آنا سخت ناپسند کرتی۔ وہ اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ بشائر کے مخاطب کرنے پر اس نے اتنی تلخ روئی سے دھمکایا کہ وہ پھر دوبارہ ہمت ہی نہ کر سکی۔

"میں دادو کی مجبوری میں تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔ میرا مزید امتحان مت لو اور کوشش کرو کہ بات چیت تو دور۔۔۔۔ میں تمہاری شکل بھی نہ دیکھوں۔ بچپن میں مجھے سیاہ رنگ کے ایک کتے نے کاٹ لیا تھا۔ اس دن سے میں کتوں سے خوف کھاتی ہوں اور شدید نفرت کرتی ہوں۔ لیکن اس سے سوگنا زیادہ تم سے۔۔۔۔"

نفرت کے زہر سے بوجھل جملوں کی بوچھاڑ نے بشائر کو نیم جان کر دیا۔

وہ بشائر کی آمد کی خبر پاتے ہی ادھر ادھر ہو جاتی تھی۔ سامنا ہوتا تو نفرت سے پیر پٹختی، شعلہ بار نگاہ ڈال کے ہٹ جاتی۔ عدت کے بعد بھی رابعہ خاتون سے ملنے کے لیے بشائر کا جانا کم نہ ہوا۔ ہاں وقفے بڑھ گئے۔ مگر پھر اس نے دیکھا وہ گھر میں ہوتی نہیں تھی۔ شاید اپنی چھوٹی سی بوتیک میں۔

لیکن جلد ہی اسے پتا چل گیا۔ وہ کہاں ہوتی ہے۔ اسے کچھ دوستوں نے بتایا۔ مامون اور عدینہ۔۔۔۔ اسے ڈرائیور نے بتایا۔ کچھ بیگمات نے الرٹ رہنے کا مشورہ دیا۔

"وہ بھلے سے کزن ہے۔ مامون اس کی ہیلپ کر رہے ہیں، اچھا کام کرتی ہے وہ۔۔۔۔ مگر حد کے اندر۔ مجھے تو کل فاروق صاحب نے بتایا کہ وہ اکثر ساتھ ہوتے ہیں بلکہ ایک بزنس لنچ میں بھی اکٹھے تھے۔" مسز فاروق نے آنکھیں نچا نچا کر بتایا۔

"فیشن ویک میں بھی وہ آگے کی چیئرز پر تھی۔ اب وہ تو اتنی فیمس نہیں ہے۔ آگے کی جگہ مامون ہی کی وجہ سے ملی ہوگی۔ ٹیکسٹائل بزنس میں بڑا نام ہے۔" مسز بالٹی والا نے ہاتھ ہلا ہلا کر کہا۔

وہ مسکرا مسکرا کر صفائی دیتی رہی۔

اسے بخت نے الرٹ کیا۔

"ہم نے آس کا دامن نہیں چھوڑا۔ آپ طنابیں ڈھیلی نہ کرو بیجے گا۔"

وہ ہنس کر ٹال گئی۔ لیکن پھر اس نے خود دیکھا۔ وہ دم سادھے دیکھتی رہ گئی۔

یہ تو وہی آٹھ سال پہلے کے مناظر تھے۔ وہی بے خبری، وہی اردگرد سے ناآشنائی۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ مسلسل بولتی عدینہ اور ہمہ تن گوش مامون۔

وہی منظر۔۔۔۔ ہاں مامون اب بہت توجہ سے اسے سنتا تھا اور نئی بات تھی کہ وہ اب عدینہ کے چہرے کو بہت غور سے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا تھا۔ کہیں کھو جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر۔۔۔۔ چہرے پر۔۔۔۔ چہرے پر۔۔۔۔ حسرت۔ ہاں حسرت وملال کے لفظ کندہ ہوتے۔

وہ کیا شکوک و شبہات پالتی۔۔۔ وہ عون میں مگن تھی۔ وہ جیسے جیسے بڑھ رہا تھا اس کے مسائل میں اضافہ ہو رہا تھا۔



ان کے رشتے میں اب کوئی رابطہ نہیں بچا تھا۔

اور ایسے میں کوئی حیرانی نہ ہوتی جو مامون ابصار کوئی قدم اٹھا لیتا اور کچھ سالوں سے "کوئی قدم" کا خدشہ بہت مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ عدینہ اور مامون کا ازسر نو جڑتا "رشتہ" اس بار اسے زیادہ مضبوط محسوس ہوا تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں یہاں تک کہ ملازمین کی گفتگو۔

"آپ عدینہ سے بہت زیادہ خوب صورت ہیں اور آپ بیوی بھی ہیں۔ آپ اتنی ڈھیلی کیوں ہیں اس معاملے میں۔" سفینہ نے اسے جتایا تھا۔

عون نے اس کے دل کو بہت چھوٹا کر دیا تھا۔

عون ہی نے اس کے دل کو بہت بڑا کر دیا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

مامون سے کہے گی۔ وہ اس کھیل کو ختم کرے۔ کیا وہ عدینہ کو اپنانا چاہتا ہے۔ کیا وہ اس سے۔۔۔ اچھا تو ٹھیک ہے کر لے۔

اور اس دن کی بات۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو، مجھے واقعی تم سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

ایک اطلاع۔۔۔ ایک اعلان۔۔۔ پچھتاوا۔۔۔ کیا، کیا نہیں تھا اس ایک جملے میں۔

اب کیا باقی رہ گیا تھا۔ ہاں اس کا دل جو آج بھی مامون کا اسیر تھا۔

ترستی زندگیاں۔۔۔ چار ترستی زندگیاں۔

وہ خود پر بشائر۔۔۔ مامون۔۔۔ عدینہ۔۔۔ اور بخت۔۔۔ ہاں بخت بھی۔ وہ انتظار کو اعزاز کی طرح نبھا رہا تھا۔ اسے کنارہ مل جاتا۔ وہ راستہ چن لیتا۔ اس میں کیا کمی تھی۔ کل کا خیالی باتیں کرتا نوجوان آج ملک کا نامی گرامی تجزیہ نگار تھا۔ اس کی رائے ایوان بالا کے در و بام کو ہلا دیا کرتی تھی۔ کیا کمی تھی اس میں۔

لیکن اتنی تلخ حقیقت پسندی کے بعد بھی اس کی سوئی وہیں آ کر رک جاتی۔ ایک جواب طلب سوال۔ پر اسرار سا۔ ناقابل فہم سا۔ مامون ابصار نے بشائر سے شادی کیوں کی؟

نہیں۔۔۔ یہ نہیں۔

مامون ابصار نے عدینہ سے شادی کیوں نہ کی؟

اور آج اسے اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔ جس نے اسے ششدر کر دیا تھا۔

بشائر سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی تم نتیجہ اخذ نہ کر سکی تھیں۔ کیا کہہ کر پکارا جائے۔ نادان، احمق، عقل کی اندھی، جسے سامنے پڑی حقیقت سے آشنائی نہ ہو سکی۔

"اور۔۔۔ اور بخت بھی۔۔۔ ہاہاہا۔" وہ زہر خند ہنسی ہنس دی۔

"دنیا کے قابل ترین آدمی بنتے ہو بخت! پاتال سے ڈھونڈ کر لاتے ہو بھید کے موتی اور یہ اتنی ذرا سی بات کو نہ پکڑ سکے۔"

وہ شمسہ بیگم اور بخت کے سامنے بول بول کے تھک چکی تھی۔

"کون سی بات؟" بخت دم سادھے اسے مسلسل سن رہا تھا۔

"ہے ایک بات۔" اس نے لہجہ پر اسرار سا بنایا اور صوفے سے پیر نیچے اتارے۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ۔۔۔ کیا مامون کو دوسری شادی کی اجازت دینے۔" بخت کے لہجے میں آنچ سی تھی۔۔۔ بے یقینی اور آنکھوں میں ایسا نہ کرنے کی التجا۔

وہ ایک دم اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں مامون کے پاس جا رہی ہوں اور میں اسے عدینہ سے شادی کرنے کا کہوں گی۔ نہ صرف اجازت دوں گی، بلکہ فورس کروں گی۔"

اس نے ڈرامائی وقفہ دیا۔ شمسہ بیگم پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اچھل پڑیں۔

"لیکن تم دیکھ لینا۔۔۔ وہ آج بھی عدینہ سے شادی پر راضی نہ ہوگا۔ وہ ایک خود غرض، موقع پرست خود پرست شخص تھا۔ ہے اور رہے گا۔ جو نفع و نقصان کو تولتا ہے۔ تماشا دیکھنے چلو گے، اگر یقین نہیں ہے تو۔"



وہ پیدل ہی بخت کے گھر سے نکل کر سڑک کے کنارے چلتی عظیم خان کے گھر تک پہنچی۔

کسی راہ گیر اجنبی کو بھی وہ شکست خوردگی کی مثال نظر آئی۔ گرد و پیش سے انجان، سوچوں کے اژدحام میں گھری، افسوس، ناکامی، ٹوٹا دل، بھرے نین۔

عظیم خان اور رابعہ خاتون کا گھر عجب سناٹوں میں گھرا تھا۔ ورنہ عظیم خان کے پرانے ریکارڈ اور رابعہ خاتون کی آوازیں، سب گئے وقتوں کا قصہ ہو گیا تھا۔

نارنجی رنگ کے شلوار قمیص میں عدینہ ننگے پیر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا برتن تھا۔ رنگ برنگے کٹے پھل۔۔۔ اس کے چہرے پر شادابی سی تھی۔

"عدینہ۔۔۔!" اس نے بے ساختہ پکارا۔

وہ چونک کر مڑی، بوکھلاہٹ میں کانٹا گرا اور ٹن ٹن کی آواز سے سیڑھیوں سے گرتا چلا گیا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے عدینہ۔۔۔!"

"لیکن میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس کا لہجہ زہر زہر تھا۔

"مت دیکھنا۔۔۔ مگر مجھے سن لینا۔" اس نے برا نہ مانا۔ عدینہ نے نفرت سے سر جھٹکا۔ وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"میں تمہیں سن بھی نہیں سکتی۔۔۔ کس گمان میں یہاں تک آئی ہو۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"میں اسی کی بات کروں گی جو ہمارے "درمیان" ہے۔" وہ تیزی سے سیڑھیوں تک آئی اور ہاتھ بڑھا کر ریلنگ پر رکھے عدینہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ عدینہ نے چونک کر اسے اور پھر اس کی جسارت کو دیکھا۔ وہ دل سے مسکرائی۔

"تم اسی طرح پیروں پہ بھی ہاتھ رکھ دو۔ تو تب بھی میں تمہاری کبھی نہ سنوں۔" اس کے جملے سے ٹپکتی نفرت اور انداز کا جارحانہ پن، بشائر کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔

"اونہہ!" عدینہ طنزیہ ہنکارا بھرتی آگے بڑھی۔

"میں سچ بتانے آئی ہوں عدینہ۔۔۔! مامون نے تمہیں کیوں چھوڑا؟ جتنا تم نے اس سوال کو تلاشا ہے۔ اتنا ہی میں نے بھی۔۔۔ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈ لائی ہوں عدینہ۔" اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔

عدینہ مڑی نہیں، مگر رک گئی۔

"تم آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کے ساتھ جی رہی ہو۔ زندگی دو صورتوں میں ہی آسان ہو سکتی ہے یا تو آپ مکمل سچ جانتے ہوں یا مکمل انجان ہوں۔ آدھا سچ تو تیر نیم کش کی طرح ہوتا ہے، جو نہ جینے دیتا ہے، نہ مرنے، ہم دونوں اب تک اسی حالت میں جی رہی تھیں۔ میں خالی جگہیں بھر کے آ رہی ہوں، تم بھی۔۔۔"

"مجھے لفظوں کے جال میں مت الجھاؤ۔" وہ غرائی تھی۔

"تم ہوتی کون ہو میری فکر پالنے والی، زخم دینے والے ہاتھوں نے مسیحائی کا فن کب سیکھا۔" وہ آگ لہجے میں بولی، اس کی آنکھوں سے بھی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

بشائر نے بے بسی سے ہونٹ کچلے۔ وہ کیسے اسے بتائے۔ وہ تو پل بھر کے لیے بھی رکنے کو آمادہ نہیں۔

"تم نے سچ کہا تھا عدینہ! قسم سے میں مامون پر پہلی نگاہ پڑتے ہی ہار گئی تھی۔ اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔"

اس نے اونچی آواز میں کہا۔ رابعہ خاتون آوازوں پر باہر آ گئی تھیں۔ وہ سن کھڑی رہ گئیں۔

"وف۔۔۔!" عدینہ کے سخت تاثرات سے سجے چہرے پر زلزلہ پیدا ہو گیا۔

"مجھے عون۔۔۔ عون کی قسم۔۔۔ میں۔۔۔ میں عون کی قسم کھاتی ہوں۔ میں سچ بولوں گی بس ایک بار مجھے سن لو۔"

عدینہ لرز کر رہ گئی۔ "عون کی قسم" وہ کسی ٹرانس کے عالم میں سیڑھیاں اتر آئی۔ تب ہی دونوں کی نگاہ رابعہ خاتون پر پڑی۔ بشائر کے بڑھنے سے پہلے اس نے آگے بڑھ کر رابعہ خاتون کو سہارا دیا اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی صوفے پر آگئی۔

"لیکن میں دوسرے ہی روز اس سے دست بردار ہو گئی' یہ جان کر وہ۔۔۔ تمہارا ہے۔"

عدینہ کی آنکھوں میں پھیلی بے یقینی دیکھ کر وہ دکھ سے کرلائی۔

"اتنی بے اعتباری سے نہ دیکھو' میں نے عون کی قسم کھائی ہے۔" عدینہ کے کھلتے لب آپس میں پیوست ہو گئے۔

"تمہاری مجھ سے نفرت جائز ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو ایسا ہی کرتی' ایسا ہی سوچتی۔"

وہ خاموش ہوئی' وہ الفاظ مجتمع کر رہی تھی۔

"میں تمہارے اور مامون کے رشتے میں کبھی نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ پتا نہیں اس نے مجھے ہی کیوں چنا۔۔۔ لیکن تم اتنا جان لو کہ میں نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی' مگر تم کبھی نہ ہوتیں' وہ تم سے کبھی بھی شادی نہ۔۔۔"

"بکواس کرتی ہو تم۔" عدینہ حلق کے بل چلائی۔ "تم ہوتی کون ہو میرے عیب گنوانے والی اور تم جانتی ہی کیا ہو مامون کے بارے میں۔۔۔ تم۔۔۔"

وہ غصے کی شدت سے ہکلانے لگی۔ اس کا سانس بے ربط تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے کو رک گئی تھی۔

"میں واقعی کوئی نہیں تھی۔ مگر اب میں ہوں اور میں واقعی مامون کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر اب جان گئی ہوں۔" اس کے لہجے کا ٹھہراؤ ہنوز تھا۔ وہ چیخنے' لڑنے مرنے نہیں آئی تھی۔

"کیا جان گئی ہو۔۔۔ کون سی الزام تراشیاں' قصہ ختم' تم تسلیم کر چکی ہو کہ تم نے مامون کو پسند کیا' تم نے اسے پھانسا۔"

"میں نے اسے نہیں پھانسا۔ اس نے مجھے' اس نے ہم دونوں کو ٹریپ کیا۔ اس نے تمہیں فقط اس لیے چھوڑ دیا کہ تم سے شادی کرنے کی صورت میں وہ ایب نارمل بچوں کا باپ بنے گا۔"

"بکتی ہو تم۔" عدینہ اتنی زور سے چلائی کہ خود ہی تکلیف میں گھر کے اپنا گلہ پکڑ لیا۔ رابعہ خاتون کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس نے ایک ایک شے کا حساب لگایا۔ اس کی ماں نے ایب نارمل بچوں کو جنم دیا۔ کیوں دادو! دیا تھا نا؟" وہ رابعہ خاتون سے پوچھنے لگی۔ "مامون کے والد' دادا جان کے سوتیلے بھتیجے تھے۔ مگر باپ کا خون تو ایک ہی تھا نا اور دادا جان ہی کی تین بہنوں میں سے دو کے ہاں دو' دو بچے ایب نارمل پیدا ہوئے۔ یہ جینٹک بیماری تھی۔ کزن میرج کے سائیڈ افیکٹ' آپ نے سرسری لہجے میں' ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی بیٹی کے دکھ سنائے تھے۔ میں نے آپ کے آنسو بھی پونچھے تھے۔ مگر گہرائی میں کبھی جھانکا نہیں۔ یقین کریں' میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ سسرال کے ظلم و ستم شوہر کے ناروا رویے کے باعث تنگ تھی' دکھی تھی' بیمار تھی' میں نے کبھی غلطی سے بھی نہ سوچا کہ۔۔۔ اور اگر سوچ بھی لیتی تو اتنی گہرائی میں کبھی نہ جاتی' میرے ساتھ زیادہ ظلم۔۔۔"

رابعہ خاتون کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔

بشائر نے بوڑھی ویران بہتی آنکھوں سے نظریں چرائیں۔ اس نے عدینہ کو دیکھا' جو پہلی بار بھڑکے بغیر سن رہی تھی۔ مگر نگاہیں ملنے پر اچھلی۔

"تو تم نے بھی تو۔۔۔ ایب نارمل بچہ ہی پیدا کیا نا' تم نے کون سا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔!" وہ طنزیہ ہنسی۔ "میں نے بھی ایب نارمل بچہ جنم دیا۔ یہیں تو مامون ابصار کو مات ہوئی تھی۔"

"تم سچ کہتی ہو۔ مامون تم ہی سے محبت کرتا تھا۔ عشق اور تم ہی کو اپنانا چاہتا تھا۔ وہ ڈاکٹرز کے آگے رو پڑا کہ اسے اپنی کزن ہی سے شادی کرنا ہے۔ کزن یعنی تم۔ اس نے ڈاکٹرز سے کہا کہ وہ عدینہ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا۔ لاکھ ان کے خاندان میں جینٹک بیماریوں کی ہسٹری ہے۔ مگر وہ پھر بھی عدینہ ہی کو اپنائے گا۔ وہ پاگلوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر پوچھ رہا تھا۔ وہ پیش بندی معلوم کر رہا تھا۔ ایسا کوئی راستہ یا علاج جس کے ذریعے وہ تندرست اولاد کو جنم دے سکیں۔ مگر ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' مگر 99 فیصد چانس ہے کہ وہ بھی۔۔۔ آپ اتنا عشق کرتے ہیں تو ایک راستہ یہ بھی ہے کہ آپ۔۔۔ آپ کزن سے شادی کر لیں۔ مگر کبھی بچے کے بارے میں نہ سوچیں۔"

"واٹ؟" وہ بوکھلا کر اچھل پڑا۔

"ہمارا کام ہے آپ کو گائیڈ کرنا' سچ سچ بتانا' ہم نے عمریں گزار دی ہیں' تحقیق و علاج میں۔ نارمل بے بی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر دوسرے کا بھی امکان رکھیں' باقی اللہ مالک ہے۔"

اور کیا تمہیں آٹھ سال پہلے کے وہ دن یاد نہیں' جب دادا جان بیمار ہوئے اور رابعہ دادو نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا تو مامون یہاں نہیں تھا۔ وہ ان ہی دنوں ڈاکٹرز پہ ڈاکٹرز بدل کر رائے لے رہا تھا۔ میں نے بھی یادداشت پر زور دے دے کر کڑیاں جوڑی ہیں عدینہ تم بھی خیالوں سے باہر نکلو۔ وہ نہ جانے کہاں سے لوٹا تھا۔ چپ چپ' پریشان' اس کی شیو بڑھی رہنے لگی تھی۔ وہ راتوں کو ٹہلتا تھا۔ سب کے پوچھنے پر وہ جبرا" نہ ہونے کا اعلان کر دیتا۔ مگر کچھ تو تھا ہی۔

وہ دوراہے پر کھڑا تھا۔ اسے تم سے محبت تھی' بے پناہ۔ مگر اس کو اولاد بھی چاہیے تھی۔ تندرست و توانا اولاد۔۔۔ نسل۔۔۔ نام۔۔۔ وراثت۔ اس نے محبت کو چھوڑ دیا۔ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ اسے مکمل صحت مند اولاد چاہیے تھی' اسے اپنا نام لیوا چاہیے تھا۔ اسے کسی دوسری لڑکی سے شادی کرنا تھی اور فوری دستیاب میں تھی۔

وہ خود پر ہنسی۔ "اور میں پاگل۔ میں نے سوچا تھا کہ مامون جتنا شان دار۔ اس کے ساتھ اتنی ہی شان دار' طرح دار لڑکی ہونی چاہیے اور تم ویسی نہیں تھیں یا۔۔۔ مجھے لگی نہیں۔۔۔ میں نے سوچا' پہلے چونکہ مامون کے ارد گرد کی واحد لڑکی تم تھیں۔ تو سارے فیصلے تمہیں مدنظر رکھ کر وہ کرتا گیا۔ لیکن ایک بہتر آپشن جب سامنے نظر آگیا تو۔۔۔ میں نے "بہتر آپشن" خود کو کہا ہے۔"

وہ اپنے آپ پر ہنس دی۔ "تو اسے کبھی نہیں چاہیے کہ وہ کم تر پر اکتفا کرے۔ تم بہت اچھی تھیں عدینہ! مگر مجھے اس کے برابر کی نہیں لگیں۔ میری عقل۔"

گفتگو اس مرحلے پر آگئی تھی کہ عدینہ سن رہ گئی تھی۔ بہت سارے اعتراضات کے باوجود وہ نہ جانے کیوں چپ سی رہ گئی تھی۔

"میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا دادو۔" وہ جیسے اچانک نڈھال ہو کر رابعہ خاتون کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

میں خوش نہیں ہوں۔ میں بہت دکھی ہوں۔ عون جیسا بچہ آزمائش بن کر آیا۔ وہ اپنے پسندیدہ بندوں ہی کو آزماتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اتنی ہی پسندیدہ۔"

رابعہ خاتون کو جھٹکا سا لگا۔ سالوں پہلے کا یادداشت سے اوجھل ایک پل' ایک سوال سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ ان کا پورا وجود رعشہ زدہ ہو گیا' کانپتے ہونٹ اور جھر جھر بہتی آنکھیں۔

"اور کوئی بات نہیں۔ اللہ نے میرے لیے ایسی اولاد چنی' ٹھیک ہے وہ بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔ میں بہت مضبوط ہوتی دادو! اگر مامون کا ہاتھ میری پشت پر ہوتا۔ اس نے یوں قدم پیچھے ہٹائے۔ جیسے یہ سارا میرا دوش ہو۔ سائنسی توجیہہ پیش کروں تو عون مامون کے باعث ایسا ہے۔ وہ تو سب جانتا تھا نا' مگر دادو وہ کبھی میرے ساتھ کھڑا نہ ہوا۔ سالوں ہو گئے' اس نے عون کے کمرے میں جھانکا تک نہیں۔ دس عون جیسے بچے کھڑے کر دیے جائیں نا تو وہ عون کو پہچانے بھی نہیں وہ نفرت کرتا ہے عون سے۔ شدید ترین' وہ اسے زہر کا

انجکشن نہ دے دے۔ مجھے یہ خیال آتا ہے۔ عون اس کے لیے باعث شرم ہے۔" وہ رونے لگی۔ مگر اس نے اپنی بات نہ روکی۔

"وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ عون اس کے سامنے آئے یا میں ہی اسے اس سے لاڈ کرتی نظر آؤں۔ آپ حیران ہو رہی ہیں نا۔ میرے گھر کے ملازمین واقف حال ہیں۔ وہ مجھے صاحب کے عتاب سے بچانے کے لیے جھوٹ سچ گھڑتے ہیں۔ وہ مجھے درست مانتے ہیں اور صاحب کو ظالم و جابر حکمران، مجھے اور عون کو مظلوم رعایا۔"

"وہ... وہ ایسا تو نہیں تھا۔ میرا دل نہیں مانتا۔ وہ تو سالوں تک..." رابعہ خاتون ڈھے گئیں۔

"وہ ایسا ہی تھا۔" وہ تیقن سے بولی۔ "اندر سے ایسا ہی تھا۔ مگر کیوں میں آج تک نہ سمجھ سکی۔ میرے لیے۔"

"تو اس کا مطلب ہے تمہارے دادا درست کہتے تھے کہ اس نے صورت ماں کی لی ہے۔ مگر وہ بنا بنایا باپ ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ بے یقینی سے کہتے کہتے بے بسی سے پوچھنے لگیں۔

"مجھے نہیں معلوم، دادا جان کیا کہتے تھے۔ میں نے تو بس اس کی صورت دیکھی اور گھائل ہو گئی اور آپ نے بتایا تھا نا کہ دادا جان، عدینہ اور مامون کے رشتے کے مخالف تھے۔ ان کی زیرک نگاہی نے بھانپ لیا ہوگا کہ مامون ابصار کا اندر کیسا ہے، میرے ساتھ ظلم ہوا دادو۔ میں..."

"وہ... وہ آخری پل میں مان گئے تھے۔" اس کے جملے کو کاٹ کر رابعہ خاتون نے اٹک اٹک کر کہا۔ "میرے مجبور کرنے اور عدینہ کے ستے چہرے کو دیکھ کر وہ..."

عدینہ اور بشائر ایک ساتھ اچھلیں۔

"میں یہ خوش خبری لے کر مامون کے پاس گئی تو اس نے تمہارا نام لے دیا۔ فائنل!"

"آ... آپ نے تو مجھے کبھی نہ بتایا؟" عدینہ کا چہرہ شدید حیرانی کے باعث بگڑ گیا۔

"تو کیا بتاتی... کہ دادا مان گئے اور اب مامون نہیں مان رہا۔ میں نے تمہیں جھوٹ سچ ملا کر جواز بتایا تھا۔ پر... میں نے سوچا کہ تم یہ پوری بات جان کر کہ مامون ہی نہیں مانا، کس قدر دکھی ہوتیں۔ میں نے تمہارے غصے کو بانٹ دیا تھا۔ آدھا دادو پر، آدھا بشائر پر، آدھا مامون پر... وہ اس کے جنون سے گھبراتے تھے۔ وہ مامون سے اعتدال کے خواہاں تھے۔ معاف کرنے کے، جبکہ مامون۔

مجھے آج یقین آگیا۔ وہ سچ کہتے تھے۔" وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ دکھ کی ان مٹ لکیریں۔

"چھوڑیئے۔ رابعہ دادو۔" "بات صرف یہ ہے کہ اصل ظلم میرے ساتھ ہوا کہ مجھے ایسا شوہر ملا جسے مجھ سے محبت نہیں تھی اور ظلم عون کے ساتھ ہوا کہ اسے مامون جیسا باپ ملا۔ عدینہ! تمہیں میرے اسٹائل نظر آتے ہیں۔ میرے بالوں کا اسٹائل میرے لباس کوئی مجھ سے پوچھے تو میں شاید دنوں ایک ہی جوڑے میں گزار دوں۔ تم کہتی ہو میں نے اپنا ہیرکٹ مین ٹین کر رکھا ہے۔ میری پیاری، نادان بہن! مجھے تو بڑھے ناخن کاٹنے تک کا ہوش نہیں۔ عون کا دکھ مامون کی بے اعتنائی مجھے ختم کر رہی ہے۔ اللہ کی قسم مجھے تو اب بھی نہیں معلوم کہ میں نے کون سے کپڑے پہن رکھے ہیں، شلوار قمیص یا اور رنگ شاید براؤن یا شاید پیلا۔"

رابعہ خاتون اور عدینہ نے بے ساختہ دیکھا۔ وہ مشہور ڈیزائنر کی لیٹسٹ کلیکشن کا ہلکا و گہرا جامنی سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ سفید اور سیاہ چھوٹے بڑے پھول... مگر وہ سوٹ ملگجا ہو رہا تھا۔ اس کے ایک کان میں ٹاپس تھا اور دوسرے میں نہیں۔

ہاں وہ شکست خوردگی کی تصویر تھی۔ ملال کی مثال... دکھ کا عنوان، اذیت کے مضمون کی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ کہنی رابعہ خاتون کے گھٹنے سے ٹکی تھی اور سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ پیر سن ہو گئے تو نہ جانے کب وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ اس کی نزاکت اب کمزوری دکھائی دیتی تھی۔ اس کی شخصیت کا وقار

نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ وہ اس وقت فقط مٹی مٹی نظر آ رہی تھی۔ دھول' نادیدہ۔۔۔ پپڑی زدہ ہونٹ اور حلقوں کے گھیرے میں ویران آنکھیں' جو رو' رو کر سوجی تھیں۔ مگر پھر بھی بول رہی تھی۔ مگر اب انداز بے حد دھیما سرگوشیانہ' مدھم' بلکہ خود کلامی رہ گیا تھا۔

ان دونوں کو لگا' وہ جیسے کہیں دور پہنچی ہوئی تھی۔ کسی اور ہی جہان میں "تم مجھ پر رشک کرتی ہو۔ مجھے کہتی ہو کہ میں دکھانے' بتانے آئی ہوں۔ میرے پاس دکھانے کو صرف جھوٹ ہے اور بتانے کو صرف دکھ۔۔۔ ایک زمانے میں مامون میری خواہش تھا اور اب وہ کہیں نہیں ہے۔ میری ترجیحات پوچھتی ہو۔ میں چاہتی ہوں۔ عون بالکل ٹھیک ہو جائے۔ بھاگے دوڑے اچھلے کودے مگر یہ ہو نہیں سکتا۔ عون جیسے بچے کبھی آگے نہیں بڑھتے۔ وہ آگے پیر رکھ بھی دیں تو پڑتا پیچھے ہی ہے۔ میری زندگی میں عون کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ خواہش' خواب' امید' سب عون اور اگر کوئی میرے دل میں جھانکے۔۔۔ میں ماں بننا چاہتی ہوں۔ ایک تندرست بچے کی۔ مگر یہ بات مامون ہونے نہیں دے گا۔ میں سر پیچ پیچ ہار گئی۔ مگر اسے قائل نہیں کر سکی۔ تمہاری تو وہ بہت سنتا ہے ناعدینہ! کیا تم میری سفارش کر سکتی ہو' میں اللہ سے ہر وقت ایک تندرست مکمل بچہ مانگتی ہوں۔ تاکہ جب کل عون نہیں ہو گا تو۔۔۔"

دونوں نے دہل کر اس کی صورت دیکھی۔

"میرے پاس کیا ہو گا۔ ہمارے رشتے میں اب کچھ نہیں بچا عدینہ۔۔۔ میں بقائمی ہوش و حواس مامون کو دوسری شادی کی اجازت دے دوں گی۔ لکھ کر دوں گی اور چلو میں لکھ کر نہ بھی دوں تو تب بھی جلد یا بدیر وہ کر بھی لے گا۔ تم بھی آگے بڑھ سکتی ہو۔ مگر جان لو میں شرط لگا سکتی ہوں۔ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا اور ہاں ہو سکتا ہے' وہ ساری زندگی میرے ساتھ ایسے ہی آدھا' کانا رشتہ نبھاتا رہے۔ مگر تم اپنی راہ کیوں کھوٹی کرتی ہو۔

تم میں اور مجھ میں ایک ہی بات مشترک ہے۔ ہم دونوں صرف صورت پر عاشق ہوئیں۔ لیکن تم خوش قسمت ہو عدینہ تمہیں سچی محبت ملی۔ اور میں بد قسمت اپنی محبت پا کر بھی خالی ہاتھ تمہیں بخت کا محبت بھرا دل کیوں نہ دکھائی دیا؟"

ایک موت جیسا سناٹا کمرے کی ہر شے سے لپٹ گیا۔

"میں سالوں تک تمہارے دادا سے جھگڑتی رہی کہ وہ الگ ہے جدا سا۔۔۔ وہ ویسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں۔ مگر مجھے آج پتا لگا وہ تو بنا بنایا ابصار تھا۔ دوسرا ابصار۔" رابعہ خاتون کے اس ایک جملے میں ان کا سارا دکھ پنہاں تھا۔ انہیں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے سب کہہ دیا تھا۔

اور عدینہ۔۔۔؟

کمرے میں دفعتاً ہلکی دبی دبی سی سسکیاں ابھریں۔ یہ عدینہ کی آواز تھی۔ وہ کس کس چیز پر رو رہی تھی۔ بشائر کی سچائی پر۔ اس کے دکھ پر۔ رابعہ خاتون کی دل چیر دینے والی خود کلامی پر۔ یا اپنی محبت کی موت پر یا محبوب کی حقیقت پر۔

اتنی محبت کے دعوے دار نے جب راستہ بدلا تو اس کو بتانے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کبھی بدگمانی دور ہی نہ کی۔ کیا اس میں بھی جرات نہ تھی کہ وہ اس سے صاف بات کہتا۔

وہ کس بات پر رو رہی تھی۔ کسی نے سوال نہ کیا؟ وہ یک دم اٹھ کر شاید اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی۔ جب بشائر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نظریں ملنے پر اس نے بیٹھے رہنے کا اشارہ دیا۔ اس کے انداز کی قطعیت نے عدینہ کو دوبارہ بٹھا دیا۔

"کب تک چپ چاپ کھڑے خود پر لگی دفعات کو سنتے رہیں گے۔ سامنے آ کر اپنی صفائی میں کچھ نہ کہیں گے۔ کوئی سچ' کوئی جھوٹ۔۔۔"

بشائر نے گردن موڑے بنا اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔ عدینہ اور رابعہ خاتون بری طرح چونکیں اور پچھلے گھنٹے سے دروازے میں کھڑا مامون ابصار بھی اچھل پڑا۔

"سالوں پہلے اس سگریٹ کی خوشبو سے آشنائی ہوئی تھی۔" بشائر نے یہ جملہ کسی سے کہا نہیں تھا۔ مگر اس کے لہجے میں خود اپنے آپ کے لیے ترحم تھا۔

مامون ابصار حسب عادت اندر داخل ہونے سے پہلے طویل آخری کش لینے رکا تھا اور پھر رکا ہی رہ گیا۔

بشائر نے اپنا چہرہ گھما کر سوجی آنکھوں سے اس سنگ دل کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر شرمندگی یا خوف کے بجائے ایک عجیب سی تکلیف کا تاثر تھا۔ بے حد شدید تکلیف کا عالم۔۔۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کی ہتھیلیوں پر ٹکے تھے۔ اس کی نظریں زمین پر پیوست تھیں۔

"کس قسم کی زندگی جی آپ نے مامون؟ کس قسم کے رشتے جی رہے ہیں آپ۔" اس کا لہجہ دکھ سے چور چور تھا۔

"نہ اچھے شوہر بنے۔ نہ اچھے باپ۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنسی۔ "ارے آپ تو اچھے محبوب بھی نہ بن سکے۔"

اس نے ایک جملے میں ساری داستان سمیٹ دی۔ پل بھر کی خاموشی کے بعد مامون نے نظریں اٹھا کر بشائر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ان میں بہت عجیب سا تاثر تھا' ناقابل بیان۔۔۔ بشائر نے کچھ چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"اتنی جلدی میرے عیب ختم نہ ہوں گے بشائر۔" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں' ایک حتمی فیصلہ۔

"میں اچھا بیٹا بھی نہیں بن سکا تھا۔ بلکہ میں اچھا بھائی بھی نہ بن پایا۔"

بشائر سمیت عدینہ اور رابعہ خاتون نے چونک کر نظریں اٹھائی تھیں۔



وہ گیارہ سال بعد ماں بننے جا رہی تھی۔ خوشی' خدشہ' دعا اس کے شوہر اور سسرال کے تحفظات حسب معمول تھے۔ مگر اس کا یقین پہلے سے بڑھ کر ایک ایب نارمل ذہنی و جسمانی معذور بچے کے بعد وہ اپنے خاندان کو ایک خوب صورت' صحت مند' توانا وارث بھی دے چکی تھی۔

اسے بیٹی کی خواہش تھی۔ مکمل خاندان' اس کے سجدے طویل ہونے لگے۔ وہ اس بار روحانی طور پر بہت پرسکون تھی۔ مگر بہترین خوراک کے باوجود' اس کے جسم کی ہر ہڈی بولتی' ہاتھ پیر سن ہو جاتے۔ ابتدائی مہینوں ہی میں اس کا اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ پیٹ کے نچلے حصے میں مسلسل ہلکا درد اور ورم کا احساس رہتا۔

اب اس کی سسرال میں پوزیشن مستحکم تھی۔ وہ اتنے بڑے افسر کی بیگم تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ خوب مزے سے پلنگ پر بیٹھ کر اس وقت کو گزارے اور اس میں کوئی مشکل بھی نہیں تھی۔

لیکن نہیں! وہ مونس کی ماں بھی تو تھی۔ جسے اس گھر میں اس کے علاوہ آج بھی کوئی نہیں پوچھتا تھا اور وہ بھی اس کے علاوہ کسی کو اپنے گرد برداشت نہ کرتا تھا۔ اس کا کمرہ اوپر شفٹ کرایا گیا تھا اور اسے سیڑھیاں چڑھنا پڑتیں۔ اسے دن میں کئی بار اوپر نیچے ہونا پڑتا۔

گزرتے وقت نے مونس کو مزید تنزلی کی جانب بڑھایا تھا۔ آج تک اسے ماں ہی نے سنبھالا تھا۔ وہ کسی بھی نئی شکل کو دیکھ کر چلانے لگتا۔ اسے کھلانے' پلانے' کپڑے بدلوانے' نہلانے تک کے کام وہ ہمیشہ سے خود خوشی خوشی کیا کرتی تھی۔ مگر اب وہ بہت کمزور تھی اور تکلیف میں مبتلا۔۔۔ اس نے ملازمہ کو اپنے ساتھ زیادہ لگانا شروع کیا کہ وہ اس سے مانوس ہو جائے۔ اگر اس کا موڈ اچھا ہوتا تو وہ مان جاتا۔ ورنہ وہ چیخ و پکار ہوتی کہ الامان۔

ایک روز وہ چکر کھا کر بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے بتایا۔ "بار بار کے ابارشنز نے انہیں اندر سے جیسے زخمی کر رکھا ہے۔ تو وہی زخم تکلیف دیتے ہیں۔ مکمل آرام اور احتیاط دوائیں باقاعدگی سے۔"

اس کا حال بہت خراب تھا۔ وہ حوائج ضروریہ کی محتاجی سے بیٹھی تھی۔

ادھر مونس کے نعرے۔۔۔ وہ ملازمہ کے ہاتھ کہاں آتا۔ اس کے شوہر نے ایک آدمی کو بطور ہیلپر بھیج دیا۔ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ رہے سہے حواس بھی کھو بیٹھا۔ وہیل چیئر پر سر پٹختا۔ سامنے والا قابو میں آتا تو اسے پورے وجود کی طاقت سے کاٹ لیتا۔ ورنہ ناکامی کی صورت اپنے ہاتھ چبا ڈالتا۔ وہ ذرا سی بحالی کا احساس پاتے ہی ملازمہ کے سہارے اوپر آگئی۔ اس سے لپٹ گئی۔ اس کا بچہ۔ اس کی آنکھوں سے سیل رواں بہتا تھا اور وہ بھی لپٹ لپٹ گیا۔ اس کے اندر سمانے کی کوشش اور وہ خود کو سنبھالتی یا اسے۔ وہ پندرہ سال کا تھا۔ قطعی ایب نارمل، لیکن ملازمہ اسے نہلاتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ اس نے بڑے حساب کتاب سے اس دن اسے نہلانے کا ارادہ کیا۔ جھاگ کے کھیل ٹب میں تیرتی بطخوں کا کھیل۔ ملازمہ تولیہ کپڑے لیے الرٹ، اسے نہلانا مشکل کام تھا۔ مگر نمٹ گیا۔ لیکن یک دم۔۔۔ دھڑام۔۔۔ دھا۔۔۔ وہ نہ جانے کس طرح پھسل گئی۔

اسے کس طرح بچایا گیا۔ پتا نہیں۔ اس کے اندر پلنے والا بچہ بھی محفوظ رہا۔ مگر وہ بستر نشین ہو گئی۔ گردوپیش سے بے گانہ درد سہتی۔

"مونس اچھا ہے نا؟" وہ ملازموں سے پوچھتی۔

"تم بھائی کے پاس جاتے ہو نا؟" اس نے چھوٹے بیٹے سے پوچھا۔ "اس کے ساتھ بال کھیلتے ہو نا۔" بچہ ہاں میں جواب دیتا۔

مگر ایک روز کہہ بیٹھا "میں نہیں جاتا امی! اس سے بو بہت آتی ہے۔"

"بو؟ کیسی بو۔۔۔؟" اس کے سر پر پہاڑ سا گرا۔

"پونی کی اور ابو نے اسے گنجا کر دیا۔ اس کے سر میں بہت جوئیں تھیں امی۔" اس کے پیروں سے زمین کھسک گئی۔

وہ افتاں و خیزاں اوپر پہنچی تو بدبو کے بھبکے نے استقبال کیا۔ بھنبھناتی مکھیاں۔ اوک اووو۔۔۔ اس کا کلیجہ منہ کے راستے ابلنے کو تھا۔

وہ اس کے بستر پر پہنچی۔ تو وہ خالی آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ ان میں پہچان کا کوئی رنگ نہ تھا۔ سرفہ لو دن میں۔۔۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ وہ ماتھا چومنے کو جھکی تو اس نے یک دم اپنی حیوانی طاقت سے نہ جانے سر اٹھایا یا ہاتھ۔ اس کے پیٹ کے اندر بم دھماکہ ہوا تھا۔ اس کی چیخوں نے درختوں کے پرندوں تک کو سہما دیا۔

اسے لے گئے۔ اس کے پیٹ میں پلتی بچی نے دم توڑ دیا تھا۔ مگر اس کی موت کا وقت ابھی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ گھر آگئی۔ آپریشن کی تکلیف۔ وہ جنبش کرنے سے بھی قاصر تھی۔ اسے اردگرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس نے اپنی عیادت کے لیے آئے والدین کو بھی نہ پہچانا۔ اسے ایک ہی بات یاد تھی۔

"مونس کیسا ہے؟" سب اس کی تشفی کرا دیتے۔ وہ گھر والوں سے واقف تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے بھی واقف تھی۔

"تم بتاؤ سچ سچ!" اس نے چھوٹے بیٹے کو پکڑ لیا۔

"وہ اچھا ہے امی۔" وہ نظریں چرا رہا تھا۔

"جھوٹ نہیں بولتے۔"

"آپ بیمار تھیں نا۔۔۔ تو پہلے وہ بہت روتا تھا۔ شور کرتا تھا۔ پاگل ہو گیا تھا۔ امی اوہ سوری۔۔۔ سب کہتے تھے نا۔ لیکن پھر اس کے بعد چپ کر گیا۔ دراصل جب ابو اور چاچو نے اسے زنجیر سے باندھا تھا تب۔۔۔"

"ہاہ!" اس کی چیخ نکل گئی۔

اس کا پیٹ چرا پڑا تھا۔ ٹانکے کچے تھے۔ مگر وہ اوپر آگئی۔

"آہ!" اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مگر اس کی آنکھوں سے لہو ٹپکنے لگا تھا۔

اس کا بچہ۔۔۔ تن تنہا غلاظت میں لتھڑا، بے بس و لاچار، اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے اجنبی نگاہوں سے تکتے سہمے بچے کو خود میں سمو لیا، اسے چوم لیا۔ اس کی زنجیر۔ اس نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ اس کے اندر ہمت اور طاقت نہ جانے کہاں سے آئی۔ اس نے بیٹے کو نہلایا۔ کپڑے بدلوائے۔ اس نے خاموش بیٹے کو کھانا کھلایا۔ اس نے میلے کپڑوں کا ڈھیر کچھ کہے بنا ملازمہ کے حوالے کیا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا تمہیں صرف اپنے بھائی سے محبت کرنی ہے۔" وہ چھوٹے بیٹے سے مخاطب تھی۔

"تو میں کرتا ہوں نا۔۔۔ میں نے کل بھی اسے I Love You کہا تھا اور فٹ بال کھیل کر دکھائی تھی۔ ٹام اور جیری بھی دیکھنے آیا تھا۔ مگر ادھر بہت بو تھی امی۔"

"ہاں وہ اس کا بیٹا ہے اور اس نے اسے سنبھالنا ہے۔" اس نے سوچا تھا مگر یہ عزم اگلی صبح دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اس کے ٹانکے کھل گئے تھے۔ اس کا پیٹ کھل گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر سرجری کی ٹیبل پر تھی۔

اس بار وہ گھر لوٹی تو بے جان تھی۔ ختم، پانی کے گلاس کی بھی محتاج کروٹ بدلنے سے قاصر۔ اسے اوپری کمرے سے شور کی آوازیں آتیں۔ زنجیر کی آواز گھر والوں کی بک جھک، مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ وہ خود ہوش و بے ہوشی کے درمیان زندہ تھی۔ اسے عجیب و غریب خواب ستاتے۔

اس کی دواؤں میں نشہ سا تھا۔ وہ گھنٹوں سوئی رہتی اور ہوش آنے پر بھی دماغ سن رہتا۔

"اللہ سائیں آپ کو صحت دے بی بی! کوئی غلطی ہو تو ماپھ (معاف) کر دینا۔"

"تم کہاں جا رہی ہو صغرا۔۔۔ مونس کو تمہاری ضرورت ہے۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ ذرا مجھے ٹھیک ہونے دو۔"

ملازمہ ہچکچائی۔ بڑی بیگم صاب نے تو خاموشی سے جانے کا بولا تھا۔ مگر بی بی! آپ کے بڑے احسان تھے مجھ غریب پر۔۔۔ مونس بابا کو میری اب کیا ضرورت۔"

"کیوں! کیا مطلب؟"

"اس کو تو۔۔۔ اس کو تو صاحب جی گاڑی میں ڈال کر، کہیں دور، بہت دور چھوڑ آئے ہیں۔ وہ بہت خطرناک ہو گئے تھے جی۔ زنجیر والا ہاتھ سر پر مار مار کے اپنا ہی خون کر ڈالا۔ صاحب کے ہاتھ پر کاٹ لیا جی۔ بوٹیاں لگ گئی تھیں۔ نہلانے دھلانے والا لڑکا بھی بھاگ گیا۔"

وہ لہولہان تھی۔ وہ بے جان تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ مگر قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ لڑے، جھگڑے، چلائے، کوسے یا پھر صرف پوچھے کہ بتا دو میرے جگر گوشے کو کہاں چھوڑ آئے۔

"کہاں ہے میرا بچہ؟" وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر بمشکل کھڑی پورے جسم کی طاقت لگا کر چلا رہی تھی۔ "ارے ظالمو! کہاں ہے میرا بچہ۔"

وہ گرتی پڑتی سیڑھیاں چڑھی۔

ہاں۔۔۔ وہ تو خالی دھلا دھلایا کمرہ تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

"وہ وہیں ہے جہاں اسے عرصے پہلے چھوڑ آنا چاہیے تھا۔" اس کے شوہر نے سگار کی راکھ کا جائزہ لیتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ وہ چیل کی سی تیزی سے جھپٹ پڑی۔

"ظالم انسان، کہاں چھوڑ آئے میرے بچے کو؟" وہ اس کے سینے پر زور، زور سے ہاتھ مار رہی تھی۔ اور شوہر کے خواب و خیال میں بھی یہ ری ایکشن نہ تھا۔

"میرا بیٹا لا کر دے۔" وہ حلق کے بل چلائی اور شوہر کا دھکا لگنے سے گر گئی، جو حق دق اس کو دیکھ رہا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہے یہ۔۔۔ پاگل کی ماں پاگل۔" وہ گھر کے لوگوں سے مخاطب تھا۔ "لے جاؤ اسے۔" وہ اس پر پل پڑتا۔ مگر اس کا حال خراب ہو گیا تھا۔ ٹوٹا چشمہ، چرا گریباں، سفید بنیان جھلک رہی تھی اور چہرہ۔۔۔ اف وہ بے دم ہو چکی تھی۔

"میرا مونس۔۔۔ کہاں۔۔۔ ہے۔۔۔ کس۔۔۔ حال میں ہو گا۔ وہ تو۔۔۔ بھوکا۔۔۔ مر۔۔۔ جائے گا۔ وہ۔۔۔ میرے۔۔۔ علاوہ۔۔۔ کسی۔۔۔ سے کھاتا۔۔۔ کھاتا۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا۔۔۔ مون۔۔۔ اس۔۔۔ میرا۔۔۔ مو۔۔۔ نس س س س۔"

وہ ہوش و خرد سے بے گانہ زمین پر پڑی تھی۔

"میرا۔۔۔ مونس۔۔۔ اللہ؟" اس کی پکار دل چیر دینے والی تھی۔



وہ برسات کی ایک سیلن زدہ رات تھی۔ پتنگے اور جھینگر... ہر شے نمی سے بوجھل اپنی اپنی سوچوں میں گم تھی۔ جان دار کیا' بے جان کیا۔ سناٹا روح میں اتر جانے والا اور اس کی سانس رک رک کر چلتی تھی۔

"تم سب سے زیادہ پیار کس سے کرتے ہو بیٹے؟"

بیٹے نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ وہ خوف زدہ تھا' سہما ہوا' پریشان' الجھن میں۔

"جواب دو... بیٹے!"

"بب... بھائی سے کرتا تھا... بھائی سے کرتا تھا۔" اس نے تیزی سے کہہ دیا۔

"تھا... کیوں بولا' اب نہیں کرتے؟"

"وہ اب... نہیں ہے نا' تو اس لیے تھا بولا۔"

"وہ ہے بیٹے! موجود ہے' بس اتنا نہیں معلوم کہ کہاں ہے؟"

"امی...!" وہ کچھ سوچتا ہوا جھجک کر بولا۔ "امی...! کیا ابو کبھی مجھے بھی چھوڑ دیں گے کہیں دور' ایسے گاڑی میں ڈال کر۔"

"نا... نہیں... تم کو کیوں... تم تو طاقت ور ہو نا' تم اسٹرگل کرسکتے ہو۔ زندگی میں کبھی بھی کوئی تمہیں ہاتھ لگائے تو تم اس کا منہ توڑ دینا۔"

"تو طاقت ور تو بھائی بھی تھا۔ وہ بہت اچھل رہا تھا۔ شور کرتا تھا۔ مگر ابو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔"

"ہائے..." اسے جھٹکا سا لگا۔

"مجھ سے... پرامس کرو۔" اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ بیٹے کے چہرے پر الجھن تھی۔ وہ خوف زدہ سا تھا۔ مگر اس نے ماں کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔

"تم نے اپنی پوری زندگی بھائی سے پیار کرنا ہے۔" اس کے جملے ٹوٹنے لگے۔ "تم نے اسے ڈھونڈنا ہے۔ ان لوگوں سے پوچھ لینا۔ مگر اسے ڈھونڈنا ضرور... تم اس سے پیار کرتے ہو نا؟" اس نے یک دم خدشے میں گھر کے پوچھا۔

"کرتا ہوں... امی... کتنی بار... بتایا تو ہے۔" وہ کچھ جھنجلایا۔

پھر ماں کو دیکھا تو تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "وہ میرا بھائی ہے امی۔"

سادہ سے جملے میں ایسی انمول یقین دہانی چھپی تھی کہ اس کے بے چین دل کو قرار آنے لگا۔

وہ ساری رات اسے بتاتی رہی تھی۔ سمجھاتی رہی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ سو جاؤں۔" اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

"ہاں...!" اس نے اپنا بازو پھیلا دیا۔ ایک بازو آباد تھا اور دوسرا... اس کی سسکی کی آواز پر بیٹے نے نیند سے بوجھل آنکھیں اٹھائیں۔

"آپ روئیں مت امی!" اس نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں پونچھنے کی سعی کی۔ "میں آپ کو بھائی لا دوں گا۔ آئی پرامس۔ میں اسے ڈھونڈوں گا۔ ماموں ابصار جھوٹ نہیں بولتا امی۔" اسے خود پر بھروسا تھا۔

مریم نے آنکھیں موند لیں۔ پرسکون' ہمیشہ کے لیے۔



"جب تک امی زندہ تھیں تو وہ مجھے بتاتی تھیں کہ میں بھائی سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں ان جملوں کو سبق کی طرح یاد کرچکا تھا۔ ان کے پوچھنے پر رٹو طوطے کی طرح بتا دیتا اور وہ خوش ہوجاتیں۔ طمانیت ان کے خوب صورت چہرے پر ہلکورے لینے لگتی۔ لیکن... جب وہ..."

وہ رکا۔

"لیکن... لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی ان دونوں سے کس قدر محبت کرتا تھا' سچی محبت۔ ماں کی طلب بے چین کرتی تو میں ان کی قبر پر چلا جاتا اور بھائی کی... اس کا کونے کا اوپری کمرہ نئے انداز میں ڈیکوریٹ کردیا گیا تھا۔ خوب صورت' سجا بنا' خوشبودار' اب اس گھر میں کوئی شور نہ تھا۔ کوئی بو نہ تھی۔ کسی کے نعرے نہیں تھے۔ کہیں زنجیر کی کھنک

تھی۔ زندگی سب کے لیے نیا آغاز لائی تھی۔ مگر ... لیے زندگی ٹھہر چکی تھی۔ مجھے راتوں کو خواب دکھائی دیتے۔ مونس اور ... امی اور مونس۔ میری زندگی سے قرار رخصت ہوچکا تھا۔ مجھے اپنا ... یاد تھا کہ مجھے بھائی کو ڈھونڈنا ہے۔ مگر کیسے؟ واحد ... میرا باپ تھا۔ ابصار احمد... اور... اور تمہیں ... میں ان سے' ان سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ مجھے بھی' مجھے بھی ایسے ہی ایک روز کہیں چھوڑ آئیں گے۔ ... بہت چھوٹا تھا۔ کمزور' بے بس' انجان۔ میں بہت ... ہوتا تھا بشائر!"

ماموں ابصار نے یک دم بولنا روک کر بشائر کو یقین ... نا چاہا اور وہ سر بھی نہ ہلا سکی۔

اس نے ماموں ابصار کی آنکھوں میں ہمیشہ خوب ... رتی کو دیکھا تھا یا پھر قطعیت' سردمہری' اجنبیت ... والی' سختی' درشتی' حاکمیت۔

اس نے پہلی بار ان آنکھوں میں خوف دیکھا۔ دکھ ... بھا' ماتم دیکھا' بے بسی و بے چارگی۔

اس نے پہلی بار ان آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

ماموں ابصار بولتے بولتے کھو جاتا۔ وہ رو پڑتا۔ وہ بے بس بھیگی نگاہیں اٹھا کر جب یقین طلب انداز میں بشائر کو دیکھتا تو اس کا دل ٹھہر ٹھہر جاتا کہ وہ آگے بڑھ کر اس شخص کو اپنے سینے میں بھینچ لے۔

مگر وہ ششدر' ساکت' ہمہ تن گوش تھی۔

"میں اپنے باپ سے ڈرنے لگا تھا۔ میں خوف زدہ تھا اس شخص سے' وہ بہت ظالم شخص تھا' جس طرح اس نے میرے بھائی کو منہ پر ہاتھ رکھ کے ہائی روف میں ٹھونسا تھا۔ میں نے سوچا مجھے بڑا ہونا پڑے گا۔ طاقت ور اور دولت مند۔ تب میں پوچھوں گا اور مجھے گاڑی چلانا سیکھنا ہوگی۔ امی نے کہا تھا۔ ہر جگہ جانا بھائی کو ڈھونڈنے۔" وہ کسی معصوم چار سالہ بچے کی طرح بولا۔

"میں منصوبہ ساز بن گیا بشائر..." وہ زہر خند لہجے میں ... "میں مختصم مزاج اور دوغلا بن گیا۔ میں اچھا بیٹا بن کر رہتا تھا۔ مگر بہت برا تھا میں' منافق تھا۔

اور سترہ برس کی عمر میں مجھے لگا کہ میں طاقت ور ہوں۔ میرے مسلز اور مجھے گاڑی چلانی آگئی تھی۔ میں کالج میں گیا تھا نیا نیا۔ وہ علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے۔ جائز ناجائز آمدنی اور جائیدادیں میرے نام بھی بہت کچھ تھا۔ میں نے اس دولت کا کبھی حساب رکھا۔ ہاں اب وہ وقت آگیا تھا کہ میں اپنے بھائی کے بارے میں پوچھوں۔

میں نے بہت سارے ری ایکشنز سوچ رکھے تھے۔ وہ شدید حیرانی کے بعد مجھے ٹال گئے۔ مگر اصرار پر یک دم بھڑک گئے۔

"مجھے بس بتا دیں' وہ کہاں ہے؟"

"پاگل کہاں ہوتے ہیں... پاگل خانے میں نا۔"

"مجھے اس پاگل خانے کا پتا چاہیے۔ مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔ اس سے ملنا ہے۔"

"کیا کرنا ہے... واپس گھر لانا ہے۔" وہ تضحیک آمیز انداز میں پوچھنے لگے۔

"یہ تو میں نے نہیں سوچا۔ مگر میں نے اپنی امی سے پرامس کیا تھا کہ میں بھائی کو ڈھونڈوں گا۔ آپ نے اس کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک..."

اوہ تو وہ پاگل کی بچی زہر گھول کر مری تھی۔ اس نے...

"اب پتا نہیں بشائر میں نے صحیح کیا یا غلط... وہ میری ماں کے بارے میں نہ جانے کیا' کیا بول رہے تھے۔ میں نے ان کا گریبان پکڑ لیا۔

"خبردار جو میری ماں کے بارے میں... آپ مجھے پتا بتاتے ہیں یا پھر میں..."

اور وہ خوف زدہ ہوگئے۔ کھانسنے لگے۔ میرا جنون اور جارحیت کم ہونے والی نہیں تھی۔ انہیں سچ بولنا پڑا۔ وہ کسی ملازم کے حوالے کر آئے تھے اور آگے ملازم نے کہاں... اللہ جانے اور ملازم مرچکا تھا۔

میری ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے اس گھر کو چھوڑ دیا۔ بشائر! میں نانا جان کے پاس آگیا۔

میری ماں نے اس رات مجھ سے تین باتیں کہی تھیں۔ بھائی کو ڈھونڈنا' خوب پڑھنا اور کامیاب انسان بننا۔ میں ایک میں ناکام ہوا تھا۔ لیکن باقی دو میں۔۔۔ میں نے مٹی کو ہاتھ لگایا تو وہ سونا بن گئی۔ مگر میں ماں سے کیا وہ وعدہ نہ نبھا سکا۔ جو اس نے اپنی زندگی کے آخری جملوں کے طور پر مجھ سے لیا تھا۔

میں نے باقی کی ساری زندگی ماں سے شرمندہ اور باپ سے نفرت کرتے گزاری۔ انہوں نے مجھے کہا کہ وہ یعنی مونس گھر میں رکھنے کی چیز ہی نہ تھا۔ یہ تو میری ماں کی ضد تھی۔ ورنہ ایسے بچے اسپیشل ہومز میں رہتے ہیں اور وہ بھی امیروں کے' غریب تو پھینک پھانک دیتے ہیں' کہیں ڈال آتے ہیں۔"

بشائر کی آنکھیں جھر جھر بہہ رہی تھیں۔ اسے مامون ابصار پر رحم آرہا تھا۔

"اور نانا جان مجھے ناپسند کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے میں بنا بنایا ابصار احمد ہوں اور نانو کہتی تھیں' نہیں میں اپنی ماں جیسا ہوں' لیکن میں کیسا ہوں' مجھے آج تک پتا نہ لگا۔

ہاں میں بچپن سے پلان میکر تھا لیکن عدینہ سے محبت خود بخود ہو گئی۔ وہ چھوٹی سی گڑیا جیسی تھی' تنہا اکیلی' ناولوں کی شائق' سنگھار کی شائق اور وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی شکل امی جیسی تھی اور وہ پیاری یوں لگتی تھی کہ بچی بنی رہتی تھی۔ میں نے اپنی امی کو کبھی سجا بنا نہیں دیکھا۔"

بشائر نے چونک کر مامون ابصار کی صورت دیکھی۔ کیا وہ آج سارے سچ کہہ دینے والا تھا۔

"بشائر صحیح کہتی ہے۔ میں نے عدینہ سے شادی اس لیے نہیں کی کہ میں ابنارمل بچوں کو دنیا میں لانا نہیں چاہتا تھا۔"

عدینہ کے کان میں یہ اعتراف انڈیل کر وہ سرعت سے اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

سالوں بعد اپنی بیٹی کو روتی رابعہ خاتون نے بشائر کو تیزی سے پیچھے روانہ کیا کہ مامون کی ذہنی حالت۔۔۔ کہیں خدانخواستہ؟ اور وہ سرپٹ بھاگی تھی۔

اور بشائر نے نکلتے نکلتے دیکھا۔ عدینہ کے دونوں ہاتھ سختی سے ہونٹوں پر جمے تھے۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ بے یقین آنکھوں سے گرتے آنسو گریبان بھگو رہے تھے۔ اسے شاید سکتہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پتھریلے چہرے کے ساتھ اندھا دھند گاڑی بھگا کر مامون ابصار دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتا بیڈ روم میں پہنچا۔ وہ کمرہ مقفل کر کے نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ بشائر اتنی تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی کہ دوپٹا کہیں سیڑھیوں ہی میں گر گیا۔

وہ شاید اس کے اندر گھس آنے سے بے خبر تھا یا اس وقت اسے کسی بھی شے کی خبر نہ تھی۔ وہ دیوار پر سر مار مار کے رو رہا تھا۔ با آواز بلند۔

وہ خوف زدگی کے عالم میں کانپتی ٹانگوں کے ساتھ کھڑی اس کا جنون دیکھتی رہی۔

"میں اس سے بہت پیار کرتا تھا' بہت زیادہ۔" بشائر کا دل کٹ گیا۔ عدینہ سے پیار کا ایسا والہانہ' بے خود' جنونی اعتراف۔

"آپ اسے اپنالیں مامون۔۔۔ آپ اسے اپنالیں۔" وہ اسے سر پھوڑنے سے باز رکھنے کے لیے اس کی پشت سے لپٹ گئی۔

"میں بیچ میں نہیں آؤں گی مامون۔۔۔ آپ اسے۔۔۔" وہ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ یک دم گھوما اور اسے شانوں سے تھام لیا۔

"مجھے بہت بعد میں احساس ہوا بشائر! کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ امی کے کہنے پر میں صرف جملہ دہراتا تھا۔ مگر میں مونس سے دل سے محبت کرتا تھا۔ بس احساس دیر سے ہوا۔ جب تک امی زندہ تھیں تو وہ مجھے بتاتی تھیں کہ۔۔۔"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔" بشائر بری طرح چونکی۔

"کس کی بات۔۔۔؟ میں صرف مونس کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے دنیا میں صرف اس سے محبت تھی۔ میں اس کے لیے رویا ہوں۔"

[...]س نے نظریں بشائر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ بشائر [...]کھا۔ رونے سے سرخ ہوئی آنکھیں بالکل عون [...]تھیں۔ اسے اس شخص پر ترس آرہا تھا۔ اسے یہ [...]ظالم لگ رہا تھا۔ اسے یہ شخص مظلوم بھی لگ [...]

[...]وہ اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ بشائر کرسی پر ساکت [...]گئی۔ شاور کی آواز لگا تار تھی۔

[...] جانے کتنا بہت سارا وقت گزر گیا' جب وہ دوبارہ [...]کے سامنے والی کرسی پر آکر ٹک گیا۔ گیلے بال ماتھے [...]رہے تھے اور رویا' رویا چہرہ اس چہرے پر رعونت [...]تھی۔ کوئی پرت نہیں تھی۔ ایک سادہ چہرہ۔۔۔

"چائے منگواؤں۔" اس کی آواز رونے سے [...]بھی۔ مامون نے کوئی جواب نہ دیا۔ یک ٹک [...]کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ارتکاز اتنا گہرا تھا کہ بشائر کو [...] کا احساس ہونے لگا۔

"اور بشائر سجاد۔۔۔! تمہاری ہمراہی۔۔۔" اس نے یک [...]اسے مخاطب کیا۔ "کسی بھی انسان کے لیے زندگی کا [...]ب سے بڑا فخر ہوتی۔ تم اتنی باوقار اور مکمل عورت [...]ہیں۔ میں پہلی نگاہ میں تم سے متاثر ہوا تھا۔ تمہاری [...]ت' لہجہ اور آواز کا اتار چڑھاؤ' ذہین آنکھیں' تم [...]کسی بھی مرد کا خواب ہو سکتی تھیں۔"

وہ کہیں دور کھویا شاید اس پل کو دہرا رہا تھا۔ جب [...]اس نے بشائر کو دیکھا تھا۔

"اور میرا بھی ہو جاتیں اگر۔۔۔ اگر عدینہ نہ [...]ہوتی۔"

بشائر نے پہلو بدلا۔

"وہ تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ کسی [...]بھی لحاظ سے۔۔۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ سطحی' نخریلی' [...]بات بات پر جان دینے والی۔ ایک انٹرایاسی لڑکی۔ مگر اس کا کیا [...]کروں بشائر کہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ ساری دنیا سے [...]زیادہ مجھے اس کی موجودگی میں کبھی کوئی عورت بھلی لگی [...]ہی نہیں۔ بس دل تھا نا۔ ایک بار ٹک گیا تو ٹک گیا اور [...]اسے چھوڑنے کا فیصلہ زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ تھا اور فیصلے پر کاربند رہنے کے لیے اس کی ہر امید کو توڑنے کے لیے مجھے فوری طور پر اس کو خود سے بدول کرنے' مایوس کرنے کے لیے شادی کر لینی چاہیے تھی اور اسے ہی کیا' خود اپنے آپ کو بھی پکار رکھنے کے لیے۔۔۔ کہیں میرا ہی دل دغا نہ دے جائے۔ میں نے جھٹ تمہارا نام لے دیا۔ تم فوری طور پر دستیاب تھیں نا۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ بشائر کا دل جیسے کسی نے کانٹوں کی راہ گزر پر ڈال دیا۔ تو آج یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ تم نے بشائر سے شادی کیوں کی؟

"مجھے عدینہ کو مایوس کرنا تھا۔ وہ مجھ پر اتنا حق رکھتی تھی کہ اگر ایک بار' فقط ایک بار آنسو بھری آنکھوں سے آکر میرے سامنے کھڑی بھی ہو جاتی تو میرے پائے ثبات میں لغزش آجاتی۔ میں اس سے' اس آزمائش بھرے بے بس پل سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ تم بہترین تھیں ہر لحاظ سے۔۔۔ تمہاری ذہانت' تمہارا شخصیت کا وقار' ٹھہراؤ' نظم میں نے ایک بار عدینہ ہی سے کہا تھا۔"

"بھلے شان نے وہاں کینیڈا میں بشائر کو نہیں دیکھا۔ مگر وہ خوش قسمت ہے کہ اسے اتنی شان دار لڑکی مل رہی ہے۔"

اور سچ کہتا ہوں' دل میں عدینہ کی نقب زنی نہ ہوتی تو میں بصد احترام دیدہ دل وا کیے تمہارے لیے ہامی بھر لیتا' فخر کرتا' تم جیسی لڑکی کو پا لینا ساری زندگی کی خوشی جیسا تھا۔"

بشائر کو پتا ہی نہ لگا' نہ جانے کب سے آنسوؤں کا ایک ریلا گالوں کو گزرگاہ بنا گیا۔

"تمہارا اس کا موازنہ کرتا ہوں کہ تم اور وہ۔۔۔ تو خود پر حیران ہوتا ہوں۔ اور حیرانی تو یہ بھی ہے کہ میں آج بھی اس کی جانب ملتفت ہوتا ہوں۔ میں تمہیں اذیت دے رہا ہوں۔ جانتا ہوں' مگر یہ دل آج بھی ملال میں جیتا ہے اور پچھتاووں کی مار سہتا ہے کہ اے کاش۔۔۔"

"آپ اسے اپنالیں مامون!" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

ماموں نے جیسے سنا نہیں، وہ کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔

"تمہاری ہمراہی فخر تھی۔ قابل تعریف۔ میں نے تمہارے ساتھ زندگی کا آغاز ایمان داری سے کیا تھا۔ بس دل کا ایک کونہ تمہارے لیے نہ کھولا۔ اسے مقفل کر کے چابی کہیں دور پھینک دی کہ نہ تم کبھی جھانک سکو اور نہ میں جھانک پاؤں۔ نانا جان نے اور بعد میں نانو نے بھی کہہ دیا کہ میں ادھر نہ آیا کروں یا کم از کم عدینہ کی موجودگی میں۔

میں عدینہ کو بھولا تو خیر کبھی نہیں، مگر بہل ضرور گیا اور پھر عون کے آنے کی خبر۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سب کچھ یوں ہی کا قصہ تھا۔ محبت، دل لگاؤ، مجھے تو بس جیسے ایک وقت کا انتظار تھا۔

ہم ایک دوسرے کے قریب ہو رہے تھے۔ عون کے بعد اور زیادہ قریب۔ مجھے تم سے محبت ہونے لگی تھی۔ مجھے تم پر فخر ہونے لگا تھا۔ عون کے بعد اور زیادہ۔ اور عون کی بیماری کے بعد تو میں... حیران رہ گیا۔ تم تو بالکل میری ماں جیسی تھیں۔ اولاد سے محبت کرنے والی۔

میرے بہت سے رویوں کے پیچھے وجوہات تھیں بشائر۔

میری ماں اجڑے بچڑے حلیے کی ہراساں عورت تھیں۔ وہ بیٹے کے پیچھے بدحالوں میں گھومتی رہتیں۔ سب کی لعن طعن سنتیں۔ میں نے کبھی انہیں مکمل خوب صورت لباس میں نہیں دیکھا۔ الٹے پلٹے کپڑے، ان کے جسم سے بو آجاتی تھی۔ پھر سب لوگ انہیں باتیں سناتے۔ مجھے عدینہ کا بناؤ سنگھار بہت بھاتا تھا۔ کسی بھی اجڑے حال کی عورت دیکھ کر آج بھی میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔

مجھے وہم ہو گیا تھا جو عورت زندگی کی دلچسپیوں سے منہ موڑ لیتی ہے۔ ایک روز اس سے زندگی بھی منہ موڑ لیتی ہے۔

میرے باپ نے ان سے نفرت کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ ان کے لیے فقط باعث شرمندگی تھیں۔ وہ اتنی خوب صورت عورت تھیں کہ میں نے ان سا حسن کبھی نہیں دیکھا۔ مگر...

تمہیں پتا ہے ان کے مرنے کے بعد میرے والد کی زندگی سنور گئی گویا۔ انہیں چلبلی، بجی سجی شہری بیوی مل گئی۔ ان کی نئی فیملی لائف شروع ہو گئی۔ میں ڈر گیا تھا۔ بشائر! کہیں میں تم سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤں۔ جیسے... عدینہ کے بعد تمہیں بھی... کھو... میرے لیے۔"

شدید ضبط کے باعث اس کی کنپٹی کی رگ پھول رہی تھی۔ جبڑے بھینچے تھے۔

"مجھے عدینہ سے... میں تو آج تک اس بات کو تسلیم نہ کر سکا کہ میں اسے کھو چکا ہوں۔ وہ میری کبھی نہیں ہو سکتی وہ۔"

"آپ اسے اپنا سکتے ہیں ماموں!" اس نے اپنا گلا صاف کیا اور ذہن و دل بھی... اس نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔

ماموں نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اس کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ آرکی۔ وہ جیسے اس پل کسی بڑے اذیت بھرے کچوکے لگاتے خیال کو جھیل رہا تھا۔ خاموشی کا ایک بعید بھرا پل آن رکا۔

"مجھے اسے اپنانا ہوتا تو چھوڑتا ہی کیوں؟"

"آپ اسے اپنا سکتے ہیں۔ میں بقائمی ہوش و حواس بہ رضا و رغبت اجازت دے رہی ہوں۔" وہ زور دے کر بولی۔ "کوئی تو بامراد رہے۔ کوئی تو دل بھر کے خوش ہو۔"

"میں اسے نہیں اپنا سکتا بشائر کبھی بھی۔" وہ کرسی کی ہتھی پر ہاتھ مار کر بولا۔

"کیوں نہیں اپنا سکتے۔ جس شے سے بھاگ رہے تھے۔ جس کی پلاننگ کی تھی۔ جس سے بچنا چاہتے تھے۔ مجھ سے شادی کے بعد بھی... آپ کو وہی تو ملا تھا۔" وہ ذرا سا اونچا بولی "ایک عون... جیسا بچہ۔"

"میں نے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی۔" وہ اتنی زور سے بولا کہ وہ تھرا اٹھی۔ "ہاں مگر یہ سوچا ضرور تھا کہ ہمارے ہاں صحت مند اولاد جنم لے گی۔ مگر عدینہ کو اس لیے نہیں چھوڑا کہ اس سے شادی کی صورت بچے پیدا ہوں گے۔ میں نے اسے اس لیے چھوڑ دیا تاکہ وہ اولاد کے اس دکھ کو کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔ میں نے اپنی ماں کو اس غم میں روتے، گھلتے اور مرتے دیکھا تھا۔ اسے بچے بہت پسند تھے۔ وہ اس پر کبھی راضی نہ ہوتی کہ ہم بس میاں، بیوی بن کر رہیں۔ میں نے عدینہ سے سچی محبت کی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا غم دے کر بہت بڑے غم سے بچانے کے لیے اسے چھوڑ دیا تھا۔ راستہ بدل لیا تھا۔"

اس نے بالآخر کہہ دیا اصل سچ۔

"ماموں..." بشائر ششدر رہ گئی۔ حیرت انگیز انکشاف نے اس کے نقش بگاڑ دیے تھے۔ آسمان سا ٹوٹا تھا سر پر۔

"تو... ابھی... آپ آدھا سچ کیوں بول کر آئے۔ اسے پوری بات بتاتے نا؟" وہ بمشکل بولی۔ "وہ آپ سے نفرت کرے گی، آپ کو الزام..."

"اس کے لیے اتنا ہی سچ ضروری تھا۔ مزید ایک لفظ بھی نہیں بشائر! میرا پورا سچ اس کے آگے کے روشن راستے کو تاریکی میں بدل دے گا۔"

"کک... کون سا روشن راستہ؟" اس نے عجلت میں بات کاٹی۔

"بخت... بخت شاہ!" ماموں نے دھماکہ کیا۔

"تو... آپ جانتے... جانتے ہیں۔" وہ بھونچکی رہ گئی۔

"ہاں... ہمیشہ سے... عدینہ کو زندگی بھر اس ادھورے سچ کے ساتھ جینا ہو گا۔ وہ جتنی زیادہ مجھ سے نفرت کرے گی، اتنی ہی جلدی نئے راستہ پر قدم بڑھائے گی۔ اسے متنفر ہی رہنے دو۔ میں اپنی خودغرضی اور دل کے ہاتھوں اسے مزید بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ یہ طے ہے کہ مجھے اسے نہیں اپنانا تھا۔ بلکہ وہ میرے لیے تھی ہی نہیں اور پورا سچ یہ بھی ہے کہ تم ہو اور مجھے تم سے بھی محبت ہو چکی ہے۔ اتنی نہیں... مگر پھر بھی..."

بشائر کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ سن رہ گئی۔ زندگی میں ایسا موڑ۔

اپنے اپنے خول میں اپنے حساب سے جیتے ایک دوسرے سے انجان لوگ... ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے دو اجنبی... اس نے اس شخص سے محبت کی تھی اور نفرت نہ کرنے پر اپنے دل کو مجبور پایا تھا۔

وہ اس سے محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ آدھی ادھوری ہی سہی۔ مگر تھی تو...

صبح وہ قابل نفرت لگ رہا تھا اور اب قابل رحم؟

ہاں اب اسے اس پر ترس آرہا تھا۔ اس کے دکھوں پر رونے کی خواہش بے حال کر رہی تھی اور اگر آج یہ پل نہ آتا تو کیا وہ باقی کی ساری زندگی بھی ایک دوسرے کی سچائی سے انجان رہ کر گزار دیتے؟ اس شخص کا ایک ایک روپ، رویہ ایک کے بعد ایک آنکھوں سے گزرنے لگا۔

کیسے گزارے یہ ماہ و سال... لباس سے جسم جیسی قربت رکھنے والا یہ رشتہ اور وہ جان نہ سکی کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے اور اسے کھونے سے ڈرتا ہے۔ اور وہ جان نہ سکا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھی، ہمیشہ سے کس بندھن کو جی رہے تھے وہ دونوں؟

لاعلمی، بدگمانی، خیال، کیا کیا تھا اس رشتے میں۔

"پتا ہے میں سائیکاٹرسٹ کے پاس بھی گیا تھا۔" اس نے بشائر کی سماعت پر بم پھوڑا۔ "میں آج تک اپنے اور عون کے رشتے کو سمجھ نہیں سکا۔ میں نے بہت سوچا۔ مگر خدا کی قسم میں نے کبھی اس سے نفرت نہیں کی۔ لیکن میں ہمیشہ ڈرتا رہا... کہ کہیں..." وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"میں اس سے نفرت کرنے نہ لگ جاؤں۔ سب کہتے تھے میں ابصار احمد جیسا ہوں۔ لیکن میں ان جیسا بننا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے خیال آتا تھا کہ اسے سامنے دیکھ کر میں بھی کہیں اپنے باپ کی طرح اس سے گھن نہ کھاؤں۔ اس سے اکتا جاؤں۔ یا... میں بھی اسے کسی روز گاڑی میں ڈال کے کہیں دور پھینک نہ آؤں... اور اس کا تو پھر کوئی بھائی بھی نہیں جو اسے ڈھونڈنے جائے گا۔ لیکن بھائی ہونے کی کیا بات۔

مونس کا تو بھائی تھا نا۔ مامون ابصار' وہ بھی اسے ڈھونڈ نہ پایا۔"

اس نے بچوں کی سی بے تابی سے بشائر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں نے اسے بہت ڈھونڈا بشائر' ہر جگہ' ہر شہر۔ سب وسائل خرچ کیے۔ مگر وہ۔ میں نے امی سے کہا تھا۔ میں اسے ڈھونڈ کرلاؤں گا۔ لیکن میں نہیں ڈھونڈ سکا۔ میں۔۔۔ انہیں کیا جواب دوں گا؟ میں نے اسے کھو دیا۔"

اس کی خوب صورت آنکھوں میں مایوسی' تکلیف' شرمندگی' ناکامی کی ایسی دلخراش تحریر تھی کہ پڑھنے والی ہر آنکھ نم ہوجائے وہ کسی معصوم بچے کی طرح بشائر سے جواب کا متمنی تھا۔

کتنے شکوے تھے' کتنے ارمان' کتنے سوال اور کتنے حساب نکلتے تھے اس بے درد شخص کی طرف۔ مگر۔۔۔

انہیں اپنے رشتے کی نئی شروعات رکھنی تھی۔ ایسا آغاز جس میں وہ ایک دوسرے کے غم گسار ہوں۔ باقی سب بعد میں۔۔۔ بشائر نے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے تھامے کھڑی ہوگئی۔

"آئیں میرے ساتھ۔" وہ چونکا۔ مگر ہاتھ کھینچنے پر کھڑا ہوگیا۔

"کہاں؟"

"آپ آئیں تو۔" وہ کمرے سے نکل پڑی۔ وہ کسی ٹرانس میں پیچھے کھینچا ہوا چلتا تھا۔ دونوں ننگے پیر تھے۔

عون کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ مامون کو دیکھ مسکرائی۔ مگر مامون کی آنکھوں میں خوف زدگی بڑھ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ بشائر نے اپنی گرفت سخت کی۔ "اوں۔۔۔ ہوں۔"

"بشائر! میں اندر۔۔۔ نہیں جاسکتا۔" وہ بے بس لہجے میں بولا۔ "ہمارے گھر کے اس کمرے میں زنجیروں میں گنجے سر کا ایک بچہ تھا۔ وہاں بو تھی۔ وہ بہت خوف ناک آواز میں رویا کرتا تھا۔ وہ بھوکا تھا۔ اس کمرے میں گندگی تھی اور اندھیرا سیاہ۔"

مامون شدید خوف زدہ لگ رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر با آواز رو دیا۔

بشائر کا دل پھٹ جانے کو تھا۔ مگر بس یہی پل تھا ایک آغاز کا' یقین دہانی کا' ایک نئے رشتے کا۔ قابل رحم نظر آتا یہ شخص۔۔۔ اس کا دل رو رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ وہ ایسے کمرے میں رہتا تھا۔ مگر جب میں اسے لے کر آئی نا۔۔۔ تو میں نے اسے اپنے طریقے سے رکھا۔ آپ آئیں نا اندر۔" اس نے ناب گھمادی۔

شام ڈھل چکی تھی۔ کمرے کی روشنیاں جل رہی تھیں۔

ہلکے نیلے' پیلے' جامنی اور سفید رنگ کے در و دیوار میں تازگی اور پاکیزگی تھی۔ ایئر فریشنر کی بھینی خوشبو نے ماحول معطر کر رکھا تھا۔ مگر پھر بھی تازہ گلابوں کے گلدستے سے پھوٹتی خوشبو نمایاں تھی۔

عون اپنے بیڈ پر نہیں تھا۔ وہ دیوار گیر ایکوریم کے بالکل ساتھ وہیل چیئر جوڑ کر بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ شیشے سے چپکا تھا اور ایکوریم کے اندر سے گہرے سیاہ اور مہون رنگ کے امتزاج کی چھوٹے سائز کی خوب صورت مچھلیاں جیسے ہاتھ کو چوم رہی تھیں۔ پورا جھنڈ ہاتھ کے گرد اکٹھا تھا۔ ہولے ہولے منہ کھول کر سانس نکالتی' دم کو ہلاتی مچھلیاں۔

عون بہت پرسکون تھا۔ وہ گرد و پیش سے بے گانہ مچھلیوں پر ٹکٹکی باندھے بیٹھا تھا۔ سفید ٹی شرٹ پر بلو لمبی نیکر۔۔۔ مامون کے لباس کا بھی یہی امتزاج تھا۔ عون کے بے حد سلکی بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ وہ گھٹنے موڑ کر عون کی وہیل چیئر کے سامنے بیٹھ گئی۔ مامون کا ہاتھ ابھی تک ہاتھ میں تھا۔ اسے تقلید کرنا پڑی۔

"یہ۔۔۔!" اس نے عون کا ہاتھ مامون کے ہاتھ میں دیا۔

"یہ مونس۔۔۔" اس نے بتایا۔

"مگر۔۔۔ یہ تو۔۔۔ عون۔۔۔" وہ ارد گرد سے بے گانہ تندرست بچے کو حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔

"اونہوں۔۔۔ عون۔۔۔ نہیں۔۔۔ مونس۔۔۔ یہ مونس ہے۔ وہ مونس تھا۔" وہ ماننے کو تیار نہیں تھا' بحث پر اتر آیا۔

"لیکن وہ ایسا نہیں تھا۔ وہ تو بہت کمزور تھا' بہت گندا سندا۔۔۔ شور کرتا۔" مامون کسی ٹرانس میں تھا۔

"ہاں۔۔۔ ایسا ہی تھا۔ مگر جب مجھے ملا تو میں نے اسے ایسا کردیا۔" وہ مسکرائی۔

"تمہیں کہاں ملا۔ جبکہ میں نے تو ہر جگہ۔۔۔"

"آپ کی طلب سچی تھی نا مامون۔۔۔ اسے تو فرشتے کہیں اوپر لے گئے۔ لیکن آپ کے لیے اسے دے گئے۔"

"تمہیں کیوں۔۔۔ ڈھونڈ تو میں رہا تھا اور یہ تو عون ہے۔

"فرشتوں کو بھی لگا آپ ابصار احمد ہیں اور میں انہیں شاید مریم لگی ہوں گی۔"

"فرشتے بیٹا ہمیشہ مریم ہی کو دے کر جاتے ہیں مامون!" اس کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز تھا۔ اس نے بہت گہری بات کہی۔

"لیکن میں ابصار احمد نہیں تھا۔" مامون اپنے ٹرانس سے ابھرا۔ وہ جیسے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ جھٹکا کھا کر چونکا۔ وہ بغور عون کو دیکھ رہا تھا۔ بے یقینی سے۔

"مامون! آپ ابصار احمد سے نفرت نہ کریں ان حالات پر غور کریں تو آپ کو لگے گا کہ وہ بھی غلط نہیں تھے۔ بس انہیں حالات کو ہینڈل کرنا نہ آیا۔ انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی لیکن آپ ابصار احمد نہیں ہیں۔ آپ مامون ہیں اور یہ عون میں بشائر۔۔۔ ہم بہت الگ ہیں پچھلوں سے۔" اس نے اپنا گال عون کے گھٹنے پر ٹکائے ہوئے سکون آمیز انداز میں آنکھیں موندیں۔

عون کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ بشائر کی بھی۔ اسے اس کمرے میں آکر ہمیشہ سکون بھری نیند گھیر لیا کرتی تھی۔

مامون نے بے یقینی کے عالم میں اس کے چہرے کی طمانیت دیکھی۔ عجیب بات تھی اس کے بے چین دل کو قرار سا مل رہا تھا۔ ناقابل فہم سا سکون۔

"اچھا آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے اگر ہمیں ایک اور بیٹا دیا تو ہم اس کا نام مونس رکھ لیں گے۔" وہ نیند کی وادیوں میں کھونے والی تھی۔ تھکاوٹ صبح سے اب تک کی یا آٹھ سالوں کی؟

مامون بری طرح چونکا۔ وہ بشائر کی طلب سے واقف تھا۔ ایک اور بچہ۔۔۔

"اور اگر وہ۔۔۔ وہ بھی ایسا نکلا۔۔۔ تت۔۔۔ تو۔۔۔؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

بشائر نے نیند سے بوجھل پلکیں چونک کر اٹھائیں۔ وہ مامون کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ مامون کا ہاتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس نے اس کے زانو پر ہاتھ رکھا۔ تسلی آمیز انداز میں تھپکا۔

"تو کیا ہوا۔ ہماری اولاد ہوگا۔" اس کے جملے میں بشاشت تھی۔ مگر آنکھوں میں نمی سی چمکی۔ اس نے اس بار بے فکری سے آنکھیں موندی تھیں۔

"ان اللہ علی کل شی قدیر۔" وہ زیر لب بولی۔

"اور اللہ بندے سے اتنے ہی کامل یقین اور بے فکری کا خواہاں ہوتا ہے۔"

فیصلے کا اختیار اللہ کو سونپ دیا جائے تو اتنی ہی آسودگی ملتی ہے جتنی اس وقت بشائر کے چہرے پر تھی۔ مامون نے رشک سے اسے دیکھا۔ بعض باتیں دیر سے سمجھ میں آتی ہیں۔ مگر دعا مانگنی چاہیے کہ سمجھ میں آجائیں۔

دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں۔

کچھ وہ جو اللہ پر توکل کرکے زندگی گزارتے ہیں۔

اور کچھ وہ جو خدشات میں گھرے رہتے ہیں۔۔۔

گزر دونوں کی جاتی ہے۔

مگر۔۔۔

توکل کرنے والے کی روح و قلب اتنا ہلکا' بے وزن ہوتا ہے۔

جیسے ٹھہرے پانی کے سینے کے اوپر تیرتا پر۔

نہ منزلوں کو، نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ترے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دُنیا ہے
یہ سیر چشم مگر کب ادھر کو دیکھتے ہیں

وہ بے خبر مری آنکھوں کا صبر بھی دیکھیں
جو طنز سے مرے دامانِ تر کو دیکھتے ہیں

یہ جان کنی کی گھڑی کیا ٹھہر گئی ہے کہ ہم
کبھی قضا کو کبھی چارہ گر کو دیکھتے ہیں

ہماری دربدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

احمد فراز

کتنا اور وقت چاہیے؟

خواہشوں کے گھنے جنگل میں
انتظار کے قیامت لمحوں سے
تھک ہار کر ہزار بار دل پوچھے
اور کتنا انتظار کرنا ہے
اور کتنا تنہا چلنا ہے؟
منزل کہاں ہے؟
جستجو میں جس کی جیسے جا رہے ہیں
ہجر کا زہر، جدائی کا قہر
تنہا سہے جا رہے ہیں
کیا خبر ہے اُسے؟
کیا آئے گا وقتِ ملن؟
تعبیر پانے کو
امید بر آنے کو
اور کتنا وقت چاہیے؟
کتنا اور وقت چاہیے؟

حنا کنول

اس کا انکار بھی حق تھا سراسر میرے
یہ جو حالات ہوئے جاتے ہیں بہتر میرے

وہ کوئی چاند کا ٹکڑا ابھی نہیں تھا لیکن
چاندنی اس کی بھی رہتی ہے اندر میرے

میں اکیلا تھا سو اس معرکے میں کام آیا
اور پیچھے ہی کہیں رہ گئے لشکر میرے

ڈوبتا بھی نہیں، ساحل پہ اُترتا بھی نہیں
ناز کرتا ہے سفینے پہ سمندر میرے

روشنی میں جو مسلسل نہیں رہ سکتا میں
ساتھ ہوتی ہے کوئی شام بھی دن بھر میرے

سوکھ جاتا ہے یہ بہتا ہوا پانی اکثر
اور ہر بار نکل آتے ہیں پتھر میرے

دھیان رکھتا ہوں ظفر زخم تماشا کا بہت
پھر بھی ٹانکے کئی کھل جاتے ہیں اکثر میرے

ظفر اقبال

ہار

جانے کیوں رات کے کسی لمحے
کسی واہمے سے اچانک
میری آنکھ کھل جاتی ہے
وہ بھیگا ہوا چہرہ جانے کیوں
یاد آنے لگتا ہے
وہ ساحل کے کنارے بیٹھی
بھیگی آنکھوں والی لڑکی
مسکراتے ہوئے
رات کے اُس لمحے مجھ سے
کہتی ہے
چاہتیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں
سنو!
تم ہار گئے

پونا عشرت عمرانی

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"معراج کی رات میں نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔

"صدقے کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔"

میں نے کہا۔" اے جبرئیلؑ! کیا وجہ ہے کہ قرض صدقے سے بھی زیادہ افضل ہے؟"

انہوں نے کہا۔" اس لیے کہ سائل (بعض اوقات) سوال کرتا ہے حالانکہ اس کے پاس (اس کی ضرورت کا مال) موجود ہوتا ہے جبکہ قرض لینے والا ضرورت (اور مجبوری) کی حالت میں ہی قرض لیتا ہے کیونکہ قرض کی واپسی تو ضروری ہے اس لیے مجبوری کے وقت ہی لیا جاتا ہے۔

فرمان حضرت علیؓ،

- جس شخص کے دشمن نہیں ہیں اور سب دوست ہیں اس جیسا منافق کوئی نہیں کیونکہ دشمن اس کے ہوتے ہیں جو حق کی بات کہتا ہے۔
- زمانہ برے لوگوں کی برائی کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے خراب ہوتا ہے۔

اقراء اکرم ۔ گاؤں سلیاں شریف

بے وقوف،

ایک بادشاہ نے کسی فقیر کو دربار میں بلایا اور اسے ایک ہار دے کر کہنے لگا۔

"یہاں جتنے آدمی بیٹھے ہیں، ان میں جو بھی تمہیں بے وقوف لگے یہ ہار اس کے گلے میں ڈال دو۔"

فقیر نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور کہنے لگا۔

"مجھے کوئی بے وقوف ملے گا تو اس کے گلے میں ہار ڈال دوں گا۔"

کچھ دن گزرے۔ بادشاہ سخت بیمار ہو گیا۔ فقیر کو پتا چلا تو وہ حاضر خدمت ہوا اور کہنے لگا۔

"بادشاہ سلامت! جب آپ دورے پر جاتے ہیں تو لوگ راستے میں پھول بچھاتے جاتے ہیں۔ عیش و طرب کا سامان ہوتا ہے۔ آپ کے تصور سے زیادہ آپ کا عزت و احترام کیا جاتا ہے مگر آپ دورے پر سے واپس آجاتے ہیں۔ اب آپ ایسے دورے پر جا رہے ہیں جہاں سے واپس نہیں آئیں گے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا عمل کیا ہے کہ رب العزت نے وہاں ایسا ہی انتظام کیا ہو؟"

بادشاہ کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ کف افسوس ملتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں نے اس سلسلے میں کبھی نہیں سوچا۔"

فقیر نے کہا۔" اللہ نے تم کو عزت، شہرت، دولت ہر چیز سے نوازا مگر تم نے اس کا شکر ادا نہیں کیا۔ تم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔"

یہ کہہ کر فقیر نے ہار نکالا اور اسے بادشاہ کے گلے میں ڈال دیا۔

فوزیہ ثمر بٹ ۔ گجرات

وجہ،

ایک شاعر نے اپنا شعری مجموعہ چھپوانے کے لیے پبلشر کو بھیجا، جس کا عنوان تھا۔

"میں کیوں زندہ ہوں؟"

کچھ دنوں میں ہی پبلشر کا جواب آگیا۔

"اس لیے کہ تم نے اپنا کلام ڈاک کے ذریعے بھیجا تھا۔"

حمیرا صفدر ۔ سیال مرالی

بزندون،

عباسی خلیفہ مامون نے جب روم چشمہ بزندون کے کنارے پر پڑاؤ کیا تو چشمے کی ٹھنڈک، صفائی، خوشبو اور اس مقام کی سرسبزی اسے بہت پسند آئی۔ اس نے چشمے میں ایک مچھلی دیکھی جو چاندی کی طرح سفید اور چمک دار تھی۔ خلیفہ نے اس مچھلی کو پکڑنے کا حکم دیا لیکن کسی کو چشمے کے سرد پانی میں اترنے کی ہمت نہ ہوئی — آخر کار مامون نے کہا۔

"جو اس مچھلی کو پکڑ کر لائے گا اسے شاہی تلوار دی جائے گی۔"

ایک فراش نے ہمت کی اور چشمے میں کود کر مچھلی پکڑ لی۔ وہ ابھی کنارے تک نہ پہنچنے پایا تھا کہ مچھلی تڑپ کر اس کے ہاتھ سے نکل گئی جس کے اچھل کر چشمے میں گرنے کے سبب مامون کے کپڑوں اور سینے وغیرہ پر چھینٹے آئے۔ فراش دوبارہ چشمے میں اترا اور اسی مچھلی کو پکڑ لایا۔ مامون نے اسی مچھلی کو فوراً" تل کر لانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد فوراً" مامون کو سردی لگنے لگی اور وہ لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں اسے سخت بخار ہو گیا۔ وہ بخار میں کپکپانے لگا اور ہذیان بکنے لگا۔ اسے اتنی سخت سردی لگی کہ مجبوراً" اس کے اطراف آگ جلائی گئی۔ اسی دوران میں مچھلی تل کر آگئی۔ ابھی اس نے مچھلی چکھی بھی نہ تھی کہ اس پر موت کے آثار طاری ہو گئے۔

مامون کو کچھ دیر بعد ہوش آیا تو اس نے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

بزندون۔" جواب دیا گیا۔

"عربی زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے؟" مامون نے سوال کیا۔

"پاؤں پھیلانا۔" جواب دیا گیا۔

پھر مامون نے اس علاقے کا نام پوچھا جو "رقہ" بتایا گیا۔

یہ سن کر مامون نے کہا۔

"میری پیدائش کے وقت نجومیوں نے کہا تھا کہ میری موت "رقہ" میں ہوگی۔"

واقعہ یہ ہے کہ مامون ہمیشہ اس مقام سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا مگر اس کی موت اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ اس کا انتقال وہیں ہوا مگر اس کی لاش "طرسوس" لا کر دفن کی گئی۔

ہمزہ، اقراٴ ۔ کراچی

اچھی بات،

دوسروں کے چراغ سے روشنی حاصل کرنے والے ہمیشہ اندھیروں میں رہتے ہیں اس لیے ہمیشہ اپنا ہی چراغ اوچا ہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو کیونکہ پھر ساری کائنات زہر امل کر بھی اسے بجھا نہیں سکے گا۔

صبا قبیر ۔ گجرات

اظہار افسوس،

ایک ٹیسٹ میچ میں ملک کا مایہ ناز کھلاڑی پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہو گیا تو وکٹ کیپر کو بہت افسوس ہوا اور وہ ازراہ ہمدردی بول اٹھا۔

"کوئی بات نہیں دوست! کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے، اب دیکھو نا۔ پچھلے میچ میں آپ نے بالروں کی خوب ٹھکائی کر کے ڈبل سنچری مکمل کی تھی۔"

"ہاں ہاں بھئی! میں پہلی اننگ میں خوب جم کر کھیلا تھا۔ اور جب آؤٹ ہو کر واپس پویلین پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ کھانے پینے کی تمام اشیاء اور مشروبات تمام ٹیم ختم کر چکی تھی اور مجھے بھوکا رہنا پڑا تھا۔" مایہ ناز کھلاڑی نے جواب دیا۔

مسرت الطاف احمد ۔ کراچی

اک بار کہو،

- اس آس کا انجام سب سے تکلیف دہ ہوتا ہے جو کسی کم ظرف سے لگائی جائے۔
- محبت کا جواب محبت نہیں، عزت ہوا کرتی ہے چاہے وہ محبت دے کر کی جائے یا پھر چھپا کر۔
- ہم مشرقی لوگ محبت میں ملکیت کے قائل ہوا کرتے ہیں۔

وہ محبت اظہار نہیں مانگتی مگر کبھی کبھی اظہار کر دینا چاہیے۔ دوسروں کو مطمئن کرنے کے لیے۔
نوشابہ منظور۔ بھریا روڈ

گارنٹی

ایک سگریٹ ساز کمپنی نے سگریٹ کا نیا برانڈ مارکیٹ میں لاتے وقت اشتہار دیا۔
"اسے پینے والا بوڑھا نہیں ہو سکتا، اسے زیادہ امراض نہیں ہو سکتے اور اس کے گھر میں چوری نہیں ہو سکتی۔"
اس اشتہار کو گمراہ کن قرار دیتے ہوئے ایک ادارے نے سگریٹ ساز کمپنی پر مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت نے کمپنی کو صفائی پیش کرنے کا حکم دیا۔ کمپنی کے نمائندے نے جج سے کہا۔
"جناب! اس اشتہار میں کہیں بھی کوئی غلط بیانی نہیں کی گئی اور کمپنی کے تمام دعوے درست ہیں۔"
جج نے پوچھا۔"سگریٹ پینے سے چوری کی وارداتوں کا اندیشہ نہیں رہتا، وہ کیسے؟"
کمپنی کے نمائندے نے بتایا۔"سگریٹ پینے والے ساری رات کھانستے رہتے ہیں۔ چور سمجھتے ہیں کہ وہ جاگ رہے ہیں، اس لیے چوری کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"
عدالت نے استفسار کیا۔"اچھا سگریٹ پینے والا بوڑھا کیوں نہیں ہوتا؟"
نمائندے نے بتایا۔"وہ بوڑھا اس لیے نہیں ہوتا کہ جوانی میں ہی فوت ہو جاتا ہے۔"
عدالت نے پوچھا۔"سگریٹ پینے والوں کو زیادہ بیماریاں کیسے لاحق نہیں ہوتیں؟"
نمائندے نے عرض کی۔"زیادہ عمر نہیں ہو گی تو زیادہ بیماریاں بھی نہیں ہوں گی، پھر کینسر اور دل کی بیماریوں کے بعد کسی اور مرض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔"
اور یوں سگریٹ ساز کمپنی غلط بیانی کے الزام سے بری ہو گئی۔
تحریم، عائشہ۔ گوجرہ

غصہ

غصے کے وقت اک برداشت کا لمحہ تمہیں ہزار بار شرمندہ ہونے سے بچا سکتا ہے۔
مدیحہ نورین۔ برنالی

دھمکی

یہاں مرغی کسی کی ہو مگر انڈے ہمارے ہیں
اگر گڑبڑ کسی نے کی تو پھر ڈنڈے ہمارے ہیں
سپر پاور ہمیں مانو وگرنہ سوچ لو اتنا
یہ بھارت اور اسرائیل مسٹنڈے ہمارے ہیں

سچ کی آگ

چبھتے ہوئے وہ لفظ، وہ جلتے ہوئے حروف
شہ رگ میں اب بھی ہیں وہی کانٹے اڑے ہوئے
اک بار سچ کہا تھا مگر اس کی آگ سے
اب تک مری زباں پہ ہیں چھالے پڑے ہوئے
ظل ہما۔ فیصل آباد

قطرہ قطرہ شبنم

- اگر بے وقوف بازار نہ جائیں تو بری چیزوں کو کون خریدے۔ (ڈالسن)
- صبر کرنے والے کے غصے سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔ (جان ڈرائی ڈن)
- زندگی کا مقصد مسرت نہیں بلکہ تکمیل انسانیت ہے۔ (ہیگل)
- ماہر وہ شخص ہوتا ہے جو چھوٹی غلطیاں نہیں کرتا بلکہ بڑی غلطی کرتا ہے۔ (بنجمن سٹال برگ)
- عظمت کی طرف کوئی پھولوں بھرا راستہ نہیں جاتا۔ (فونٹین)
- انا کا مضبوط ترین خول ہمیشہ محبت توڑتی ہے۔ (خلیل جبران)
- دردِ سر کا علاج تاج سے نہیں ہوتا۔ (بطلیموس)
- میں جنگ ہار سکتا ہوں مگر وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ (نپولین بونا پارٹ)



خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

فارحہ اقبال ـــــــ کراچی

جی اٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے
یاں بھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے
ہے اداسی شبِ ماتم کی سہانی کیسی
چھاؤں میں تاروں کی نکلے ہیں سنورنے والے

انیقہ انا ـــــــ چکوال

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

ہم کو تو عمر کھا گئی خیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا ہے کیا ہوئے یار کے خدوخال بھی
اب کے فراز وہ ہوا جس کا نہ تھا گمان تک
پہلی سی دوستی تو کیا، ختم ہے بول چال بھی

سمیرا اقبال ـــــــ کراچی

اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹا دیں
کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لیے ہیں
آنکھوں میں بھر لو گے تو کانٹوں سے چبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں

ثمرین اکرام ـــــــ میرپور خاص

ہائے اک شخص جسے ہم نے بھلایا بھی نہیں
یاد آنے کی طرح یاد وہ آیا بھی نہیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی ہمیں طلب تیری
سر پہ سورج بھی نہیں، راہ میں سایہ بھی نہیں

ثمینہ اکرم ـــــــ کراچی

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے!
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

نوال افضل گھمن ـــــــ گجرات

زندگی! اس سے زیادہ تو نہیں عمر تری
بس کسی دوست کے ملنے سے جدا ہونے تک

فریحہ شبیر ـــــــ شاہ نکڈر

حکم وہی جو ہم دے نہ سکے
عرض وہی جو آپ سنتے نہیں

آمنہ اجالا ـــــــ ڈہرکی

بہا لے گیا سیلاب کشتیاں اور پھول
ہمیشہ ساتھ رہیں گی یہ آندھیاں اور پھول
مجھے خبر ہے یہی ہے تجھے دلوں کی خوشی
رکھوں گی میں بھی کتابوں میں پتیاں اور پھول

عاصمہ رمضان ـــــــ گجرات

ہر روز میرے آنگن میں اک ماتم برپا ہوتا ہے
اک خواب ٹوٹ جانے پر، کوئی ساری رات روتا ہے

ثانیہ نصر ـــــــ فیصل آباد

عجب ہجر پرستی تھی اس کی فطرت میں
شجر کے ٹوٹے پتے تلاش کرتا تھا
تمام رات پردے ہٹا کر چاند کے ساتھ
جو کھو گئے وہ لمحے تلاش کرتا تھا

نفیسہ اکرم، سندس الیاس ـــــــ بھرتھانوالہ

اک ہجر تھا جس نے بتا دی تمام عمر
اک پل تھا ہم نے جس کو زمانہ بنا لیا
بادل اتر کے آ گئے آنکھوں کے آس پاس
بارش نے میرے دل کو نشانہ بنا لیا

طاہرہ ملک ـــــــ پسرور

یوں مجھ کو نگاہوں کے ترازو میں نہ تولو
ہے شوق تو بے ساختہ آنکھوں میں سمو لو
اب کے دل کو میں لایا ہوں ہتھیلی پہ سجا کے
اس حسن کے بازار میں کیا دام ہیں، لو لو

مدیحہ نورین ـــــــ برنالی

تفتیش چھوڑو بس اتنا سنو
تم بچھڑ گئے اور ہم بکھر گئے

نوشابہ منظور ـــــــ بھریا روڈ

ہم عجیب طرز کے لوگ تھے، ہمارے اور ہی روگ تھے
میں خزاں میں اس کی منتظر، اسے انتظار بہار تھا
میری لمحے بھر کی بھی گفتگو اس سے نہ ہو سکی کبھی
مجھے فرصتیں نہ مل سکیں، وہ ہوا کے رتھ پر سوار تھا

حمیرا صفدر ـــــــ سیال مرالی

زندگی بھر اداس رہنا ہے
سوچتا ہوں تو مسکراتا ہوں

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ

کیسے ممکن تھا کسی شخص کو اپنا کرتے
آئینہ لوگ تھے کیا لوگوں سے دھوکا کرتے
ہنستے پھرتے تھے سر بزم انا کی خاطر
ورنہ حالات تو ایسے تھے کہ رویا کرتے

سیدہ لوبا سجاد ـــــــ کہروڑپکا

دل تھا اکیلا اور غم ہیں ہزاروں
اکیلے کو مل کر ہزاروں نے لوٹا

ارم احمد ـــــــ گاؤں لاوہ

اسی کا شہر، وہی مدعی، وہی منصف
مجھے یقین تھا میرا ہی قصور نکلے گا

فوزیہ کاشف ـــــــ فیصل آباد

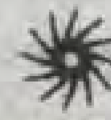
ہزار جام تصدق ہزار مے خانے
نگاہِ یار کی لذت شراب کیا جانے

نمرہ، اقرا ـــــــ کراچی

جو بات کبھی نہ کہنی تھی وہ بات منہ سے نکل گئی
جو لفظ تجھ سے کہنے تھے وہ دل کے گوشے میں رہ گئے
خواب خواب تھی زندگی، خواب خواب تھی ہر خوشی
میرے خواب مٹی کے گھر تھے جو پہلی بارش میں بہہ گئے

فوزیہ حمید ـــــــ واہ کینٹ

ادھورا ہے ہر اک سپنا ہمارا
کبھی جھولے، کبھی ساون نہیں ہے
یہ مر جاتی ہے اپنی موت خود ہی
محبت کا کوئی دشمن نہیں ہے



امت الصبور

خوب صورت کی ڈائری

سحرش خان کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ خوب صورت غزل آپ سب ہی پڑھنے والوں کے نام۔

ہمارے بعد سفیرِ صبا ہے آخر کون
تلاشِ منزلِ جاناں میں ہے مسافر کون

رہینِ خلوتِ شب، چاندنی سے پوچھ کبھی
کہ شہر شہر بھٹکتا ہے تیری خاطر کون

ہمیں عزیز تھی مقتل کی آبرو ورنہ
میرے جہاں میں ہے اپنے لہو کا تاجر کون

ہمی نے شیخ کا پندارِ خودسری توڑا
وگرنہ اس کی نظر میں نہیں تھا کافر کون

سخن وری ہمیں وجہِ شرف نہیں محسن
مگر ہمارے سوا شہر میں ہے شاعر کون

نمرہ، اقراء کی ڈائری سے

بہادر شاہ ظفر کے کلام میں حسرت و یاس کا رنگ نمایاں ہے۔ قارئین کے لیے ان کی غزلیات میں سے ایک منتخب غزل۔

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
میرے دل کو داغ لگا گئے وہ نیا شگوفہ کھلا گئے

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیوں کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

میرے پاس آتے تھے دم بدم وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم کہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے

یہی شوق تھا ہمیں دم بدم کہ بہار دیکھیں گے اب کے ہم
جوں ہی چھوٹے قیدِ قفس سے ہم تو سنا خزاں کے دن آ گئے

ماریہ سید واجد علی کی ڈائری سے

جب انسان کسی کو اپنے من کا میت بنا لیتا ہے تو اپنی پوری زندگی صرف اسی کے سنگ گزارنا چاہتا ہے۔ اس کا ہر خواب اپنے محبوب کے حوالے سے ہوتا ہے۔ قوسِ قزح کے ساتوں رنگ اسے اپنے محبوب میں دکھائی دیتے ہیں۔ ذہن و دل پر ہر لمحہ اس کی گرفت محسوس ہوتی ہے۔ پھر وہ چاہے پاس ہو یا دور خود۔ کو ہمہ وقت اس کے پہلو میں پاتا ہے اور ہر پل محبوب کی یاد میں سرشار رہتا ہے۔ محسن چنگیزی کی یہ خوب صورت نظم امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

گوشۂ ذہن میں بے ربط خیالوں کا ہجوم
چشمِ تنہائی سے چن کر وہی بے باک سے اشک
لمحۂ وصل کے اس عہدِ فراموشی کو
یاد کرتا ہے، سسکتا ہے، بلکتا ہے بہت
آج بھی دشتِ مسافت کے کٹھن راستوں میں
جلتی بجھتی ہوئی بے نام رفاقت کی شعاع
عارضِ وقت کی سرخی پہ چھلک پڑتی ہے
پھر سے ملنے کی یہ موہوم طلب اور تڑپ
آج بھی ذہن کے گوشوں میں چمک اٹھتی ہے
آج بھی سوچ کے انگار جزیرے میں تو
آنکھ کے نور میں تو، دل کے سویرے میں تو
اجنبی شام کی دم توڑتی برسات میں تو

ہے لکیروں کی طرح ثبت میرے ہاتھوں میں
میرے ہونٹوں کا تبسم، میرے دن رات میں تو
ہم کلامی کا کوئی واقعہ گزرا بھی نہیں
پھر بھی لگتا ہے موجود ہے ہر بات میں تو
مجھ سے واقف ہی نہیں تیری طبیعت لیکن
طرزِ افکار میں تو، شیوۂ گفتار میں تو

تو ہی تو ہے میرے اطراف کی ہر شے میں پنہاں
کبھی اقرار کا حاصل، کبھی انکار میں تو
کبھی سایہ، کبھی صحرا، کبھی نظروں کا سراب
کبھی شبنم، کبھی نکہت، کبھی رنگ و خوشبو
تو میری نیند، میرا خواب، میری صبح شام
تو مسرت، تو میرا دکھ، تو میرا سب کچھ ہے
تو میرا کچھ بھی نہیں پھر بھی میرا سب کچھ ہے

سدرہ عطاریہ کی ڈائری سے

محبت میں جدائی سہنا مشکل لیکن انا بھی عزیز ہوتی ہے۔ انا اور محبت کی اس کشمکش کو اعتبار ساجد نے اس غزل میں بیان کیا ہے۔

آپس میں بات چیت کی زحمت کیے بغیر
چل رہے ہیں ساتھ شکایت کیے بغیر

آنکھوں سے کر رہے ہیں بیاں اپنی کیفیت
ہونٹوں سے حالِ دل کی وضاحت کیے بغیر

دونوں کو اپنی اپنی انائیں عزیز ہیں
لیکن کسی کو نظرِ ملامت کیے بغیر

ٹھہرا ہوا ہے وقت مراسم کے درمیان
بحرِ خلیج میں کوئی وسعت کیے بغیر

حیراں ہیں کہ اتنے برس کیسے کٹ گئے
رسمی سا کوئی عہدِ رفاقت کیے بغیر

وہ جا نہیں چکے ہیں مگر اس کے باوجود
تنہا کھڑے ہیں ہم اسے رخصت کیے بغیر

چارہ گروں کو دونوں سے پڑتا ہے واسطہ
لیکن کسی کے حق میں خیانت کیے بغیر

★ **کنول شاہین** ★ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر سید وصی شاہ کا یہ خوب صورت سا کلام میری عزیز از جان دوست مینا بلال وڑائچ کے نام کہ جو آج بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ آباد ہے۔ اور ہر آہٹ پر مجھے اسی کی آہٹ کا گماں ہوتا ہے اور اس کی آہٹ کے ساتھ دل و دماغ میں کیا کچھ ہوتا ہے۔

زخم مسکراتے ہیں، اب بھی تیری آہٹ پر
درد بھول جاتے ہیں، اب بھی تیری آہٹ پر

شبنمی ستاروں میں پھول کھلنے لگتے ہیں
چاند مسکراتے ہیں، اب بھی تیری آہٹ پر

عمر کاٹ دی لیکن بچپنا نہیں جاتا
ہم دیے جلاتے ہیں، اب بھی تیری آہٹ پر

گھنٹیاں بجتی ہیں، رقص ہوتے لگتا ہے
درد جگمگاتے ہیں، اب بھی تیری آہٹ پر

تیری یاد آئے تو نیند جاتی رہتی ہے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں، اب بھی تیری آہٹ پر

اب بھی تیری آہٹ پر آس لوٹ آتی ہے
ہم دیے جلاتے ہیں، اب بھی تیری آہٹ پر



دنیا کا کوئی بھی انسان جذبات و احساسات سے خالی نہیں۔ نرم و نازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فقط رنگ رہ جاتا ہے، اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے مول رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو، اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوب صورت ذریعہ۔ اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کر پاتی جو فقط ایک شعر کہہ دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ ”ارے یہ ہی تو میرے دل میں تھا۔“

زندگی کی طویل دھوپ چھاؤں میں بہت سی یادیں، بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر، کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجیے، مگر صرف منظوم پیرائے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہو سکتا ہے، نظم بھی اور غزل بھی۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ وہ شعر جو اکثر آپ کے لبوں پہ رہتا ہے؟

2۔ وہ شعر، نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟

3۔ کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟

4۔ وہ غزل جو آپ نے ٹی وی یا ریڈیو پر سنی تو گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟

5۔ کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سارے

نسیم مغل

(1) دل کی آواز بن کر ہمیشہ جو اشعار لبوں پہ رہے وہ آپ بھی پڑھیں۔

مانتے ہیں کہ جگ میں ہے رواج اور طرح کا
پایا ہے مگر ہم نے بھی مزاج اور طرح کا
اس سے اپنی بنی ہے نہ کبھی بنے گی
ہم اور طرح کے ہیں سماج اور طرح کا

آج کل جو خیال دل و ذہن سے ہوتا ہوا لبوں تک آتا ہے وہ یہ ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی!

(2) اعتبار ساجد کی ایک نظم کے چند خوب صورت مصرعے۔ جس نے ان کی کتاب ”تمہیں کتنا چاہتے ہیں“ سے تعارف دیا۔

کبھی تم نے یہ بھی سوچا
کہ تمہارے دل گرفتہ
تمہیں کتنا چاہتے ہیں
تمہیں زندگی سے بڑھ کر
جو عزیز ہم نے جانا
سو کوئی سبب تو ہوگا
کبھی تم نے یہ بھی سوچا
تمہیں روز و شب کے دکھ میں
کبھی بھولنا بھی چاہیں
تو کبھی نہ بھول پائیں
کہ یہ عہدِ زندگی ہے
جسے توڑنا بھی چاہیں
تو کبھی نہ توڑ پائیں

اسی طرح ارشد ملک کی محبت پہ لکھی گئی دو مختصر سی نظموں نے ان کا تعارف کروایا..... اور ان کا مجموعہ کلام ”دل درد کا ٹکڑا ہے“ خریدنے پر مجبور کیا۔

محبت پھول جیسی ہے
جدا ہو شاخ سے جب یہ
بکھرتی ٹوٹ جاتی ہے

محبت اک سمندر ہے

کہ جتنا بھی کوئی ڈوبے
کنارے پر ہی رہتا ہے

(3) نمبر ۳ سوال کا جواب ہے جی ہاں بالکل! ہمیں دیکھ کر بے ساختہ شعر پڑھا گیا۔ بلکہ ایک بار کیا، تین مختلف مواقع پر تین مختلف لوگوں نے ایک ہی شعر پڑھا (ہے نادلچسپ بات)

یوں ہر بات پہ ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے
تنہائی میں بیٹھ کر کبھی رو بھی لیا کر.....!

ویسے تو مابدولت کی تعریف میں دیوان کے دیوان (لکھے نہیں) پڑھے گئے ہیں۔ سو کیا کیا لکھوں دوستو! (آآہم مم م)

(4) شاعری تو ہر صورت اچھی لگتی ہے۔ سو گائیگی میں سے بھی انتخاب مشکل ہے اب زیادہ تو نہیں لکھوں گی۔ بس بتاؤں گی کہ جاوید اختر کی غزل۔

کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے
تو نے آنکھوں سے کوئی بات کہی ہو جیسے

میری فیورٹ ہے۔ جب بھی سنو موڈ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

منی بیگم کی آواز میں حسن رضا کی اس غزل نے بھی اچھا تاثر چھوڑا۔ سو آپ کے لیے پیش خدمت ہے۔

آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے
لیکن کبھی کبھی تو گھر جانا چاہیے
مجھ سے بچھڑ کے ان دنوں کس رنگ میں ہے وہ
یہ دیکھنے رقیب کے گھر جانا چاہیے
اس بت سے عشق کیجیے، لیکن کچھ اس طرح
پوچھے کوئی تو صاف مکر جانا چاہیے
افسوس اپنے گھر کا پتا ہم سے کھو گیا
اب سوچنا ہے یہ کہ کدھر جانا چاہیے
بیٹھے ہیں ہر فصیل پہ کچھ لوگ تاک میں
اچھا ہے تھوڑی دیر سے گھر جانا چاہیے
نادان جوانی کا زمانہ گزر گیا
اب آ گیا بڑھاپا سدھر جانا چاہیے
بیٹھے رہو گے دشت میں کب تک حسن رضا
جینا اگر نہیں ہے تو مر جانا چاہیے

(5) کلاسیکی شاعری میں جو غزل پسند کی ہے۔ امید ہے کہ بہنوں کو بھی ضرور پسند آئے گی۔ محشر بدایونی کی غزل ہے۔

گرے دریا نہ پل مسمار میرے
ابھی کچھ لوگ ہیں اس پار میرے
جدا کب سے ہوں اب دیکھوں تمہیں گھر کو
کہیں گے کیا در و دیوار میرے
وہیں سورج کی نظریں تھیں زیادہ
جہاں تھے پیڑ سایہ دار میرے
وہی یہ شہر ہے تو شہر والو!
کہاں ہیں کوچہ و بازار میرے
تم اپنا حال مجبوری بتاؤ
مجھے تو کھا گئے آزار میرے
جنہیں سمجھا تھا جاں پرور اب تک
وہ سب نکلے کفن بردار میرے
گزرتے جا رہے ہیں دن ہوا سے
رہیں زندہ سلامت یار میرے

☼

باتیں عینی جعفری سے

شاہین رشید

1 اصلی نام؟
قرۃ العین جعفری۔

2 پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
عینی اور میرے نام کی اسپیلنگ AINY ہے۔

3 تاریخ پیدائش/شہر؟
9جون/کراچی۔

4 قد/ستارہ؟
ناپا نہیں/جوزا۔

5 بہن بھائی؟/آپ کا نمبر؟
دو چھوٹی بہنیں/پہلا۔

6 تعلیمی قابلیت؟
بیچلر کام کینیڈا سے۔

7 شادی؟
جب اللہ کی مرضی ہو گی، ہو جائے گی۔

8 شوبز میں آمد؟
مجھے اداکاری کا شوق تھا۔ تھیٹر میں تھوڑا سا کام کر چکی ہوں۔ اپنی خالہ عذرا محی الدین کی وجہ سے آئی۔

9 پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟
"زپ" اور "مایا میری بہن" وجہ شہرت بنے۔ لیکن پہلا پروگرام "ڈریمر" تھا۔ اس کے علاوہ ایک کمرشل بھی کیا تھا۔

10 پہلی کمائی/کہاں خرچ کی؟
کینیڈا میں ہی پہلی کمائی کی تھی شاید انٹرنیٹ سے۔ یاد نہیں کتنی تھی۔

11 شوبز کی بڑی برائی؟
فی الحال تو کوئی برائی نظر نہیں آئی۔

12 آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟
یہی کوئی نو دس بجے۔ میں مارننگ پرسن نہیں ہوں نو دس بجے بھی شوٹ کی وجہ سے ہی اٹھتی ہوں۔

13 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
کہ ناشتا مل جائے۔

14 گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟
جب وہ چویشن کو سمجھے بغیر کوئی فیصلہ دے دیں۔

15 اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟
کوئی ایک نہیں ہے۔ بہت سے قوانین ہیں، جو برے لگتے ہیں۔

16 قومی تہوار منانے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟
پیار اور برداشت کے ساتھ۔

17 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
موڈ پر منحصر ہے۔ ویسے بھوک برداشت کر لیتی ہوں۔

18 ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟
ایسی حکومت آجائے، جو صرف اور صرف ملک کے مفاد کے لیے ہی سوچے۔

19 کس دن کا شدت سے انتظار ہے؟
ماشاء اللہ سے بہت اچھی زندگی گزار رہی ہوں اس لیے انتظار کسی کا نہیں ہے۔ ہر دن ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔

20 شدید تھکن کے باوجود کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟
کہیں نہیں..... بس سونے کے لیے اپنے بستر پر جانے کو دل چاہتا ہے۔



21 خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟
بہت زور سے ہنستی ہوں۔

22 بیرون ملک کے کون سے قوانین متاثر کرتے ہیں؟
قوانین سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ ہم آزادی سے ادھر ادھر جا سکتے ہیں۔

23 پاکستان میں رہنے کی وجہ؟
میری فیملی، میرے فرینڈز اور میرا کام۔

24 کیا آپ ایک ضدی انسان ہیں؟
ہاں..... کبھی کبھی ضدی ہو جاتی ہوں۔

25 دماغ کب گھومتا ہے؟
جب لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور مجھے پتا ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔

26 غصہ میں آپ کا ردعمل؟
دو ردعمل ہوتے ہیں..... یا تو سنا دیتی ہوں یا پھر بالکل خاموش ہو جاتی ہوں۔

27 مردوں میں کیا خصوصیات اچھی لگتی ہیں؟
وہ مرد اچھے لگتے ہیں، جو اپنے آپ کو عورتوں سے برتر نہیں سمجھتے۔

28 کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟
نظر انداز کر کے اپنے کام میں مصروف رہوں گی۔

29 پرائز بانڈ نکلنے کے منتظر رہتی ہیں؟
مجھے پرائز بانڈ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

30 گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟
بابا کے غصے سے۔

31 کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟
نہیں..... سب کچھ وقت پر ہی ملا ہے۔

32 جوائنٹ اکاؤنٹ بہتر رہتا ہے یا سنگل اکاؤنٹ؟
شادی کے بعد جوائنٹ۔ ویسے سنگل۔

33 محبت کا اظہار کس طرح کرنا چاہیے؟
کھل کے اور گفٹ دے کر۔

34 آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟
اپنے اردگرد کے لوگوں کو اور اپنے گھر والوں کو خوش رکھنا۔

35 پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟
کہ جو چیز لے رہی ہوں وہ پرفیکٹ ہو اور اس کی اہمیت ہو۔

36 بہترین تحفہ آپ کی نظر میں کیا ہونا چاہیے؟
میں تحفہ ہمیشہ شخصیت کو ذہن میں رکھ کر دیتی ہوں۔

37 کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟
کوئی فنی اسٹوری سن کر بے ساختہ ہنس پڑتی ہوں۔

38 پسندیدہ پروفیشن؟
جو میرا ہے یعنی ایکٹنگ۔

39 اپنے لیے تعریفی جملے، جو بھول نہیں سکتیں؟
کوئی خاص نہیں..... لیکن جب کوئی میرے کام کی تعریف کرے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

40 مخلص کون ہوتا ہے اپنے یا پرائے؟
دونوں ہی ہوتے ہیں۔

41 چھٹی کا دن گزارنا کہاں پسند کرتی ہیں؟
آج کل تو کام بہت ہے۔ اس لیے چھٹی مل جائے

توگھر پر ہی گزارنا پسند کرتی ہوں۔
42 لباس میں کیا پسند ہے؟
مجھے ڈھیلے ڈھالے اور آرام دہ لباس پسند ہیں۔
43 اپنی شخصیت کے لیے کوئی ایک لفظ؟
میں ایک ہنس مکھ لڑکی ہوں۔
44 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
اپنے کمرے میں۔
45 ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟
ایک نہیں.... بہت ہیں۔
46 کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟
فیملی ممبرز کے اور اپنے دوستوں کے۔
47 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
اپنے ٹی وی ڈرامے دیکھتی ہوں یا کوئی کتاب پڑھتی ہوں۔
48 ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟
کافی کردار ہیں جیسے فیری ٹیل کا کردار اور ویمپائر (Vampire) کا کردار کرنا چاہوں گی۔
49 ایک کردار جو ہٹ گیا؟
"مایا میری بہن" میں مایا کا کردار۔
50 ایک کردار جو کرکے پچھتائیں؟
نہیں! ایسا کردار تو نہیں کیا۔ ویسے بھی میں کردار سوچ سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔
51 کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟
ہاں.... شاید۔
52 مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟
اچھی بھی لگتی ہے اور بعض اوقات بری بھی لگتی ہے۔ موڈ پر منحصر ہے۔
53 اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟
میں تعلیمی بجٹ پہ بہت پیسہ لگاؤں گی۔
54 کیا چیزیں جمع کرنا شوق ہے؟
اس معاملے میں میں بالکل لڑکی ہوں یعنی ایسی لڑکی جس کو کپڑے جیولری اور بیگز جمع کرنا کا شوق ہوتا ہے۔ اچھی اچھی موویز بھی اور ہاں! کتابیں بھی۔

55 نصیحت جو بری لگتی ہے؟
نصیحت بری نہیں لگتی کیونکہ ہمارے فائدے کے لیے کی جاتی ہے۔
56 وقت کی پابندی کرتی ہیں؟
جی! جی.... بالکل۔
57 کن لوگوں پہ دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟
اپنی فیملی پر۔
58 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟
میرے خیال میں کمپیوٹر لیا تھا۔
59 کھانے کے لیے، بہترین جگہ چٹائی یا ٹیبل؟
ڈائننگ ٹیبل۔
60 اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گی؟
مجھے دنیا میں اکیلے بالکل نہیں رہنا۔ میں بھی سو جاؤں گی۔
61 انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟
کافی ہے، فیس بک سے دلچسپی اور انٹرنیٹ کے بغیر تو اب گزارہ ہی نہیں ہے۔
62 ایک کھانے کی ڈش جو آپ بہترین پکاتی ہیں؟
سچ بتاؤں! میں اتنی اچھی کک نہیں ہوں۔
63 عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟
میرے خیال میں عورت کا دل زیادہ نرم ہوتا ہے۔
64 کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟
کچھ کیڑوں سے ڈر لگتا ہے۔ سب سے نہیں۔
65 خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
یہ بہت مشکل سوال ہے۔ کئی وجوہات کی بناء پر انسان خودکشی کرتا ہے۔
66 شادی کی رسومات میں کون سی رسم بہت پسند ہے؟
مہندی کی، لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ شادی پہ بہت پیسہ خرچ کیا جائے۔
67 ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
امی کے ہاتھ کا۔
68 اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟
چار سال سے تو ایک ہی نمبر ہے۔

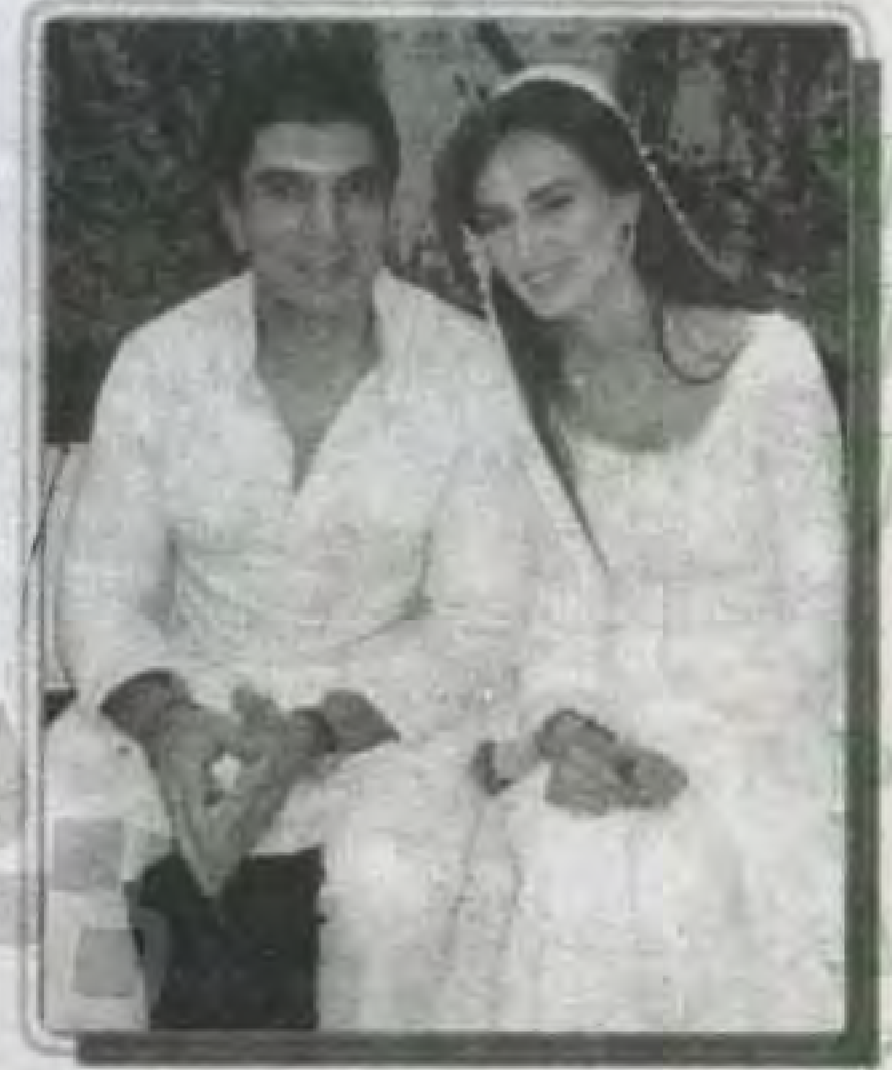
69 کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
سیل فون، چابیاں اور بیگ۔
70 آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟
کام کے علاوہ تو بالکل عام لوگوں جیسی ہی ہے۔
71 پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟
میں چاہتی ہوں کہ حالات بہتر ہو جائیں۔ مگر ابھی تو بہت غیر یقینی صورتحال ہے۔
72 اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟
کبھی کر لیتی ہوں۔ کبھی نہیں بھی کرتی۔
73 آپ کی کوئی اچھی عادت؟
لوگوں کو خوش رکھنا۔
74 جب آپ نیا قلم استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟
اپنا سائن کرتی ہوں۔
75 آپ کی کوئی بری عادت؟
کبھی کبھار اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتی۔
76 کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟
غصے میں.... مگر چھوٹی چھوٹی موٹی نہیں (قہقہہ)
77 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
نہیں.... کھانے پہ غصہ نہیں نکالتی۔
78 مارننگ شو کے لیے آپ کے تاثرات؟
مجھے تو مزا نہیں آتا اور میں جاتی بھی نہیں۔ ہاں! کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں جانا ہو تو چلی جاتی ہوں۔
79 شہرت مسئلہ بنتی ہے؟
نہیں! میرے لیے شہرت کبھی مسئلہ نہیں بنی۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔
80 بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟
کروٹیں بدلتی ہوں۔
81 خواب دیکھتی ہیں؟
ہاں.... سوتے میں خواب دیکھتی ہوں اور پوری مووی کی طرح یاد ہوتے ہیں۔
82 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟
لیمپ ہوتے ہیں۔ سیل فون، بالوں کو باندھنے کے لیے کوئی کلپ وغیرہ اور کتاب۔

83 خدا کی حسین تخلیق؟
انسان.... اور ہمیں یاد نہیں کہ ہم انسان ہیں۔
84 ویلنٹائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟
فضول ہے۔
85 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟
اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ نیند بہت پیاری ہوتی ہے۔
86 جھوٹ کب بولتی ہیں؟
دوسروں کو بڑی مشکل سے بچانے کے لیے جھوٹ بولتی ہوں۔
87 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہیں؟
جب میں سات آٹھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھتی ہوں تب۔
88 گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟
جوتے اتاروں، میک اپ اتاروں اور آرام دہ کپڑے پہنوں۔
89 کون سے چینل شوق سے دیکھتی ہیں؟
میں ٹی وی زیادہ نہیں دیکھتی۔ ڈی وی ڈی سے کچھ نہ کچھ دیکھتی رہتی ہوں۔
90 آپ کے ڈراموں پہ تنقید ہوتی ہے؟
ہاں! کیوں نہیں۔ کبھی برا بھی لگتا ہے اور کبھی اچھا بھی۔
91 جس دن موبائل سروس بند ہو کیسا لگتا ہے؟
گورنمنٹ پہ غصہ آتا ہے۔
92 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟
فقیر کی حالت پر منحصر ہے۔
93 لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ کیا بولتی ہیں؟
افوہ.... کیا مصیبت ہے۔
94 کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش! یہ ہمارا ہوتا؟
کسی کے لیے نہیں۔ بس کاش! اپنا ملک اچھا ہو جائے۔ کیونکہ کوئی دوسرا ملک ہمارا نہیں ہو سکتا۔
اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
کوئی مسئلہ نہیں۔ زندگی جیسی پہلے چل رہی تھی ویسی ہی ہو جائے گی۔

☆

خبریں وغیرہ

تبصیر نشاط



شادی مبارک

معروف ماڈل و اداکارہ مہرین سید اداکاری میں تو کوئی بڑا نام نہ بن سکیں۔ کیونکہ ان کے اکثر پروجیکٹ صرف اعلان کی حد تک ہی محدود رہے۔ تاہم چند ماہ پہلے جب ایک بین الاقوامی جریدے نے انہیں ایشیا کی دس خوب صورت خواتین میں شامل کیا تو مہرین کو ہر طرف سے پذیرائی ملنا شروع ہو گئی۔ ایک پاکستانی فلم ساز نے مہرین سید کو جھٹ ہیروئین کے کردار کی پیش کش کر ڈالی جو انہوں نے قبول بھی کر لی۔ مہرین سید نے پڑوسی ملک کی دو فلموں میں کام ملنے کا دعوا بھی کیا۔ تاہم ان تمام فلموں میں سے تاحال ایک فلم بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ لیکن مہرین سید اپنے ہر انٹرویو میں اپنی بے حد مصروفیت کا ڈھنڈورا پیٹتی رہیں۔ بلکہ ایک انٹرویو میں تو ایک سوال کے جواب میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ”ابھی میرے پاس کرنے کے لیے بہت کام ہے۔ جب میرے پاس کرنے کو کچھ نہ رہے گا تو میں کسی مارننگ شو کی میزبان بن جاؤں گی۔“ ابھی ان کے انٹرویوز کی بازگشت جاری ہی تھی کہ اچانک خبر آئی کہ مہرین سید نے شادی کر لی۔ (ایں! تو اب ان کے پاس کرنے کو مارننگ شوز بھی نہیں رہے تھے کیا؟) مہرین سید کی شادی کی تقریب ماہ فروری کے آخری ہفتے میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ ان کے شوہر احمد شیخ ایک بزنس مین ہیں اور وہ معروف فیشن ڈیزائنر نسرین ہمایوں کے برخوردار ہیں۔ احمد شیخ کی یہ دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی سے ان کے دو بچے بھی ہیں۔ (ہماری دعا ہے کہ مہرین سید ایشیا کی دس بہترین ماؤں میں سے بھی ایک ثابت ہوں۔)





عالمہ سے بیوٹیشن تک

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اداکارہ نرگس نے کرائے کے قاتلوں کی طرف سے ایک الزام کے بعد شوبز چھوڑ کر عالمہ بننے کا اعلان کیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ ان کے اس اعلان سے ایک ہلچل مچ جائے گی اور چاروں طرف سے پرزور اپیل کی جائے گی کہ وہ اپنا بیان واپس لے لیں۔ تاہم ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ ان دنوں نرگس ایک مارننگ شو کر رہی تھیں۔ وہ پروگرام ان کی چھوٹی بہن دیدار کو مل گیا۔ نرگس بوکھلا گئیں۔ وہ سمجھیں کہ شاید شادی شدہ ہونے کی وجہ سے ان کی ڈیمانڈ نہیں رہی۔ سو انہوں نے دیدار کی خفیہ شادی کا بھانڈا پھوڑ کر ان کی بھی مارکیٹ ویلیو کم کرنا چاہی۔ تاہم دیدار ان کے لگائے اس الزام سے صاف مکر گئیں۔ نرگس نے جب یہ دیکھا کہ ان کی دال کسی طور بھی نہیں گل رہی تو انہوں نے کچھ اور کرنے کا سوچا۔

فلموں کے لیے بناؤ سنگھار کرواتے کرواتے وہ بد صورت چہروں کو خوب صورت بنانے کے تمام گر سیکھ چکی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے ایک عدد بیوٹی پارلر کھول لیا۔ انہوں نے شوبز سے وابستہ افراد اور صحافیوں کو مدعو کر کے اپنے پارلر کا باقاعدہ افتتاح کیا اور پہلے دن تمام لوگوں کی بھنویں خود بنائیں۔ (اب یہ نہیں معلوم کہ ان کے بھنویں بنانے کے بعد بھنویں بنوانے والی خواتین اور خود نرگس بھی سب کو منہ دکھانے کے قابل رہی بھی تھیں یا نہیں۔) یوں نرگس اپنے بیان کے مطابق عالمہ تو نہ بن سکیں، البتہ بیوٹیشن ضرور بن گئیں۔

انعام

گزشتہ دنوں ایک نجی چینل سے اختتام پذیر ہونے والا پروگرام ”سرکشیترا“ آپ کو یاد ہی ہو گا۔ اس پروگرام میں عاطف اسلم کی بھارتی گلوکار ہمیش ریشمیا سے چھیڑ چھاڑ اور آشا بھونسلے سے نوک جھونک دیکھ کر اکثر ناظرین کا خیال تھا کہ یہ پروگرام باقاعدہ اسکرپٹ شدہ ہے۔ تاہم جب آخر میں پاکستانی گلوکار نبیل شوکت نے اپنے سُروں سے سب کو پچھاڑ دیا تو پھر سب نے کہا کہ پروگرام اسکرپٹ شدہ سہی، لیکن نتیجہ طے شدہ ہرگز نہیں ہے۔ (آہو جی!) اس پروگرام کے فاتح کو بھارتی فلم ساز بونی کپور کی آنے والی فلم ”نو انٹری 2“ میں اپنی آواز کا جادو جگانے کا موقع



بھی ملنا تھا۔ یوں نبیل شوکت کی فلم "نو انٹری 2" سے بھارتی فلمی صنعت میں انٹری ہو رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس انٹری کے بعد نبیل شوکت بھارتی فلمی صنعت میں اپنی جگہ بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔

فخر

معروف بھارتی شاعر و نغمہ نگار جاوید اختر نے شکوہ کیا ہے کہ بھارتی فلموں میں اردو زبان کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ (جاوید اختر نے شاید ہمارے ہاں کے پروگرام نہیں دیکھے، ورنہ ......) ہمارے ہاں بھی ان کی تقلید میں آج کل اردو زبان و تلفظ کو بگاڑنے کے سو سو جتن کیے جا رہے ہیں تو ہم پڑوسیوں سے کیا گلہ کریں کہ ان کی مسلم دشمنی تو مسلمہ ہے۔ گاندھی نے کہا تھا۔ اردو زبان کی خرابی یہ ہے کہ یہ قرآن کے لفظوں میں لکھی جاتی ہے۔ بات اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت کی ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی شناخت عزیز نہیں رہی۔ مریم جمیلہ ایک امریکی خاتون تھیں۔ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ پاکستان آئیں اور پھر یہیں کی ہو رہیں۔ اسلام اور پاکستان سے محبت کے باعث مریم جمیلہ نے مقامی رہن سہن اور تہذیب و ثقافت کو اپنی زندگی کی رگوں میں لہو کی مانند دوڑا دیا۔ خود امریکی ہونے کے باوجود بچوں کو وطن سے محبت کی شناخت دی۔

ایک مرتبہ مریم جمیلہ کے بیٹے حیدر فاروق امریکا گئے تو وہاں ایک تقریب میں انہیں انگریزی میں تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ جب انہوں نے کہا کہ "میں تو اردو ہی میں تقریر کر سکتا ہوں۔" تو وہ لوگ حیران رہ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکی ماں کی گود میں پروان چڑھنے والا شخص فر فر انگریزی بولنا جانتا ہو گا۔ حیدر فاروق نے انہیں بتایا کہ "میری ماں نے مجھے میری قومی زبان سے محبت کرنا سکھایا ہے۔"

بعد میں حیدر فاروق نے مریم جمیلہ کو خط لکھ کر ان سے شکایت کی کہ "آپ نے ہمیں انگریزی دان کیوں نہیں بنایا؟" مریم جمیلہ نے کہا کہ "تم مجھے انگریزی میں خط لکھ لیتے ہو اور میرے لکھے خطوط بھی پڑھ لیتے ہو۔ تمہارے لیے یہی کافی ہونا چاہیے۔ انگریزی سے مرعوب نہ ہو۔ اردو زبان پر فخر کرو۔"

کچھ ادھر ادھر سے

میں نے تین برس قبل ایک طالبان رہنما سے اپنے صحافیانہ تجسس میں پوچھا تھا کہ آخر اس جنگ کا کبھی اختتام بھی ہو گا؟ طالبان رہنما نے کامل اطمینان اور نہایت رسان سے کہا تھا۔

"گھڑیاں ہم نہیں، امریکی اپنی کلائیوں پر باندھتے ہیں۔ اس لیے وقت کی فکر بھی وہی کرتے ہیں ہم نہیں۔"

(مجم طاہر ..... ماجرا)

اس حکومت نے پانچ برسوں میں اندھیروں کے سوا کچھ تقسیم نہیں کیا۔ یہ اندھیرے میں اندھیرا جمع کرنے والے ایسے ریاضی دان ہیں، جو اس اندھیرے کو سورج ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(جاوید چودھری ..... زیرو پوائنٹ)

میڈیا اس وقت عقل اور شعور کا امتحان بن کر عوام کے اعصاب پر مسلط ہو چکا ہے۔ معاشرے کا یہ طاقت ور ترین ستون خود ریاست کو کمزور کرنے کا سبب بن رہا ہے۔

(افشاں نوید)

رحمٰن ملک پنجاب حکومت کو مطلع کر رہے ہیں کہ شہباز شریف نے لشکرِ جھنگوی کے خلاف کارروائی نہ کی تو وہ خود کر گزریں گے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے دہشت گردوں سے نبٹنا صوبائی حکومتوں کے بس کی بات نہیں ہوا کرتی۔ اس مسئلہ سے صرف مرکزی حکومت ہی نبرد آزما ہوا کرتی ہے۔

(نصرت جاوید۔ برملا)

☆

میری خامشی کو بیاں ملے

اِدارہ

فاطمہ بٹ ..... سیالکوٹ

(1) جناب! ہمارا مختصر سا تعارف ہے کہ شہر اقبال کے رہنے والے ہیں۔ تعلیمی قابلیت بی اے اور اب آگے ایم اے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں معلمہ کے فرائض بھی ادا کر رہے ہیں ..... سادہ سی شکل و صورت والے عام سے انسان ہیں۔ پرانا کوٹ اور نئی کتاب کے مترادف فیشن سے ذرا کم ہی رغبت ہے۔ مطالعے کے شوقین "کتابیں پڑھنا" اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرنا اور پھر اپنے ابا جان سے ہلکی پھلکی بحث کرنا اور مٹی اور پودوں کے عاشق۔ ہاں! یہ علیحدہ بات ہے کہ ان سے عشق کا وقت ذرا کم ہی ملتا ہے۔ یہ تو تھے ہمارے مشاغل۔

(2) حق ہاہ! کیا سوال پوچھا آپ نے۔ تیر کی طرح سیدھا دل پہ جا کے لگا تو جناب! اگر خوبیاں بیان کریں گے تو اپنے منہ میاں مٹھو اور خامیاں، ہاہاہا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے تو بقول شاعر کے۔

محبت ہو تو بے حد ہو، جو نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کم کرنا، ہمیں ہر گز نہیں آتا

عمیرہ احمد کے ناولوں کے کرداروں کی طرح ہم بھی اتنے ہی شدت پسند ہیں۔ حالانکہ شدت پسندی اچھی چیز نہیں۔ مگر کیا کریں۔ فطرت ... تو جناب! حساس دل ہیں۔ نہ تو کسی سے حسد کرتے ہیں، نہ منافقت۔ صاف گو ہیں منہ پھٹ حد تک۔ کاہل ہیں، سست ہیں۔ ہماری کاہلی کی مثال تو یہ آپ کے سامنے ہی ہے کہ دو ماہ پہلے اس سلسلے میں شرکت کے لیے خط لکھنا شروع کیا تھا۔ باجی اور بھابھی کہتی ہیں آگے جا کے اس کا کیا بنے گا اور ہم کہتے ہیں۔

اچھی ہوں یا بری ہوں، خود اپنے لیے ہوں۔
میں خود کو نہیں دیکھتی اوروں کی نظر سے۔

پسندیدہ عادات یہ ہیں کہ کسی کا برا نہیں سوچتی اور ہر کسی کا کام کر دیتی ہوں۔ بشرطیکہ موڈ اچھا ہو۔

(3) یہ اچھا سوال کیا آپ نے، ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی طرح۔ ہمارا اور خواتین کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ شاید فورتھ یا فائیو کلاس تھی۔ کچھ یاد نہیں۔ جب پہلی کہانی پڑھی جو کہ ایک ٹیچر اور اس کے اسٹوڈنٹ پر تھی۔ شاید خواتین میں یا شعاع میں۔ پھر ایسا چسکا پڑا کہ گھر والوں سے چھپ کے بڑے بہن بھائیوں کی طرح کبھی سیڑھیوں میں تو کبھی مرغیوں والے کمرے میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ ناقابل فراموش تو بہت سی ہیں۔

"نارسائی سے پارسائی تک" "آؤ ہم بھی چلتے ہیں" "بات عمر بھر کی ہے" (عمیرہ احمد) "گرد کی چھاؤں" (نمرہ بخاری) "خضر کیوں نہ ملا" (آسیہ رزاقی) اور بھی بہت سے ناول ہیں، جو ناقابل فراموش ہیں۔

(4) ہاہ! کیا ظالم سوال پوچھا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ کوئی ڈیٹ آف برتھ پوچھ لے تو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا تھی۔ خیر! باقاعدہ تو صرف ایک دفعہ منائی اور پھر مت پوچھیے! توبہ کر لی۔ ہاں البتہ یاد رہ جائے تو ابو کچھ دے دیتے ہیں۔

(5) کتابیں تو بہت سی پڑھیں۔ کالج میں تھے تو لائبریری کی قریباً ہر موضوع پر کتابیں پڑھیں۔ اس سال تو صرف قصص الانبیاء، حیات اقبال (ایم ایس ناز) بجنگ آمد (کرنل محمد خان) پڑھیں۔

(6) پسندیدہ شعر وہ بھی صرف ایک۔ کیا یہ زیادتی

نہیں؟ پسندیدہ کی لسٹ تو بہت طویل ہے۔ مگر چلیں ایک ہی سہی۔

اپنے اندر کے تلاطم نظر نہ آئے مجھے
اور ۔۔۔ ۔۔۔ پیشانی لیے پھرتا ہوں

درثمن مغل..... گاؤں کیلا ضلع شیخوپورہ

بی کام کر چکی ہوں۔ آگے ایم اے ایجوکیشن کرنے کا ارادہ ہے اور اپنی اکیڈمی چلا رہی ہوں۔

خواتین سے وابستگی... خواتین سے ساتھ بہت پرانا ہے۔ جب میں غالباً" تیسری یا چوتھی جماعت میں تھی۔ اس وقت میری باجی پڑھا کرتی تھیں۔ لیکن ابو جی کو پسند نہیں تھا۔ ابو جی باجی کو منع کرتے تھے۔ لیکن وہ پھر بھی چوری چھپے پڑھ لیتی تھیں تو ابو جی نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں باجی کا ڈائجسٹ تلاش کر کے ان کو دوں۔ وہ ڈائجسٹ جلا دیتے یا پھاڑ دیتے تھے اور مجھے معاوضے کے طور پر پیسے بھی دیتے تھے۔ اب خواتین کے ساتھ وابستگی کا انداز بدل گیا ہے۔ حال یہ ہے کہ اسے پڑھے بغیر سونا بہت مشکل لگتا ہے۔ چاہے ایک صفحہ کیوں نہ پڑھوں۔ قلم اٹھانے کی اصل وجہ ہے "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو"۔ فرحت اشتیاق، نمرہ احمد، عمیرہ احمد پسندیدہ رائٹرز ہیں...

2۔ خوبیاں اور خامیاں تو کوئی دوسرا بہتر بتا سکتا ہے۔ سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہر کسی پہ جلدی بھروسا کر لیتی ہوں اور پھر بعد میں نقصان بھی اٹھاتی ہوں غصے کی بہت تیز ہوں۔ جس کی طرف سے ایک دفعہ دل میلا ہو جائے تو ہزار کوشش کے باوجود بھی دل صاف نہیں ہوتا۔ خوبیاں یہ ہیں کہ دوسروں کے کام کر کے خوش ہوتی ہوں۔ ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ میری وجہ سے کسی کا دل نہ دکھے۔

پسندیدہ شعر۔

مجھے پھر سے اسکول کا بستہ تھما دو اے ماں!
مجھے زندگی کا سبق بہت مشکل لگتا ہے
اگر قسمت کا لکھا سب ہی کچھ ہوتا تو خدا انسان کو کبھی دعا مانگنا نہ سکھاتا۔

سالگرہ... میں صرف مذہبی تہوار شوق سے مناتی ہوں۔ اکثر تو ایسے ہوتا ہے کہ میں وہ دن ہی بھول جاتی ہوں جس دن سالگرہ ہوتی ہوں۔ میں اپنی اسٹوڈنٹس کو بھی اس بات کی تلقین کرتی ہوں کہ وہ سالگرہ منانے جیسی خرافات سے دور رہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے ان ہندووانہ رسم و رواج کو اپنا لیا تو اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

عریشہ..... کراچی

1 میرا نام عریشہ ہے۔ ہم چھ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ میری تاریخ پیدائش 28 جون اور اسٹار کینسر ہے۔ تعلیمی قابلیت بی اے ہے۔ ایم اے کرنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ میرے مشاغل میں سرفہرست اچھی کتابیں، چاہے ڈائجسٹ ہو یا کوئی بھی کتاب ہو، کا مطالعہ کرنا، نت نئی تراکیب سے کھانا بنانا اور خواتین ڈائجسٹ کے سلسلوں میں شرکت کرنا شامل ہے۔

2۔ خامیاں... غصہ بہت جلد اور شدید آتا ہے۔ کسی کی غلطی کو آسانی سے معاف نہیں کر سکتی۔ بہت جلد روٹھ جاتی ہوں۔ ہر کسی سے جلدی گھلتی ملتی نہیں ہوں۔ اس لیے لوگ مغرور سمجھتے ہیں۔ خوبیاں، بے حد حساس، صلح جو، نرم مزاج، منافقت پسند نہیں۔ اس کے علاوہ ہر کام بہت محنت اور خوش اسلوبی سے کرتی ہوں اور ایک بات، چاہے آپ اسے میری خوبی کہہ لیں یا خامی کہ میرے جو دوست مجھے عزیز ہیں میں نہیں چاہتی کہ کوئی اور ان سے دوستی کرے یا بات کرے۔

3۔ خواتین ڈائجسٹ سے وابستگی پچھلے چھ سال سے ہے۔ لیکن کچھ سال پرانے ڈائجسٹ بھی پڑھے ہوئے ہیں۔ بہت سی ایسی تحریریں ہیں جنہیں کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ "میرے ہمدم میرے دوست" جو کہ حال ہی میں پڑھی ہے۔ اس کے علاوہ "میرے خواب ریزہ ریزہ"، "دل سے نکلے ہیں جو لفظ"، "لاحاصل" اور "مرگ برگ" شامل ہیں۔

4۔ سالگرہ تو باقاعدہ کبھی نہیں منائی۔ لیکن میرے دوست SMS اور گفٹس ضرور بھجواتے ہیں۔ ہاں! 2007ء میں میری چھوٹی بہن نے میرے لیے سرپرائز کیک منگوایا اور گھر پر ہی سالگرہ سیلبریٹ کی بہت اچھا لگا۔

6۔ اس سال کوئی کتاب نہیں پڑھ سکی۔

زرمینہ خان..... دریا خان

1۔ ایف ایس سی کیا ہے اب گریجویشن وولائبریری سائنس کر رہی ہوں۔ میڈیکل لائن اس لیے جوائن نہیں کی کہ جاب کرنے کا بالکل شوق نہیں ہے۔ اب اتنی محنت کرتی اور جاب نہ کرتی تو فائدہ کھینے کا۔ ہاں! بچپن سے لیڈی پولیس بننے کا بہت شوق تھا۔ لیکن میرے پاپا جانی کو لڑکیوں کے لیے یہ فیلڈ بالکل پسند نہیں۔ میرا اب تک دل کرتا ہے کہ سارے ظالموں کو پکڑ کر بند کر دوں۔ اور ایسی سزا دوں کہ نانی... دادی یاد آ جائے۔ خیر! خیالی پلاؤ پکانے میں کوئی حرج نہیں۔

2۔ BLIS کر رہی ہوں۔ پر بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔ ہم سب بہن بھائی مل کر خوب اودھم مچاتے ہیں۔ بقول امی کے، ہر وقت گھر سر پر اٹھا کر رکھتے ہو۔ بچپن سے اپنے ماں باپ کی لاڈلی رہی... اور تو اور رشتہ دار اور محلے والے اپنے بچوں سے بھی زیادہ مجھے پیار کرتے۔ بہت پیار سمیٹا ہے میں نے۔ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں۔ پر خدا کا شکر بھی ادا کرتی ہوں کہ اتنے اچھے والدین اور بہن بھائی دیئے ہیں۔ اپنے چھوٹوں کو یہ نصیحت کرتی ہوئی ملوں گی۔

کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک کہ کوئی اوجھل نہ ہو
پہلی سیڑھی پہ قدم رکھ، آخری سیڑھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رائیگاں کوئی پل نہ ہو

3۔ بہن بھائیوں کے ساتھ فٹ بال اور کرکٹ شوق سے کھیلتی ہوں۔ پر یہ کھیل ہماری لیے بہت ایکسپنسو (expencieve) ہو گئے ہیں کیونکہ ساتھ والے ہماری بالز واپس نہیں کرتے نا تو ہر دوسرے تیسرے دن فٹ بال یا کرکٹ بال خریدنی پڑتی ہے۔

4۔ شاعری کا شوق مجھے Seventh کلاس میں عفرا سے دوستی کے بعد ہوا۔ اسے بھی شوق تھا نا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ تو پکڑتا ہی ہے۔ عفرا نے بھی ساتھ چھوڑ دیا.

گیا۔ کیونکہ لڑکیاں مجھ سے خود دوستی کرتی تھیں۔ لیکن خود غرضی کی دوستی تاکہ ایگزام میں، میں ان کی ہیلپ کروں۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ جاتیں۔ میں نے تقریباً" سب ہی کلاسوں میں پوزیشن لی ہے۔ اس لیے۔ لیکن کبھی ذرا سی بھی نقل کی ہے نہ کروائی ہے۔ اس معاملے میں میں بہت ڈرپوک ہوں۔ اگر ٹیچر نے دیکھ لیا تو کتنی انسلٹ ہو گی۔ اس لیے پیپر کے وقت میں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ اور پھر ایگزامز کے بعد کیسی دوستی۔ اس لیے میں نے کسی کو بھی دوست سمجھنا ہی چھوڑ دیا۔ سب کے ساتھ ایک جیسا بی ہیو کرتی۔ یقیناً" اچھا۔

ہستی کو محبت میں فنا کون کرے گا
یہ فرض زمانے میں ادا کون کرے گا
ہاتھوں کی لکیروں کو ذرا دیکھ نجومی
یہ دیکھ! میرے ساتھ وفا کون کرے گا

لیکن اگر ثوبیہ! تم یہ پڑھ رہی ہو تو تم نے میرے اس غلط یقین کو واقعی اپنے خلوص سے غلط ثابت کر دیا۔ FSC کے بعد ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ مگر ثوبیہ! میں تمہیں مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔ ثوبیہ چک میں رہتی ہے اور مجھے اس کا ایڈریس نہیں معلوم اور اس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ ثوبیہ تمہارا دیا ہوا بریسلیٹ اور رنگ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

بہت شوخ اور چنچل ہوں۔ سارے کھلتے ہوئے رنگ پسند ہیں۔ پر تیز رنگ آنکھوں میں چبھتے ہیں۔ بہت بے چین ہڈی ہوں۔ ایک جگہ ٹک نہیں سکتی اور ہمارا تو گھر بھی بہت بڑا ہے۔ ☆

آپ کا باورچی خانہ

ثمرین اکرام

سیانے کہتے ہیں کہ اگر عورت کا سلیقہ دیکھنا ہے تو اس کے گھر کا کچن اور باتھ روم دیکھ لیں اور یہ بات سو فیصد درست ہے۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کھانا پکانے کا شوق اور محبت ہر لڑکی کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ کیونکہ شوہر اور سسرال والوں کے دل میں جگہ بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہوتا ہے۔ مجھے بھی اپنے شوہر کے لیے اچھے کھانے بنانے کا بہت شوق ہے اور جب میاں صاحب تعریف کرتے ہیں تو یقین جانئے سیروں خون بڑھ جاتا ہے اور ساری محنت وصول ہوجاتی ہے۔

1 ۔ میرے ساتھ پسند' ناپسند کا کوئی مسئلہ نہیں ہے' کیونکہ میرے میاں سب کچھ شوق سے کھالیتے ہیں۔ ہاں! غذائیت اور صحت کا البتہ میں بہت خیال رکھتی ہوں۔ زیادہ مرغن کھانے نہیں بناتی اور کوشش کرتی ہوں کہ ڈیلی روٹین میں سبزیاں' گوشت' انڈے وغیرہ سب کچھ شامل ہو' تاکہ ہم میں کسی بھی وٹامن اور آئرن وغیرہ کی کمی نہ رہے۔

2 ۔ میں چونکہ اکیلی ہوں' اس لیے زیادہ تر تو مہمان اطلاع دے کر آتے ہیں' لیکن اگر کبھی بغیر اطلاع کے بھی آمد ہوجائے تب بھی میں بالکل نہیں گھبراتی۔ وہ کہتے ہیں ناکہ مہمان کی آمد سے پہلے اللہ اس کا رزق بھیج دیتا ہے۔ گوشت وغیرہ گھر میں موجود ہوتا ہے۔ مٹن میں عموماً" بوائل کرکے رکھ لیتی ہوں' تاکہ جھٹ پٹ مٹن بھنا بنالوں۔ میرے میاں کو میرے ہاتھ کی یہ ڈش بہت پسند ہے۔

مٹن بھنا گوشت

اجزا:

مٹن	1/2 کلو
ٹماٹر	2 عدد
پیاز	1 عدد
پودینہ	1/2 گٹھی
لہسن' ادرک پیسٹ	1 چمچہ
دہی	1/2 پاؤ
کٹی لال مرچ	1 چمچہ
کٹا زیرہ	1 چمچہ
ہلدی	1/2 چمچہ
نمک	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
پسی لال مرچ	1/2 چمچہ

آئل گرم کرکے لہسن' ادرک کا پیسٹ فرائی کرکے اس میں گوشت ڈال کر بھون لیں۔ ٹماٹر' پیاز' پودینہ تینوں چیزوں کو تھوڑا سا پانی ڈال کر باریک پیس لیں۔ اس پیسٹ کو گوشت میں شامل کرکے چولہا تیز کردیں۔ ایک باؤل میں دہی لیں۔ اس میں کٹی لال مرچ' پسی لال مرچ' ہلدی' زیرہ اور نمک ڈال کر مکس کریں اور گوشت میں شامل کردیں۔ درمیانی آنچ پر پکائیں۔ پانی خشک ہونے پر اچھی طرح بھون لیں۔ ہرا دھنیا ڈال کر گارنش کریں۔ مٹن بھنا گوشت تیار ہے۔ ٹرائی کریں اور مجھے داد دیں۔

3 ۔ میں کھانا بناتے ہی کچن کی صفائی کرلیتی ہوں۔ کوکنگ رینج صاف کرکے خشک کرتی ہوں' تاکہ کھیاں وغیرہ نہ ہوں۔ ہفتہ وار صفائی کا بھی خصوصی اہتمام کرتی ہوں۔ مسالوں کے جار وغیرہ دھونا' کیبنٹ صاف کرنا اور سارے کاموں کے بعد فنائل کا پوچا بھی تقریباً" روزانہ لگاتی ہوں۔

4 ۔ ہمارا ناشتا ویسے تو چائے' مکھن' سلائس پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی پراٹھوں اور حلوہ پوری کا بھی اہتمام کرلیا جاتا ہے۔ پراٹھوں کے ساتھ میں انڈا کڑاہی یا دہی آلو بناتی ہوں۔ بہت مزے کے لگتے ہیں۔

دہی آلو

اجزا:

آلو	1/2 کلو۔ بوائل کیے ہوئے
دہی	1/2 پاؤ
ہلدی	1/2 چمچہ
کٹی لال مرچ	1 چمچہ
رائی دانہ	آدھا چمچہ
قصوری میتھی	تھوڑی سی
پسا گرم مسالا	1/2 چمچہ
پیاز	1 عدد باریک کٹی ہوئی
ہری مرچ	4 عدد
نمک	حسب ذائقہ
کڑی پتے	5-4
کوکنگ آئل	1/1 کپ

آئل گرم کرکے اس میں رائی دانہ ڈال دیں۔ اس کے بعد کڑی پتا' پیاز' کٹی مرچ' ہلدی' نمک ڈال کر بھون لیں۔ اس کے بعد دہی ڈال کر ہلکا سا مکس کریں اور آلو اور میتھی ڈال کر ہلکا سا پکائیں' پھر باریک کٹی ہری مرچ' دھنیا' پسا گرم مسالا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ دہی آلو تیار ہیں۔ پراٹھوں کے ساتھ بہت مزا دیں گے۔

انڈا کڑاہی

اجزا:

انڈے	4 عدد
لہسن' ادرک پسا ہوا	1 چمچہ
پسی لال مرچ	1/2 چمچہ
ثابت دھنیا کٹا ہوا	1/2 چمچہ
ہری مرچ کٹی ہوئی	3 عدد
ٹماٹر	2 عدد
نمک	حسب ذائقہ
آئل	حسب ضرورت

انڈے بوائل کرکے اسے تیل میں ہلکا سا فرائی کرلیں۔ پھر انڈے نکال کر اسی آئل میں پیاز ہلکی سی گولڈن کرلیں۔ پھر لہسن' ادرک کا پیسٹ ڈال کر فرائی کرلیں۔ پھر تمام مسالے شامل کرکے تھوڑا سا پانی ڈال کر پکنے دیں۔ جب مسالا بھن جائے اور تیل الگ ہوجائے تو انڈے شامل کردیں۔ انڈا کڑاہی تیار ہے۔

5 ۔ میرے میاں کو باہر کھانا کھانا پسند نہیں ہے۔ اس لیے کوئی عید تہوار ہو یا سالگرہ وغیرہ ہم لوگ گھر پر ہی سیلیبریٹ کرلیتے ہیں۔

6 ۔ کھانے تو موسم کی مناسبت سے ہی اچھے لگتے ہیں۔ سردیوں میں ماش کی بھنی دال' پائے' گاجر کا حلوہ' مونگ کی دال' میتھی' پالک وغیرہ اچھے لگتے ہیں تو گرمیوں میں ہلکے کھانے جیسے دال چاول' ٹماٹر کی چٹنی' کھچڑی' لسی وغیرہ کا الگ ہی مزا ہے۔ برسات کے موسم میں تو پکوڑے ازحد ضروری ہیں ورنہ برسات کا مزا ادھورا رہ جاتا ہے۔

7 ۔ اچھا پکانے کے لیے محنت سے زیادہ شوق' لگن اور محبت چاہیے ہوتی ہے۔ یہ سب ہوں تو ذائقہ خود بخود آجاتا ہے اور آغاز اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے ہو تو خیر و برکت بھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی شامل ہوجاتا ہے۔

8 ۔ ٹپس تو بہت ساری ہیں۔ جب آٹا گوندھیں تو نمک اور پانی کے ساتھ دو ٹیبل اسپون کوکنگ آئل پانی میں شامل کرکے آٹا گوندھیے۔ روٹی نرم بنے گی۔

آلو قیمہ جب پکائیں تو اتارنے سے پہلے اس میں آدھی گٹھی پودینہ اور آدھی گٹھی ہرا دھنیا کاٹ کر ڈال دیں' کھانے میں مسالے دار بریانی کی سی خوشبو آئے گی۔ (دھنیا اور پودینہ ڈالتے ہوئے سالن کی مقدار کو مدِنظر رکھیے گا)

مسرت شاہین اور شمیم افتخار دبیر سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد اپنا مکمل ایڈریس ارسال کریں۔ نیز "آپ کا باورچی خانہ" میں حصہ لینے والی تمام بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تحریر کے ساتھ ہی اپنا مکمل ایڈریس لکھ کر بھیجیں۔ تاکہ آپ کو فوری طور پر انعام ارسال کیا جاسکے۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن سجی

اجزا :

ثابت مرغ	ایک عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	پانچ کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ثابت مرچ	چار عدد
کالا نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

زیرہ، دھنیا، ثابت مرچ اور کالا نمک ملا کر پیس لیں۔ ایک بڑے پیالے میں لہسن ادرک پیسٹ، سرکہ، نمک اور لیموں کا رس ڈالیں۔ ساتھ ہی تقریباً" تین گلاس پانی بھی شامل کرلیں۔ مرغ کو اچھی طرح دھو کر کٹ لگالیں، پھر اس آمیزے میں ڈبو کر رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد پانی سے نکال کر پسا ہوا مسالا اچھی طرح لگائیں اور انگیٹھی پر سینک لیں۔ چپاتی اور املی پودینے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ٹنگڑی کباب

اجزا :

چکن لیگ پیس	چھ عدد
دہی	آدھا پاؤ
میدہ	دو کھانے کے چمچے
مکھن	تین کھانے کے چمچے
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
سفید اور سیاہ مرچ	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
خشک میتھی	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
چاٹ مسالا	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

لیگ پیس پر کٹ لگالیں اور نمک، سرخ مرچ، لہسن ادرک پیسٹ اور لیموں کے رس میں لپیٹ کر رکھ دیں۔ ایک پیالے میں دہی کے ساتھ میدہ، خشک میتھی، نمک، مکھن اور سفید اور سیاہ مرچ ملا کر پیسٹ بنالیں۔ لیگ پیس کو اس آمیزے سے نکال کر دہی والے آمیزے میں کوٹ کریں اور اگر اوون ہے تو دو سو سینٹی گریڈ پر بیک کرلیں یا بھاپ میں دم دے لیں یا ہلکے گھی میں فرائی کریں۔ لیموں کا رس اور چاٹ مسالا چھڑک کر پیش کریں۔

انڈونیشین رائس

اجزا :

انڈر کٹ بیف	ایک پاؤ
جھینگے	ایک پاؤ
چاول	آدھا کلو
لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	تین عدد
ثابت سرخ مرچ	تین عدد
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
چلی ساس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کو پٹیوں کی شکل میں کاٹ لیں اور جھینگوں کو اچھی طرح صاف کرکے دھولیں۔ ایک چمچہ لہسن پیسٹ اور تین پیالی پانی کے ساتھ گوشت کو ابال لیں۔ آنچ اتنی ہلکی رکھیں کہ پانی بچ جائے اور گوشت گل جائے۔ پھر گوشت نکال کر الگ رکھیں اور یخنی محفوظ رکھ لیں۔

چاولوں کو ابال کر نتھار لیں اور کسی بڑی ٹرے میں پھیلا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کریں اور ثابت مرچ اور لہسن پیسٹ کو ہلکا سا فرائی کریں، پھر جھینگے اور ابلا ہوا گوشت ڈال کر فرائی کریں۔ تھوڑے تھوڑے چاول بھی شامل کرتے رہیں اور ساتھ ساتھ یخنی بھی ڈالتے جائیں۔ آخر میں کٹی ہوئی ہری مرچ، سویا اور چلی ساس چھڑک کر اچھی طرح مکس کریں اور چولہے سے اتار لیں۔

جیلی شاہی ٹکڑے

بڑی ڈبل روٹی	ایک عدد
جیلی	ایک پیکٹ
بادام/پستے	دو کھانے کے چمچے
کنڈینسڈ ملک	آدھا کپ
کریم	آدھا کپ
چینی	چھ کھانے کے چمچے
گھی	تلنے کے لیے

ڈبل روٹی کے سخت کنارے کاٹ کر الگ کردیں اور سلائس کو گول یا کسی بھی شیپ میں کاٹ لیں اور تل کر الگ پلیٹ میں رکھ لیں۔ جیلی کو پکا کر کسی پیالے میں ڈال کر جمالیں اور تھوڑے بڑے سائز میں کاٹ لیں۔ تلے ہوئے ایک سلائس پر کنڈینسڈ ملک (گاڑھا دودھ) لگائیں، پھر اس پر جیلی رکھیں دوسرے سلائس پر بھی کنڈینسڈ ملک لگا کر اس پر رکھیں۔ اس کے اوپر فریش کریم لگائیں اور باریک کٹے بادام پستے چھڑک کر پیش کریں۔

✡

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

عدنان

ا۔ راولپنڈی

اس وقت ہم لوگ شہر میں رہتے ہیں مگر دو سال بعد میرے ابو کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہمارا گاؤں شفٹ ہو جانے کا ارادہ ہے۔ میرے ابو بہت اچھی پوسٹ پر ہیں مگر وہ ہمیں گھر کا خرچ بہت کم دیتے ہیں۔ میں ڈپریشن کی مریض ہوں اور جاب کرتی ہوں ہمارے گھریلو حالات بھی اچھے نہیں۔ ہر وقت گھر میں کسی نہ کسی بات پر جھگڑا رہتا ہے۔ بے شک میں مینٹلی بالکل فٹ نہیں مگر میں جاب کر کے خوش ہوں کہ اس طرح ہمیں بھی زندگی کی خوشیاں محسوس کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں اور سب سے اہم بات کہ گھر کے تلخ ماحول سے کچھ دیر کے لیے چھٹکارہ مل جاتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میں نے سوچا تھا۔ جب ہم گاؤں جائیں گے۔ تب میں بی اے کر لوں گی اور اس کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ایم اے کر لوں گی۔ مگر اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کے نزدیک یونیورسٹی کوئی نہیں ہے اور ابو مجھے شہر بھیجنے پر کبھی رضامند نہ ہوں گے تو پھر میں اپنا خواب کیسے پورا کروں گی۔ ابھی پڑھائی نہ کرنے کی اہم وجہ یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر مکمل صحت مند نہیں ہوتی۔ مگر ٹینشن تب ہوتی ہے جب ذہن میں خدشہ آتا ہے کہ ابو مجھے یونیورسٹی داخل نہیں کروائیں گے اور یونیورسٹی والے مجھے اوور ایج کہہ کر ایڈمیشن دینے سے انکار نہ کر دیں۔ ایک اور بات آپ سے پوچھنی تھی کہ اوپن یونیورسٹی سے پرائیویٹ بی اے کر کے کیا ریگولر کسی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا جا سکتا ہے۔

اچھی بہن! جس بات کو سوچ سوچ کر آپ پریشان ہیں وہ اتنی پریشان کن نہیں جتنا آپ سمجھتی ہیں۔ آپ جاب کر رہی ہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ اس سے آپ کی ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں اور مصروف رہنے کی وجہ سے آپ کو ڈپریشن بھی نہیں ہوتا۔

اب آپ کو یہ فکر ہے کہ جب آپ کے والد گاؤں شفٹ ہو جائیں گے تو آپ جو آگے تعلیم شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں وہ خواب کیسے پورا ہو گا۔

پہلی بات تو یہ کہ ابھی گاؤں جانے میں دو سال ہیں۔ اس وقت اس بارے میں ہرگز نہ سوچیں۔ حالات کا کسی کو پتا نہیں پل میں کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں انسان کے ارادے اور خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے والد کا ارادہ بدل جائے یا ان کے خیالات تبدیل ہو جائیں۔ یوں بھی ایسی کیفیت میں آپ کے لیے پریشان کن سوچوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت اچھی امید رکھیں۔ وہ آپ کے لیے اچھا ہی کرے گا ان شاء اللہ۔

دوسری بات جو آپ کو پریشان کر رہی ہے وہ آپ کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ آپ پرائیویٹ بی اے اور ایم اے کر سکتی ہیں۔ پرائیویٹ بی اے کر کے یونیورسٹی میں ریگولر ایڈمیشن بھی مل سکتا ہے اوپن یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے والوں کو بھی ریگولر یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل سکتا ہے۔ اگر والد صاحب گاؤں شفٹ ہو جاتے ہیں تب بھی آپ بی اے ایم اے کر سکتی ہیں۔

اچھی بہن! آنے والے معاملات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہونا دانش مندی نہیں ہے۔ فی الحال آپ اپنی صحت پر توجہ دیں اور اپنے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کریں۔

شائستہ

میری شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا ہے۔ ہماری شادی محبت کا نتیجہ تھی۔ میرے والدین راضی تھے لیکن میرے شوہر نے یہ شادی اپنے والدین کی اجازت کے بغیر خفیہ طور پر کی کیونکہ وہ رضامند نہ تھے۔ اس کی وجہ میرے شوہر نے مجھے یہ بتائی کہ چونکہ میری منگنی میرے بہنوئی کی بھانجی سے ہو چکی ہے اس لیے میرے والدین رضامند نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر انہوں نے اس لڑکی سے شادی نہ کی تو ان کی بہن کو طلاق ہو جائے گی اور وہ لڑکی جس سے ان کی منگنی ہوئی ہے وہ کہتی ہے کہ اگر شادی نہ ہوئی تو وہ بھی زہر کھا لے گی۔ انہوں نے کہا تھا وہ اس لڑکی سے شادی دو تین سال بعد کریں گے لیکن انہوں نے ڈیڑھ ماہ بعد ہی شادی کر لی۔ لیکن یہ بات مجھ سے پوشیدہ رکھی۔ لیکن ان کے ایک دوست کی بیوی نے مجھے یہ بات بتا دی میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا وہ مجبور ہو گئے تھے۔

اب میں ماں بننے والی ہوں۔ میری شوہر کی بہن اور ماں کو بھی اس شادی کے بارے میں علم ہو گیا ہے۔ ان کی بہن کہتی ہے کہ اگر پہلے پتا چل جاتا تو وہ خاندان میں شادی نہ کرتے لیکن اب مجبوری ہے اس کی سسرال والوں کو شادی کا پتا چل گیا تو اس کا گھر تباہ ہو جائے گا۔

میرے شوہر اپنا زیادہ وقت بیوی کے ساتھ گزارتے ہیں۔ میرے پاس بہت کم رہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر میں اس کے ساتھ نہیں رہوں گا تو اس کے گھر والوں کو میری شادی کی خبر ہو جائے گی ساتھ ہی وہ کوشش کر رہے ہیں کہ میں ڈلیوری کے بعد کہیں سروس کر لوں۔

میں نے انہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے لیکن اب ان کے پے در پے جھوٹ سے مجھے ان سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں۔

اچھی بہن! آپ نے جو کچھ بھی کیا سب جانتے بوجھتے کیا۔ شادی سے پہلے وہ آپ کو بتا چکا تھا کہ وہ دوسری شادی کرے گا۔ پھر بھی آپ نے اس سے شادی کی۔ اس کے گھر والے شریک نہ ہوئے آپ نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے دو تین سال بعد شادی کرنے کا کہا تھا لیکن شادی اس نے ڈیڑھ ماہ بعد ہی کر لی۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں تھی کہ اس کی منگنی اس کے بہنوئی کی بھانجی سے ہوئی ہے۔ خاندان میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اسی لیے وہ اپنی خاندانی بیوی کے پاس رہتا ہے اور آپ پہ توجہ نہیں دیتا۔

بہتر یہی ہے کہ اب آپ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچیں اور شکر کریں کہ اس نے جاب کی اجازت دے دی ہے۔ بصورت دیگر آپ اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہیں لیکن اس صورت میں ہو سکتا ہے وہ آسانی سے رضامند نہ ہو اور آپ کو قانونی جنگ لڑنا پڑے جو بہرحال آسان نہیں ہے۔

آپ کوشش کریں کہ اس کو آپ کے حقوق کا احساس ہو اور وہ آپ کی طرف توجہ دے۔ اسے احساس دلائیں کہ ایسی حالت میں جبکہ آپ ماں بننے والی ہیں آپ کو اس کی توجہ کی ضرورت ہے۔





زمت الصبور

بیوٹی بکس

نگہت علی..... حیدر آباد

س : میرے بال خشک ہیں۔ اگر میں روزانہ شیمپو نہ کروں تو یہ اور بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ حال ہی میں کچھ بال سفید ہو گئے ہیں۔ کیا ایسا شیمپو کی زیادتی کی وجہ سے ہے؟ سفید بالوں پر میں نے ڈائی کیا تھا' اس کی وجہ سے بال سخت اور کمزور ہو گئے ہیں۔ میں ہفتے میں ایک بار بالوں میں ناریل کا تیل لگاتی ہوں۔

ج : بالوں کی رنگت میں تبدیلی غذائیت کی کمی کی وجہ سے آتی ہے۔ سب سے پہلے آپ بالوں کی صحت پر توجہ دیں۔ بے بی شیمپو کریں۔ شیمپو سے بال دھونے سے آدھا گھنٹہ قبل زیتون کا تیل بالوں میں لگائیں اور زیادہ توجہ بالوں کی جڑوں پر دیں۔ تولیے کو گرم پانی میں ڈبو کر نچوڑ لیں' پھر اسے گیلی حالت میں تیل لگے بالوں پر لپیٹ لیں (پگڑی کی طرح)۔ بیس منٹ تک اسی حالت میں رہیں۔ اس عمل سے بالوں میں تیل جذب ہو گا۔ جب تک آپ کے بالوں کی صحت اچھی نہیں ہو جاتی' تب تک بالوں کو رنگنے سے گریز کریں۔

صائمہ خان..... کراچی

س : میرا وزن بڑھ گیا ہے' خاص طور پر میرے کولہے اور رانیں خاصی موٹی ہو گئی ہیں۔ میں نے ڈائٹنگ اور ایکسرسائز پر بھی توجہ دی' مگر اس سے فائدہ نہیں ہوا۔

ج : اپنے دن کا آغاز ورزش سے کریں۔ سب سے اچھی ورزش پیدل چلنا ہے۔ کم از کم آدھا گھنٹہ واک کریں۔ آپ کے لیے یہ ممکن نہ ہو تو آپ گھر پر درج ذیل ورزش کر لیا کریں۔

1 - فرش کی طرف چہرہ کر کے لیٹ جائیں۔ دونوں ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیں۔ اب بایاں پاؤں اوپر اٹھائیں۔ اس دوران پیٹ اور جسم فرش سے لگے رہیں۔ دس سیکنڈ اسی پوزیشن میں رہیں۔ اس کے بعد اصل حالت میں آجائیں۔ یہی عمل دائیں پاؤں کے ساتھ کریں۔ یہ ورزش دس بار کریں۔

2 - فرش کی طرف پشت کے بل لیٹ جائیں اور دونوں پاؤں کو اس طرح حرکت دیں' جیسے آپ سائیکل چلا رہی ہوں۔ یہ ورزش کم از کم بیس سے تیس بار کریں۔

سدرہ خان..... پشاور

س : میرے چہرے پر داغ دھبے ہیں' جس کی وجہ سے میرا چہرہ بہت بدنما لگتا ہے۔ پلیز! کوئی ایسا نسخہ بتائیے' جو میں آسانی سے کر سکوں؟

ج : سب سے پہلی بات جو بہت ضروری ہے' وہ یہ کہ آپ دن بھر میں گیارہ گلاس پانی پئیں۔ پانی کی کمی سے جلد پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس سے جلد کے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

مرغی کے انڈے کا چھلکا اتار کر اسے خوب باریک پیس لیں' پھر دو تولہ انگور کا سرکہ لے کر سفوف اتنی مقدار میں ملائیں کہ یہ ایک گاڑھا پیسٹ بن جائے۔ رات سونے سے پہلے چہرے پر مل لیں اور صبح اٹھ کر کسی اچھے صابن سے دھو لیں۔ یہ عمل ایک ہی بار کرنے سے آپ نمایاں فرق محسوس کریں گی۔